



کم سے کم 300 کلومیٹر
فی گھنٹہ کی رفتار



شیخ مجیب الرحمن
کاتاریخی انٹرویو

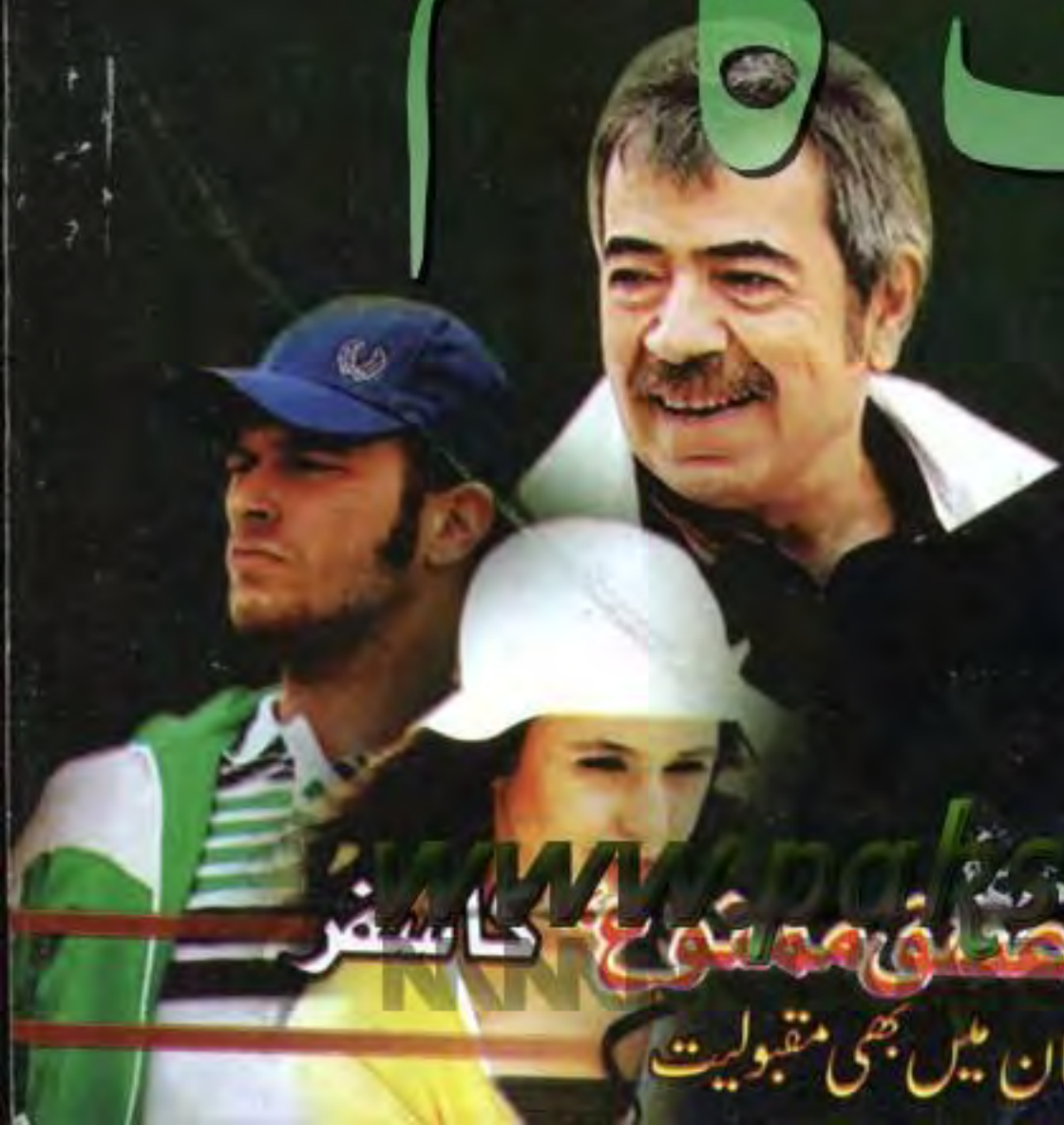
اردو دا جہت

جنوری ۲۰۱۳ء

2013

ترکی دسویں بڑی
طاقت بن کر رہے !

ڈاکٹر



www.paksociety.com

اناطولین ٹائیگر سے
ترقی یافتہ ممالک کا سفر

ترک سیکولر ڈرامہ کی پاکستان میں بھی مقبولیت

اللہ کا قرآن

وہی سیدھے راستے پر ہیں

اور ہم تمہیں آزمائیں گے کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور مال اور جانوں اور میوؤں کے نقصان سے اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دو O ان لوگوں کو جب کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں O ایسے ہی لوگوں پر پروردگار کی عنایتیں ہیں اور رحمت اور وہی سیدھے راستے پر ہیں O

کتنے منہ اس دن روشن ہوں گے O ہنستے خوشیاں مناتے O اور کتنے منہ اس دن گرد آلود ہوں گے O ان پر سیاہی چڑھ رہی ہوگی O یہ وہی لوگ ہیں جو منکر اور ڈھیٹ ہیں O

رسول کا فرمان

علماء کی جگہ جاہل فتوے دیں گے

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائے گا کہ اسے لوگوں کے دلوں سے محو کر دے گا بلکہ علم اس طرح ختم ہوگا کہ علماء ختم ہو جائیں گے حتیٰ کہ جب ایک بھی عالم باقی نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو سردار بنالیں گے اور ان سے مسائل کے بارے میں پوچھا جائے گا اور وہ علم کے بغیر فتوے دیں گے جو خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔“

(صحیح بخاری کتاب ۳ - باب ۳۳: مسلم کتاب العلم - باب ۵)

بخل، لالچ، فتنہ، فساد، قتل

رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”جب زمانہ قیامت سے قریب ہو جائے گا تو (نیک) عمل گھٹ جائیں گے، لوگوں کے دلوں میں بخل اور لالچ ڈال دیا جائے گا۔ ہر طرف فتنہ و فساد عام ہو جائے گا اور قتل کی کثرت ہوگی۔“

(بخاری کتاب ۹۲ - باب ۵: مسلم کتاب العلم - باب ۵)

فہرست

ترک شائقین! کیا رنگ لائے گی؟
”عشق ممنوع“

ترک گیارہویں صدی کی مقبولیت پر مبنی نئے اہم سوال



2013

ترکی دسویں بڑی
طاقت بننے کو ہے!

اختر عباس



49

تائیل: اصف ملک، محمد شہیر

ان کارخانوں میں سرمایہ کاری کی۔ شروع میں انہیں نقصان بھی اٹھانا پڑا لیکن بعد میں عمدہ کوالٹی اور مناسب قیمت کی وجہ سے ان کی مصنوعات یورپ اور امریکہ میں مقبول ہونا شروع ہو گئیں۔ نتیجتاً 2011ء میں ترکی کی برآمدات بڑھ کر 135 ارب ڈالر ہو گئیں۔ آج ترکی کے مین سے زیادہ شہر ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک سالانہ ایک ارب ڈالر سے زیادہ کی برآمدات کرتا ہے۔ اس معاشی ترقی میں ایسی تنظیموں کا کردار بھی بہت اہم ہے جنہوں نے ترک مصنوعات کے اندرون اور بیرون ملک تجارتی میلے منعقد کروائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ان مصنوعات اور تاجروں سے متعارف کروایا۔

ترکی کو دنیا کی 15 ویں بڑی معاشی طاقت بنانے میں اہم کردار ادا کرنے والے اناطولیئن ٹائیگرز کے فکری رہنما، ترکی کے مشہور مفکر فتح اللہ گولن ہیں۔ جن کے رفاجی اور تعلیمی اداروں کا جال پوری دنیا میں پھیل چکا ہے۔ ان کی تعلیمات میں مذہبی اقدار کو ہر قیمت پر مقدم رکھنے کی تلقین کے ساتھ مختلف عقیدوں اور تہذیبوں کے لوگوں کے درمیان مکالمے کو بہت اہمیت حاصل ہے تاکہ برداشت اور رواداری کو فروغ مل سکے۔ اناطولیئن ٹائیگرز کی شکل میں آج ترکی کے پاس ایک ایسی بزنس کلاس ہے جس کے پاس معاش کا ہنر، اثر و رسوخ، پیسہ میڈیا کی طاقت اور سیاسی قوت ہے۔

میں اناطولیئن ٹائیگرز کی کہانی جان کر حیران تھا ہی کہ کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں آل ورلڈ نیٹ ورک کی بانی عینی جیبی جو ہاروڈ سے فارغ التحصیل اور ہاروڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مائیکل پورٹر کی ساتھی ہیں، کی تقریر نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ آنے والے کچھ سالوں میں پاکستان دوسرا ترکی ثابت ہوگا اور وہ یہ دعویٰ پاکستان کے کئی دوروں اور وہاں پر پاکستانی انٹرپرائیوز (entrepreneurs) سے ملنے کے بعد کر رہی تھیں۔

مجھے بھی یہ یقین ہے کہ انتہائی نامساعد حالات کے باوجود جن میں سرفہرست ملک میں صنعتوں کو بجلی اور گیس کی عدم دستیابی اور امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال ہے، پاکستان خصوصاً پنجاب کے باہمت شیر (انٹرپرائیوز)، نوجوانوں اور خواتین کے ساتھ مل کر اناطولیئن ٹائیگرز کی طرح منظم ہوں گے، کسانوں کی کوآپریٹو بنائیں گے اور چھوٹے اور درمیانے درجوں کی صنعتوں پر مشتمل ایسے نئے اقتصادی شہر بسائیں گے جن میں بیرون ملک پاکستانی بھی سرمایہ کاری کر کے ملک کو ترکی کی مانند ترقی یافتہ بنائیں۔ یہ بات بڑی اہم ہے کہ پاکستان میں تیزی سے ترقی کرنے والی کمپنیوں کی ایک بڑی تعداد پنجاب سے تعلق رکھتی اور نوجوان انٹرپرائیوز پر مشتمل ہے۔



طیب اعجاز قریشی

پڑھے، پڑھائیے، لکھیے اور لکھائیے
tayyab.aljaz@urdu-digest.com

منیجنگ ایڈیٹر نوٹ

اناطولیئن ٹائیگرز

امریکی صدر اباہ کی قائم کردہ Global Entrepreneurship Summit اور عربیہ 500 کے زیر اہتمام استنبول میں تین دن کی کانفرنس میں شرکت ترکی سے میرا پہلا تعارف تھا۔ اس تقریب کے میزبان ترکی کے وزیراعظم طیب اردگان تھے جو اپنی علالت اور آپریشن کی وجہ سے اس میں شرکت نہ کر سکے اور ان کی نمائندگی نائب وزیراعظم علی باباجان نے کی۔ امریکی نائب صدر جو بائیڈن کانفرنس میں شرکت کے لیے خصوصی طور پر تشریف لائے جس میں انہوں نے مشرق وسطیٰ ترکی، افریقہ اور پاکستان میں تیزی سے ترقی کرنے والی کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹوز سے خطاب کیا۔ انہوں نے امریکا اور یورپ سمیت پوری دنیا کو درپیش عظیم معاشی بحران کا واحد حل SME یعنی چھوٹے اور درمیانے درجے کے کاروبار پر توجہ اس میں سرمایہ کاری اور فروغ کو قرار دیا۔

اس کانفرنس میں ترکی میں تیزی سے ترقی کرنے والی 25 کمپنیوں کے چیف ایگزیکٹوز بھی شریک تھے اور ان میں اکثریت کی عمریں 35 سے 45 سال کے درمیان تھیں۔ ان سے بات چیت کرنے کے دوران مجھ پر یہ حیران کن انکشاف ہوا کہ ان کا تعلق تاریخی شہر استنبول، دار الحکومت انقرہ یا صنعتی شہر ازمر سے نہ تھا حالانکہ یہ شہر صنعتی اور معاشی طاقت کے ستون سمجھے جاتے ہیں۔ میرے ترک دوستوں نے بتایا کہ انہیں اناطولیئن ٹائیگرز کہا جاتا ہے۔

جمہوریہ بننے کے بعد 60 سال تک ترکی کے حالات ایکسپورٹ یا ملک میں سرمایہ کاری کے لیے ناسازگار تھے۔ 1980ء میں اس وقت کے انڈر سیکری برائے پلاننگ، ترگت اوزال کی ایکسپورٹ پالیسی اور یورپی ممالک سے کسٹم ڈیوٹی کے معاہدے کا اناطولیئن ریجن کے شہروں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہاں کے شہریوں کی اکثریت کا تعلق کھیتی باڑی اور فوج سے تھا۔ 1980ء میں ترکی کی کل برآمدات صرف 2.9 ارب ڈالر تھیں۔ تاجر حکومت پر اعتماد کرتے تھے نہ حکومت تاجروں پر۔ اس صورتحال میں چھوٹے تاجروں نے اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کیا تاکہ حکومت سے اپنے مطالبات منوائے جاسکیں جن میں نجکاری اور افراط زر پر کنٹرول وغیرہ نمایاں تھے۔

موجودہ حکومتی پارٹی نے برسر اقتدار آنے کے بعد اناطولیئن شہروں کو تیز ترین ریل اور سڑکوں کے مربوط نظام کے ذریعے بندرگاہوں اور بڑے شہروں سے جوڑ دیا۔ کپاس کے کسانوں نے اپنی کوآپریٹو بنائیں اور لوگوں نے منظم ہو کر ہوم ٹیکسٹائل (بیڈ شیٹ، تولیہ، صوفہ کتاھ وغیرہ) بنانے کی چھوٹی صنعتیں لگانی شروع کیں۔ مزید برآں گھروں میں ٹیلی فون فارغ خواتین کو کارخانوں میں کام کرنے پر راضی کیا۔ یوں معیاری کپاس کے ساتھ ساتھ سستی لیبر بھی میسر آ گئی۔ بیرون ملک خصوصاً جرمنی میں مقیم تارکین وطن نے

اردو ڈائجسٹ
www.urdu-digest.pk
جلد نمبر 53 شماره 1
جنوری 2013ء صفر المظفر 1434ھ

صدر مجلس
مدیر اعلیٰ
منیجنگ ایڈیٹر
ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
طاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر
مجلس تحریر
مبتعم طباعت
ڈیزائنر محمد شہیر
اختر عباس
حافظ افروز حسن، سید عام محمود، صفیرہ بانو شیریں
نوید اسلام صدیقی، سلیٰ اعوان، انظہار بن مظہر
فاروق اعجاز قریشی، انوار گلہ پور، افغان کامران قریشی
معاون ڈیزائنر عمران رشید، کمپوزر اشرف سکندر

مارکیٹنگ/اشتہارات
advertising@urdu-digest.com
قادر کنٹر مارکیٹنگ
مینجیر ایڈورٹائزمنٹ
لاہور
گجرات/گوجرانوالہ
ذکی اعجاز قریشی
احمد فیاض
ندیم حامد
احسان اللہ بٹ
0300-8460093
0322-7474010
0300-4242620
0300-9620294

سالانہ خریداری
خریداری نمبر ضرور تحریر کیجیے
subscription@urdu-digest.com
فون: +92-42-37589957

اردو ڈائجسٹ گھر بیٹے حاصل کیجیے
پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں
بیرون ملک 50 امریکی ڈالر
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں
URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

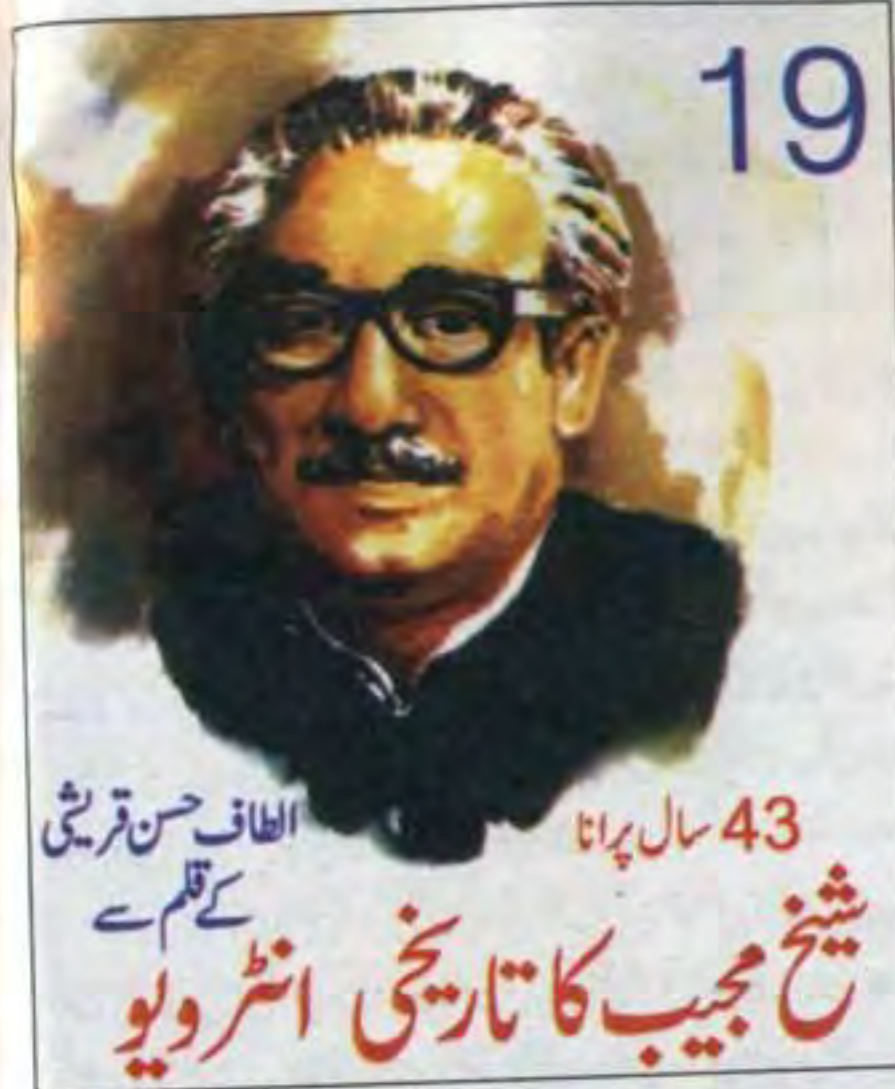
ادارتی آفس
اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 فیکس: +92-42-35290731
editor@urdu-digest.com

قیمت 90 روپے
طاف دانش الطاف حسن قریشی نے جسارت بہ نثر 24 سرفکر روڈ
سے چھپوا کر سن آباد لاہور سے شائع کیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

فہرست

سِر ورق پر



43 سال پرانا
شیخ مجیب کا تاریخی انٹرویو

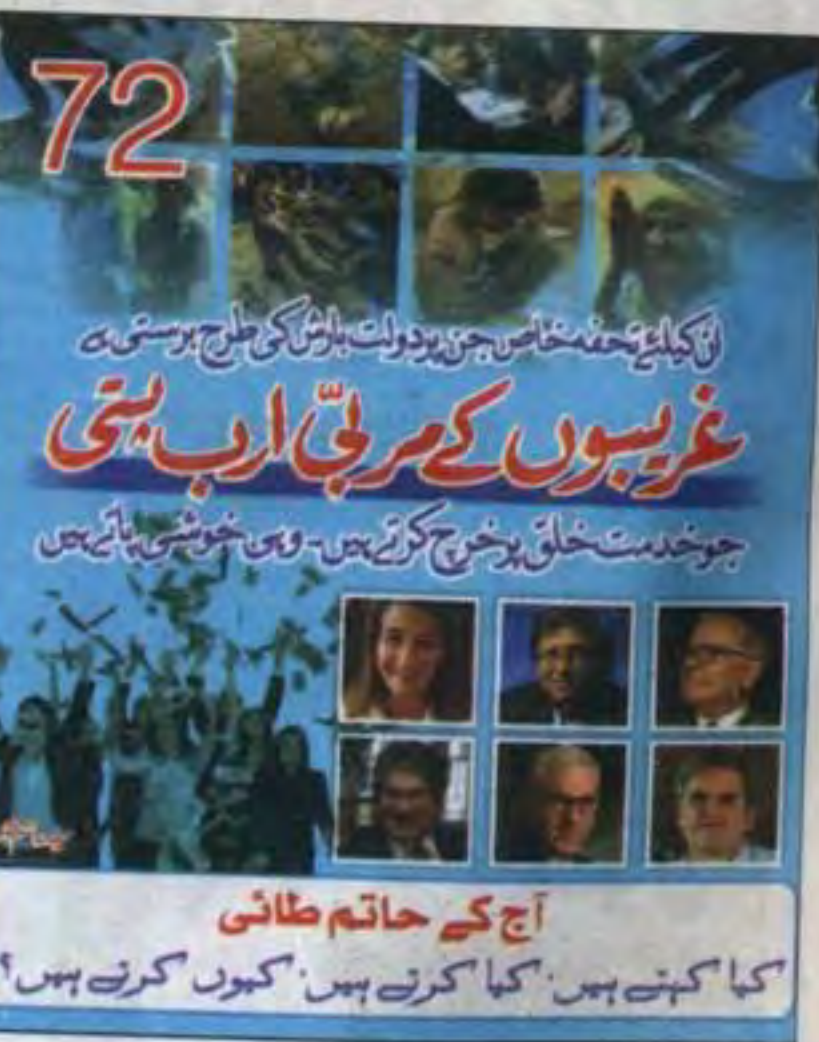


کم سے کم 300 کلومیٹر
فی گھنٹہ کی رفتار

تحقیق و جتنو: سید یوسف علی

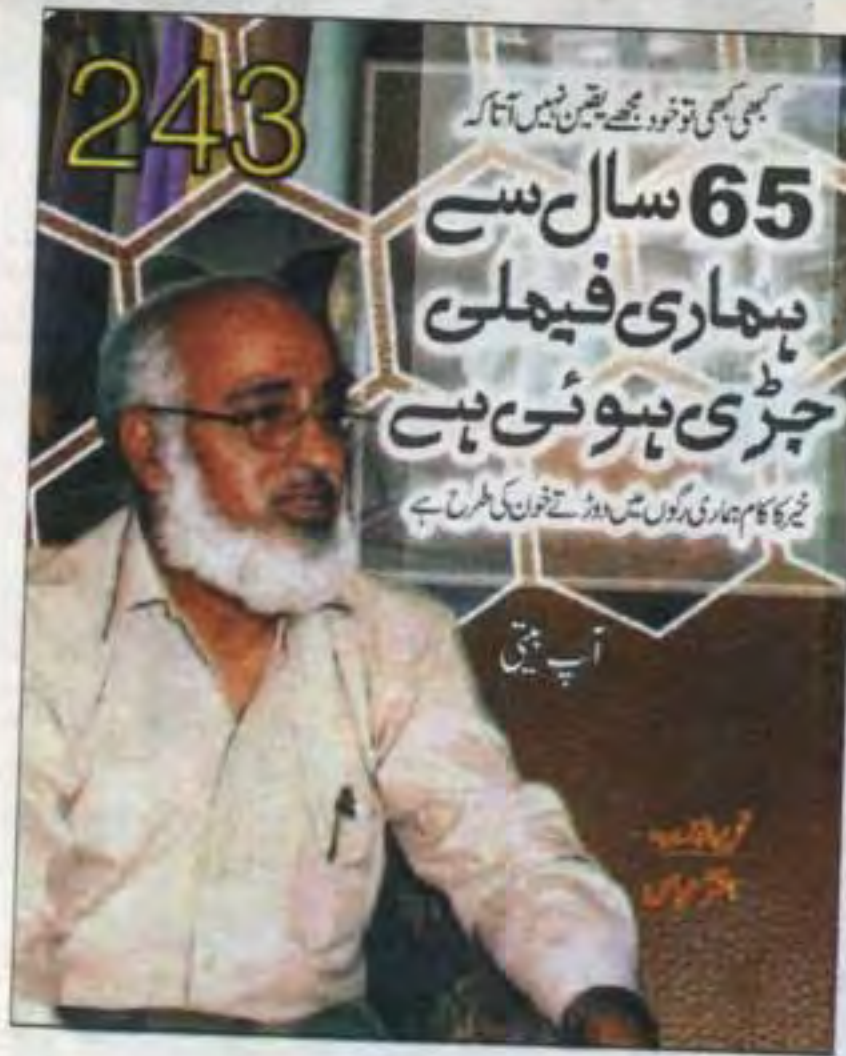


39 مجالس نبوی
43 آنحضور کے پہلے میزبان
(ابو ایوب انصاری)
153



آج کے حاتم طائی
کہا کہتے ہیں: کہا کرتے ہیں: کہیں کرتے ہیں؟

15	پچھاپنی زبان میں
17	ہم کہاں کھڑے ہیں
87	میں قتل کرنا چاہتا ہوں
97	سرخ فیتے کے کرشمے
102	ہیون وائٹ کا انوکھا لاڈلا
107	برے واقعات ضرور پیش آتے ہیں
119	دماغ کے ارراز
123	انسانی جسم سے نکلی
129	کوزے میں دریا
136	شہروں کے نام کیسے پڑے
142	ہم سب
145	مثالی تعلقات کے 5 طریقے
153	ندی کے دوسرے کنارے کی گھاس
156	میرا کیا قصور
158	میری حیرت نہیں جاتی
241	قصہ کوثر
255	بوجھیں تو جانیں
257	یاران وطن دیار غیر میں
263	مشورہ حاضر ہے
267	کتابوں کی کہکشاں
271	باتیں دانش کی
273	وزن کم کریں صحت نہیں (مقبول کالم)
277	ماہرواں کی شخصیات
280	جہنم خیال
285	دردِ دل پہ دستک (مستقل کالم)



243
65 سال سے
ہماری فیملی
جڑی ہوئی ہے

کبھی کبھی تو خود مجھے یقین نہیں آتا کہ
نئے کام ہماری روں میں دڑتے توں کی طرح ہے
آپ بیتی

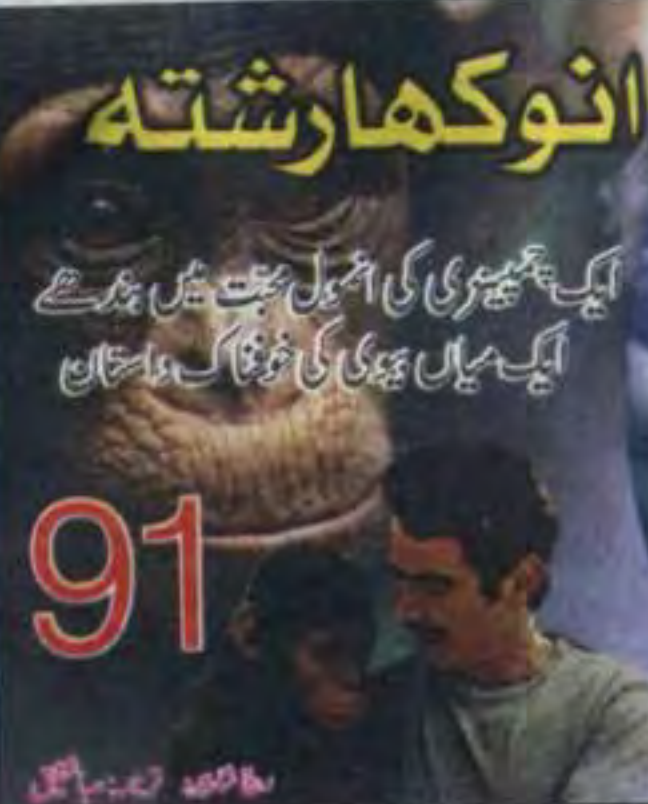
فہرست

81 موت کا سفر



اسکو سے دور رہنے والے ایک میاں بھائی کی چچی پاکستان
میاں کو بھوکاں رہا تھا کہ ب کی بار بار ضرور کر پڑے گا

انوکھا رشتہ



ایک عجیب سیڑی کی انجیل بخت میں پڑے
ایک میاں بھائی کی غوغا کا داستان

91

معاذ اللہ رحمہ اللہ

اردو خیوز روم

امریکا اور پاکستان میں میڈیا کے

225 ذمہ داریاں ایک سی مگر سہولتیں جدا جدا

مدیر انور ذوالفقار

217

یورپ کے صدر و مملکت کو بہ موخیا کا کام آجرا
وہ اپنا آمدنی کا 10% کو عوام پر کیوں خرچ کرتا ہے

ایک صدر ایسا جو خود بھی غریب ہے

174

محلول

بشری رومن

کہانیاں

ڈاکٹر شیر شاہ سید	شرط محبت	161
مظہر سلیم مجوکہ	وہ دس روپے	171
جان ایل بیوارڈ / نعیم خان زادہ	جائے واردات	180
اشفاق احمد	محسن محلہ	183
شیکھر جوشی / احمد صغیر صدیقی	دجیو	186
شیخ ایاز / ستار	ہنس مکھ	189
ڈینیل ہلیدی / سلیم انور	سکے	193
میخائیل سینڈو ویناؤ / صہیل علی	قدر گوہر	201
صبا عاطف	مسکراتی آنکھوں میں چھپے آنسو	206
اظہر بن مظہر	بوجھ	212

نئے سال میں ایک پختہ عہد کیجیے

گزشتہ

سال ہمارے لیے سخت آزمائشوں، دہشت گردی اور کرپشن کی ہولناکیوں اور مملکت کے اہم اداروں کے درمیان محاذ آرائی کا سال ثابت ہوا۔ بلوچستان، کراچی، فاٹا اور گلگت بلتستان کے مختلف حصوں میں بد امنی، حکومت میں اعلیٰ ترین سطح پر ہر نوع کی بد عنوانی، بد انتظامی اور قانون شکنی اور قومی دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے عام شہری کی زندگی اجیرن بنی رہی اور اپنے مستقبل پر سے نوجوانوں کا اعتبار اٹھنے لگا۔ ان خرابیوں کے پہلو بہ پہلو یہ حوصلہ افزا مظاہر بھی سامنے آئے کہ آئین میں ترامیم کے ذریعے صوبوں کو اپنے وسائل پر وسیع مالکانہ اور خود مختاری کے اختیارات دیے گئے، الیکشن کمیشن حقیقی معنوں میں ایک آزاد اور خود مختار ادارے کی حیثیت اختیار کر گیا اور شفاف انتخابات کے لیے اپوزیشن کے ساتھ مشاورت سے نگران حکومتوں کا ایک قابل اعتماد نظام وجود میں آچکا ہے۔ وہ مثبت قوتیں جو ووٹ کے ذریعے بوسیدہ نظام کی جگہ انصاف پر مبنی اور نئے تقاضوں کے مطابق ایک جہان تازہ آباد کرنا چاہتی ہیں، ان کے لیے اپنی منزل کی طرف سفر پہلے کے مقابلے میں قدرے آسان ہو گیا ہے۔

نیا سال شفاف اور بروقت انتخابات کے مژدہ جانفرا کے ساتھ طلوع ہو رہا ہے۔ اب وہ لمحہ بہت قریب آن پہنچا ہے جس میں ہم اپنی صورت کو خوب تر بنا سکتے یا مزید بگاڑ بھی سکتے ہیں۔ اس کا دار و مدار اس بات پر ہوگا کہ ہم کس عزم راسخ سے نئے سال کا خیر مقدم کرتے اور اپنی قومی ذمہ داری نبھانے کے لیے کس قدر شعور، جذبے اور ایثار سے کام لیتے ہیں۔ آپ کو اپنی آرام اور آسائشیں بچ کر سیاسی جماعتوں کو اس امر کا پابند بنانا ہوگا کہ وہ عام انتخابات میں صرف متوسط اور محنت کش طبقے کے اہل، دیانت دار اور سادہ زندگی کے خوگر افراد کو ٹکٹ دیں گی اور اپنے منشور میں یہ اعلان کریں گی کہ ایک سال کے اندر اندرونی آئی پی کلچر ختم کر دیا جائے گا، پاکستان کے تمام بچے پولیو کے خطرے سے محفوظ ہوں، قانون کی حکمرانی قدم قدم پر نظر آئے گی، قومی وسائل کی منصفانہ تقسیم کا نظام قائم ہو جائے گا اور حکمران اپنے آپ کو آقا سمجھنے کے بجائے اپنے ہم وطنوں کے حقیقی خیر خواہ ثابت ہوں گے۔ اسی کا نام عظیم تبدیلی ہوگا اور جو بھی سیاسی قیادتیں یہ معرکہ سر کر لیں گی، وہ تاریخ کے صفحات پر اپنی عظمت کا دائمی نقش ثبت کر دیں گی اور یوں ریاست کو سیاست سے علیحدہ کر دینے کا نعرہ آخر کار بے اثر ہو جائے گا۔

الطاف حسن قسہ پسی



محبت کا زمزم بہہ رہا ہے

ایک تاریخی تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

اس

عنوان سے میں نے اگست تا دسمبر ۱۹۶۶ء اردو ڈائجسٹ میں ایک سلسلہ مضمون لکھا تھا جو آج بھی بعض حلقوں میں موضوع گفتگو بنا رہتا ہے۔ کچھ ناقدین کہتے ہیں کہ صاحب مضمون مشرقی پاکستان کے حوالے سے قوم کو خوش فہمیوں کے جام پلاتے رہے جبکہ وہاں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ مجھے گمان گزرتا ہے کہ بیشتر حضرات پورا سلسلہ مضامین پڑھے بغیر صرف عنوان پر طبع آزمائی فرماتے اور ناحق مجھ پر حقائق چھپانے کا الزام لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی آگاہی کے لیے ”محبت کا زمزم بہہ رہا ہے“ کے سلسلہ مضامین کے تاریخی پس منظر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مشرقی پاکستان کے اندر عدم تحفظ کا شدید احساس ۱۹۶۵ء کی ۷ اسی روزہ جنگ میں پیدا ہوا جب اُسے چین کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ جنگ بندی پر وہاں کے عوام نے سکھ کا سانس لیا جبکہ مغربی پاکستان میں تمام اپوزیشن جماعتیں اعلانِ تاشقند کے خلاف تھیں اور انہوں نے ایک مشترکہ لائحہ عمل وضع کرنے کے لیے سابق وزیراعظم چودھری محمد علی کی وسیع و عریض کوشش میں ۱۰ فروری ۱۹۶۶ء کو قومی کانفرنس منعقد کی۔ اس میں مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمن آئے اور انہوں نے اعلانِ تاشقند کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کے بجائے ۶ نکات پیش کر دیے۔ نوابزادہ نصر اللہ خاں جو عوامی لیگ کے صدر تھے انہوں نے پوچھا کہ عوامی لیگ سے باقاعدہ منظوری لیے بغیر آپ نے یہ ۶ نکات کیسے پیش کر دیے اور ان کی سیاسی حیثیت کیا ہے؟ تو جواب ملا کہ یہ مشرقی پاکستان کے عوام کی حقیقی آواز ہیں۔ لاہور کی قومی کانفرنس میں پیش کیے جانے والے ۶ نکات کو مشرقی پاکستان کے اخبارات میں خاطر خواہ کوریج ملی، تاہم ان کے خلاف تنقیدی مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ میں نے زمینی حقائق معلوم کرنے کے لیے جون کے اوائل میں مشرقی پاکستان کا تفصیلی دورہ کیا اور کچھ دوستوں کے ہمراہ چٹاگانگ، کومیلہ، راجشاہی، دیناج پور، کھلنا اور جیسور میں وکلاء، طلبہ اور سیاسی کارکنوں سے ۶ نکات پر تبادلہ خیال کیا۔ بیشتر سنجیدہ حلقے ایک ہی بات کہتے کہ مشرقی پاکستان کو منصفانہ سیاسی اور معاشی حقوق دیے جائیں اور صوبائی خود مختاری اور پارلیمانی نظام کا اہتمام کیا جائے، تو عوام شیخ صاحب کی جذباتی تقریروں کے جھانسنے میں نہیں آئیں گے اور پاکستان کے ساتھ مضبوطی سے جڑے رہیں گے۔

شیخ صاحب کے ایک ہم جماعت نے ان کے بارے میں ایک عجیب و غریب واقعہ سنایا جس کی بعد میں اور لوگوں نے بھی تصدیق کی۔ یہ ۱۹۳۸ء کے اوائل کا واقعہ تھا کہ شیخ صاحب کے آبائی شہر ضلع فرید پور میں مسلم لیگ دودھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اتفاق سے دونوں دھڑوں نے بیک وقت الگ الگ جلسہ عام کے انتظامات کیے۔ ایک جلسے کی صدارت مولوی تمیز الدین خاں اور دوسرے کی جناب حسین شہید سہروردی کر رہے تھے۔ مولوی تمیز الدین خاں کے جلسے میں بہت لوگ آئے۔ اتنے میں ایک لمبا ترنگا نوجوان کندھے پر لٹھ رکھے جلسہ گاہ میں داخل ہوا اور اُس نے مجمع پر بڑی بے دردی سے لٹھ برسانا شروع کر دی۔ لوگ جان بچانے کے لیے دوسری جلسہ گاہ کی طرف دوڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے سہروردی صاحب کا جلسہ بارونق ہو گیا۔



انٹرویو شیخ مجیب الرحمن

الطاف حسن قریشی

۴۳ سال پہلے کی

ایک تاریخی ملاقات کا احوال

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا سانحہ ایک حقیقت ہے، تلخ حقیقت، تلخیوں کو بھلانا آسان نہیں ہوتا مگر ہم نے اس کا بھی حل ڈھونڈ نکالا۔ ان حالات کا تذکرہ کرنا ہی بند کر دیا۔ افسوس یہ کہ نئی نسل ان پورے واقعات اور شخصیات سے بھی واقف نہیں جنہوں نے ہمیں اس صورت حال سے دوچار کیا۔ آج کے تہرہ نگاروں کو سب سے آسان کام یہ لگتا ہے کہ تبصرے کرو، تمسخر اڑاؤ اور بات کو بھول جاؤ مگر تاریخ سے یہ سلوک نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ڈائجسٹ کا یہ اعجاز رہا ہے کہ بروقت، بر موقع تجزیوں اور اہم ترین شخصیات سے ملاقاتوں کے بعد اس عہد کی تاریخ کو مجسم کر کے رکھ دیا۔ ۴۳ سال قبل جناب الطاف حسن قریشی نے اپنے منفرد اسلوب میں ایک تاریخی انٹرویو کی روداد لکھی تھی۔ قند مکرر کے طور پر وہ انٹرویو پیش خدمت ہے۔ ذرا دیکھیے ان کے قلم کا باکپن، حالات پر بصیرت افروز نگاہ اور شخصیت کے آر پار دیکھ لینے کی خداداد صلاحیت۔ یہ انٹرویو آج کے تجزیہ نگاروں کے بہت سے سوالوں کا مسکت جواب ہے۔ (ایڈیٹر)

اسٹیج پر بیٹھے سہروردی صاحب یہ پورا منظر دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اشارے سے شیخ صاحب کو اپنے پاس بلایا، نام پوچھا، شاباش دی اور کلکتہ آنے کے لیے کہا۔ یہی ملاقات آگے چل کر ایک مضبوط سیاسی رشتے میں ڈھل گئی اور جناب سہروردی کا ایک چیلڈا فسطائی رجحانات کے ساتھ ایک ”سیاسی قائد“ بنتا چلا گیا۔ لاہور سے واپس جاتے ہی شیخ صاحب نے عوامی لیگ کی جنرل کونسل کا اجلاس بلایا جس میں صرف دس پندرہ مقررین مدعو کیے گئے اور نوابزادہ نصر اللہ خاں کو اس اجلاس کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ پارٹی کے قواعد و ضوابط پامال کرتے ہوئے جنرل کونسل نے شیخ مجیب الرحمن کو اپنا صدر منتخب کر لیا۔ اس طرح عوامی لیگ قومی جماعت کے دائرے سے نکل کر ایک علاقائی جماعت بن کر رہ گئی جس نے بنگلہ قومیت کو اپنی سیاست کا محور بنا لیا۔ نتیجے میں دونوں بازوؤں کے درمیان سیاسی فاصلے بڑھتے گئے مگر مشرقی پاکستان کے عوام کی بھاری اکثریت کسی قدر احساس محرومی کے باوجود پاکستان کے ساتھ جڑی رہی کیونکہ اُس کی نفسیات میں یہ احساس جاگزیں تھا کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے شہری ہیں۔

ایک ماہ قیام کے دوران مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ قوم کے سامنے ۶ نکات کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لینا، مشرقی پاکستان کے حقیقی مسائل اور اُن کے حل پر تفصیلی گفتگو کرنا اور افسردہ دلوں میں اُمید کے چراغ روشن کیے رکھنا از بس ضروری ہو گیا ہے کہ ایوب خاں کی آمریت سے قومی وجود زخم زخم تھا۔ میں نے اسی لیے ۵ قسطوں میں یہ حقیقت اُجاگر کرنے کی حقیر سی کوشش کی کہ صدارتی نظام کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے عوام بجا طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مغربی پاکستان کی سول اور ملٹری بیوروکریسی کے غلام اور یکسر بے اختیار ہیں جبکہ اسمبلی، کابینہ اور حکومت کے ادارے ربرب اسٹیپ سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتے۔ پہلی قسط میں یہ تاریخی حقیقت پیش کی گئی تھی کہ لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے اجتماع کے بعد مئی ۱۹۴۶ء میں دہلی کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پورے ہندوستان سے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں کامیاب ہونے والے منتخب نمائندوں کا ایک کنونشن قائد اعظم کی زیر صدارت منعقد ہوا جس میں قرارداد لاہور میں ترمیم کرتے ہوئے جناب سہروردی نے ایک پاکستان کی قرارداد پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور ہوئی تھی، جبکہ یہ ۶ نکات اس متفقہ قرارداد پر کاری ضرب لگانے اور ایک نیا ملک بنانے کی ایک نظریاتی کوشش ہے۔ دوسری اقساط میں حالات کو سدھارنے، دونوں بازوؤں کو قریب تر لانے اور عوام کو اقتدار میں موثر طور پر شامل کرنے کی تجاویز دی گئی تھیں۔ دسمبر ۱۹۶۶ء کے آخر تک حکومت کی بے بصیرتی اور عاقبت نااندیشی سے جنم لینے والی چھوٹی بڑی سیاسی شورشوں کے باوجود اچھے امکانات کے آثار پائے جاتے تھے کیونکہ مغربی پاکستان میں بھی صوبائی خود مختاری، حق بالغ رائے دہی اور پارلیمانی نظام کے حق میں وسیع بنیادوں پر تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی اور مشرقی پاکستان کے مسائل پر خصوصی توجہ دینے کا عمل شروع ہو چکا تھا۔

شیخ مجیب الرحمن نے ۷ جون کو اہل ڈھاکہ سے ۶ نکات کے حق میں ۲ روز پہلے ہڑتال کی کال دی۔ اس کا پہلے روز کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آیا، دوسرے روز شیخ صاحب گرفتار کر لیے گئے جس کی خبر پھیلنے ہی لوگ بازاروں اور گلیوں میں جمع ہونے لگے اور ۷ جون کو ڈھاکہ کے میں بھرپور ہڑتال ہوئی۔ لوگ گورنر منعم خاں اور ایوب خاں کے خلاف پُر جوش نعرے لگاتے رہے۔ ۱۰ روز بعد پورے صوبے میں شیخ مجیب کی طرف سے ہڑتال کی اپیل کی گئی جس کا عوام کی طرف سے جواب کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ابھی تک صرف ڈھاکہ مجیب کے سحر میں گرفتار ہے۔

بدقسمتی سے صدر ایوب خاں نے ۶ نکات کا مدلل جواب دینے اور مشرقی پاکستان کے عوام کو گورنر منعم خاں کے عذاب سے نجات دلانے کے بجائے اپنی ماہانہ نشری تقریر میں کہا کہ ہم علیحدگی پسندوں کے خلاف اسلحہ کی زبان استعمال کرنے پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ دریں اثنا وزیر خارجہ مشر بھٹو نے عوامی لیگ کی قیادت کو ۶ نکات پر مناظرے کا چیلنج دے دیا جسے سیکرٹری جنرل تاج الدین نے قبول کر لیا مگر تاریخیں بار بار تبدیل کرنے کے بعد بھی وہ ڈھاکہ نہیں گئے۔ اس طرز عمل نے مشرقی پاکستان کے شہریوں میں یہ احساس ابھارنا شروع کر دیا کہ چونکہ مغربی پاکستان کے زیادہ تر لیڈر ۶ نکات کے مخالف ہیں، اس لیے وہی ہمارے حق میں بہتر ہوں گے۔ یوں محبت کے زمزم میں بے اعتمادی کی آمیزش بتدریج شامل ہوتی گئی جو ۵ سال بعد ایک خونیں انجام کی شکل اختیار کر گئی۔

۶۹ گیارہ بجے کے لگ بھگ میں
۳ جون نے شیخ مجیب الرحمن کو فون کیا۔

پہلے ایک صاحب، پھر دوسرے صاحب نے میرا نام پوچھا۔ دوسرے صاحب غالباً شیخ صاحب کے پرائیویٹ سکرٹری تھے۔ پرائیویٹ سکرٹری نے کہا:

”شیخ صاحب، فارن ڈپلومیٹس سے باتیں کر رہے ہیں۔“
”اچھا، میں کچھ دیر کے بعد فون کر لوں گا۔“ میں نے باتوں کی نوعیت کے بارے میں سوچتے ہوئے جواب دیا۔
”ایک منٹ ٹھہریے، میں ان سے کہتا ہوں۔“

چند لمحوں بعد شیخ صاحب کی آواز گونجی۔ میں نے انگریزی میں اپنا تعارف کرایا، وہ اردو میں بولے:

”میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ کب آئے؟ کل ساڑھے آٹھ بجے آجائے، دل کی باتیں کریں گے۔“

ریسیور رکھ دینے کے بعد شیخ صاحب کے مختلف روپ ذہنی افق پر ابھرنے اور ڈوبنے لگے۔ گول میز کانفرنس میں انھیں کئی مراحل پر دیکھا تھا۔ ان کا عالم برہمی بھی یاد آیا اور ان کا خوشی سے پھولے نہ سمانا بھی بھلایا نہ گیا۔ سیاست کے کوچے میں ان کے اندازِ دلربائی کیا کیا قیامت نہ ڈھا گئے۔ ان کے عہد و پیمان، بوالہوسوں کے لیے اُمید نشاط اور اہل نظر کے لیے آزار جاں۔ یہ تمام مناظر ایک ایک کر کے کئی ان کہی داستانیں کہہ گئے۔

میں مشرقی پاکستان میں ۱۱ مئی سے گوبکو پھر رہا تھا۔ ۲ جون تک تقریباً آٹھ ضلعوں کے اندر فی علاقوں میں گیا۔ طالب علموں، دانشوروں، سیاست دانوں اور دیہات کے بھولے بھالے پاسیوں سے باتیں کیں۔ تقریباً ہر محفل اور ہر گفتگو میں شیخ مجیب الرحمن کا ذکر چلا۔ مختلف مقامات پر عوام کے مختلف رد عمل تھے۔ چند جھلکیاں آپ بھی دیکھیے:

ڈھاکہ شہر میں شیخ صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ ایک طالب علم، جو کبھی منعم خاں کی نعمتوں کا رس چوستا رہا ہے، بڑے پر غلوص لہجے میں بولا:

”پورا مشرقی پاکستان شیخ صاحب کے ایک اشارے پر جانیں دینے کے لیے تیار ہے۔ وہ ہمارا محبوب لیڈر ہے، اس نے ہمارے لیے جیل کی سختیاں برداشت کی ہیں، اُس کے لیے ہمارے سر حاضر ہیں۔“
میڈیکل کالج کی ایک طالبہ نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے عرض مدعا بیان کیا:

”شیخ صاحب ہماری آرزوؤں اور ہماری تمناؤں کے نقیب ہیں۔ ان کے چھ نکات میں ہمیں بنگلہ قومیت کی آزادی کا سہنا خواب نظر آتا ہے۔ وہ جب تقریر کرتے ہیں، الفاظ کے طوفان میں جذبات بہہ جاتے ہیں۔ وہ ہمارے حقوق کے محافظ اور ہمارے عزائم کے ترجمان ہیں۔“

ایک بڑے سرکاری ملازم نے راز داری کے سے انداز میں کہا:

”پورا مشرقی پاکستان مجیب کی مٹھی میں ہے، مغربی پاکستان کو اسی سے معاملہ کرنا ہوگا۔“

ایک شکستہ خاطر، مگر منجھے ہوئے سیاست دان نے دھیمی آواز میں کہا:

”مجھے تو اب مجیب الرحمن ہی معتدل سیاست دان دکھائی دیتا ہے۔ اگر اس کے ہاتھ مضبوط نہ کیے گئے، تو انتہا پسند قوتیں ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گی۔“

میں نے ایک رکشا چلانے والے سے پوچھا:

”تم شیخ مجیب الرحمن کو جانتے ہو؟“

اس نے تڑپ کر جواب دیا:

”اسے کون نہیں جانتا۔ جب وہ ۲۲ فروری کو جیل سے نکل کر آیا، لاکھوں انسان اسے دیکھنے کو آئے۔ وہ تو امارا نیتا ہے۔“

اسی شہر میں ایسے لوگ بھی ملے جو شیخ صاحب کے شدید مخالفوں میں سے تھے۔ شیخ صاحب کے ایک سابق رفیق نے کہا:

”وہ جمہوریت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ اس کے تمام عزائم میں فسطائیت کی روح کار فرما ہے۔“

ایک بزرگ سیاست دان کے آگے میں نے

مجیب صاحب کا نام لیا، تو دفعۃً ان کی مٹھیاں بھینچ گئیں:

”میرے سامنے اس کا نام نہ لیجیے۔ میں نے اس کے تمام چھن دیکھ رکھے ہیں۔ میں اسے بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ یہ غالباً ۳۸ء کی بات ہے، فریدپور میں مسلم لیگ کے دو دھڑے قائم ہو گئے۔ ایک کے ساتھ مولوی تمیز الدین خاں تھے اور دوسرے کے ساتھ عبدالسلام خاں۔ ایک روز ان دونوں گروپوں نے ایک ہی وقت میں جلے منعقد کیے۔ مولوی تمیز الدین خاں کے جلے کی صدارت خواجہ ناظم الدین کر رہے تھے اور عبدالسلام خاں نے سہروردی صاحب کو بلا رکھا تھا۔ مولوی تمیز الدین خاں کے جلے میں حاضری زیادہ تھی۔ ناگاہ ایک نوعمر لڑکا کندھے پر لاٹھی رکھے آیا اور اس نے چند منٹ کے اندر جلے میں گڑ بڑ پیدا کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مجمع سہروردی صاحب کے جلے میں زیادہ ہو گیا۔ سہروردی صاحب نے یہ منظر دیکھا، تو نوعمر لڑکے کو بلا بھیجا۔ لڑکا سچ پر آیا، تو اس کا نام پوچھا۔

لڑکے نے اپنا نام مجیب الرحمن بتایا۔ سہروردی صاحب نے اس کی ہمت کی داد دی اور کہا: کلکتہ آؤ، تو مجھے ضرور ملنا۔ یہ سہروردی صاحب سے مجیب کی پہلی ملاقات تھی۔“

شیخ مجیب الرحمن کے بارے میں ملے جلے تاثرات میرے ذہن پر قابض رہے پھر رگپور کے قریب مجھے ایک بوڑھے کسان کا مختصر فقرہ یاد آ گیا:

”سنا ہے مجیب پاکستان کو کمزور کرنا چاہتا ہے۔“

کھلنا کے ایک طالب علم نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا تھا:

”میرا تعلق سٹوڈنٹس لیگ سے ہے۔ سٹوڈنٹس لیگ کے اس طبقے سے نہیں جو کل پاکستان بنیادوں پر نہیں سوچتا۔“

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

کومیلا کے ایک دیہاتی نے اشکبار آنکھوں سے کہا تھا:

”مجیب یہ تو پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے فلاں فلاں حقوق پامال ہوئے، مگر یہ کوئی نہیں بتاتا کہ پاکستان بننے کے بعد ہمیں کیا کیا ملا؟ خدا نے اتنی نعمتیں دی ہیں کہ میرا سر جذ بہ شکر سے جھک جاتا ہے۔“

دیناج پور کے ایک شہری نے کہا:

”مجیب الرحمن کی حکومت صرف ڈھاکہ تک محدود ہے۔ اس کے جاں نثار بیس تیس سے زیادہ نہیں۔“

یہ تمام باتیں میرے ذہن پر چاروں طرف سے یلغار کر رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ پاکستان کا وزیراعظم بننے کے امکانات کس شخصیت میں زیادہ ہیں۔

۳ جون کو وقت مقررہ پر شیخ صاحب کی اقامت گاہ پر جا پہنچا۔ خوبصورت اور دو منزلہ بنگلہ۔ برآمدے میں شیخ صاحب کے چاہنے والوں کا ہجوم، زیادہ جوان چہرے، آنے جانے والوں کا تانتا سا بندھا ہوا۔ شیخ صاحب کے ڈرائنگ روم تک رسائی ہوئی۔ ٹیگور کی قد آدم تصویر نے خیر مقدم کیا۔ شیخ صاحب جلد ہی تشریف لے آئے اور مجھے سینے سے لگا لیا جیسے برسوں کے شناسا ہوں پھر محبت بھرے لہجے میں بولے:

”قرنیشی صاحب، میں آپ کو ایک مدت سے جانتا ہوں۔ اس وقت سے جب میں دوسری دستور ساز اسمبلی کا رکن بنا تھا۔ آپ اس وقت اسمبلی میں آیا کرتے تھے۔“

میں تردید کرنا چاہتا تھا کہ میں تو اس وقت صحافت میں تھا ہی نہیں، مگر شیخ صاحب کی رواں باتوں نے کچھ کہنے کی اجازت نہ دی۔ وہ کہہ رہے تھے:

”آپ اس وقت بھی پائے کی رپورٹنگ کرتے تھے۔ اس زمانے میں آپ سے کئی بار ملاقاتیں ہوئیں۔ آپ

.....

.....

.....

.....

.....

.....

.....

شیخ صاحب ہماری آرزوؤں اور ہماری تمناؤں کے نقیب ہیں

ان کے ۶ نکات میں ہمیں بنگلہ قومیت کی آزادی کا سہنا خواب نظر آتا ہے (میڈیکل کالج کی طالبہ)

21 | urdudigest.pk | 2013 - جنوری

نے سیاسی معاملات میں ہمیشہ گہری دلچسپی لی ہے۔“
میں نے ایک بار پھر کچھ کہنے کا عزم کیا۔ ہونٹ کھلنے
بھی نہ پائے تھے کہ شیخ صاحب کی زبان فیض ترجمان نے
حقائق پر سے پردہ اٹھانا شروع کیا:

”قریشی صاحب، آپ کو یاد ہو گا میں نے دستور
سازی میں کتنی دلچسپی لی تھی۔ آپ تو ایک ایک مرحلے سے
واقف ہیں۔ میری پوری زندگی سیاست کی زلفیں سنوارتے
گزری ہے۔“

کمر اکرم عمر مشتاقین سے پُر تھا۔ سب کی نظریں
مجیب الرحمن کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ ان کے
چہرے و نور جذبات سے چمک رہے تھے۔

شیخ صاحب کی مست آگیاں آنکھیں بار بار کھلتی اور
بند ہوتی تھیں۔ ان آنکھوں میں انا کے خمار سے ملنے ملنے
ڈورے ابھر آئے تھے۔ نیم گھٹی مونچھوں میں مستقبل کی
سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔

”قریشی صاحب، میں جانتا ہوں آپ نے میرے
خلاف اردو ڈائجسٹ میں لکھا ہے، میں اس کی قدر کرتا
ہوں، کیونکہ آپ کی نیت میں خلوص اور دیانت ہے۔
سیاست کا اصول ہی اختلاف رائے کا احترام کرنا ہے۔
بعض سیاست دانوں نے بھی مجھ پر الزامات لگائے ہیں۔
میں ان کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ یہ اخلاقی اعتبار سے سخت
معیوب ہے کہ ایک دوسرے پر چھینے اڑائے جائیں۔
مجھے حیرت ہے شورش کاشمیری نے میرے خلاف مواد
کیونکر چھاپا، وہ تو میرے دوستوں میں سے تھے۔ میں
نوابزادہ نصر اللہ خاں کی ایک بات کا جواب دے سکتا
ہوں، مگر میں ان بکھیڑوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔ میں تو
عوام کا خادم ہوں، بس خدمت کرنا اپنا شعار ہے۔“
شیخ صاحب نے ماحول پر ایک نظر ڈالی۔ ان کے چند

اور احباب کمرے میں آگئے تھے۔ شیخ صاحب نے فاتحانہ
انداز میں کہا:

”قریشی صاحب، میں سیاسی لیڈر، سیاسی ورکر
ہوں۔ میرا گھر یہاں کے عوام کے لیے ہر وقت کھلا رہتا
ہے۔ ان لوگوں نے میرا ہر قدم پر ساتھ دیا ہے، میں انھیں
کیونکر چھوڑ سکتا ہوں؟ یہ میرے لیے خون بہانے کو تیار
تھے۔ انھوں نے میرے راستے میں آنکھیں بچھائی ہیں،
میں بھی ان کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کروں گا۔ ایک
سیاسی ورکر اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے؟“

حاضرین میں چند اور نفوس کا اضافہ ہو گیا تھا۔
شیخ صاحب نے گردن کو قدرے بلند کرتے ہوئے کہا:

”قریشی صاحب، آپ تو گول میز کانفرنس میں تقریباً
ہمارے ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ وہاں آپ نے میرے
بارے میں وزارت عظمیٰ کی باتیں تو سنی ہوں گی؟“
”جی ہاں، مختلف قسم کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔“

”قریشی صاحب، آپ صحافی ہیں، آپ سے کیا
چھپانا۔“

اتنے میں ایک صاحب ریش آگئے اور باتوں کا
سلسلہ چند ثانیوں کے لیے منقطع ہو گیا۔ شیخ صاحب باہر
گئے اور جلد ہی واپس آگئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا یہاں کا
سارا نظام اشاروں پر چلتا ہے۔

”قریشی صاحب، گول میز کانفرنس میں
چودھری محمد علی، نوابزادہ نصر اللہ خاں اور مودودی پہلے ہی
سے ایوب سے ساز باز کر چکے تھے۔“

”آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟“ میں نے
رک رک کر پوچھا۔

”قریشی بھائی، آپ بھی ثبوت مانگتے ہیں۔ آپ کو تو
سب کچھ معلوم ہے۔ اس کا واضح ثبوت تو یہ ہے کہ جونہی

ایوب خاں نے دو نکات کا اعلان کیا، تو چودھری محمد علی نے
فوراً صدر کو مبارک باد دی۔ نوابزادہ اور مودودی کا بھی یہی
طرز عمل تھا۔ میں سمجھ گیا یہ کھلی سازش ہے۔ میں نے گرج
کر کہا: یہ کیا ہو رہا ہے، ہم نے ایوب خاں سے اقتدار خون
دے کر لیا ہے، وہ ہم پر کوئی احسان نہیں کر رہے۔ میں نے
خبردار کیا کہ عوام فقط ان دو باتوں سے مطمئن نہ ہوں گے۔“
”مگر مجیب صاحب، مجھے تو ان واقعات میں کوئی
سازش نظر نہ آئی۔“

”آپ کو نظر آئے یا نہ آئے، میں کہتا ہوں کہ وہ ایک
سازش تھی، ورنہ ایوب خاں کے اعلان کا اس قدر خیر مقدم
نہ کیا جاتا۔“

”سنا ہے آپ کی مجوزہ ترمیموں سے دستوری
معاملات خراب ہوئے اور مارشل لاء تک کی نوبت آئی؟“
شیخ صاحب نے سر کے منتشر بالوں کو انگلیوں سے
سنوارتے ہوئے کہا:

”یہ ترمیمیں میری نہ تھیں، یہ تو عوامی لیگ نے
مرتب کی تھیں اور قمر الزماں نے انھیں ایوب خاں تک
پہنچایا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ترمیموں کے بارے میں
اس قدر ہنگامہ کیوں ہے؟ قریشی صاحب، قانون ساز
اسمبلی میں سینکڑوں اور ہزاروں ترمیمیں پیش ہوتی ہیں،
سب کی سب تو منظور نہیں کر لی جاتیں، بالکل یہی معاملہ
ہماری ترمیموں کا تھا۔ وہ ترمیمیں تھیں، فقط ترمیمیں!
سیاست میں معاملہ سازی (BARGAINING) کا اصول
ہر جگہ کارفرما ہے اور اس کا حق سب کو حاصل ہے۔ ہو سکتا
نیشنل اسمبلی ہماری ایک ترمیم بھی منظور نہ کرتی اور یہ بھی
ہو سکتا ہے، ان کا بڑا حصہ عوامی نمائندوں کے لیے قابل
قبول ہوتا۔“

مجیب صاحب کے پہلو میں ایک نو عمر سیاسی ورکر

بیٹھے تھے۔ انھوں نے نعرہ بلند کیا:

”ہماری ترمیموں کے خلاف جمہوریت دشمن عناصر
پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔“

ایسے پُر آشوب ماحول میں مجھے سیاسی معاملہ سازی
پر گفتگو کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

”شیخ صاحب، موجودہ سیاسی بحران کا آپ کے پاس
کیا حل ہے؟“

”حل واضح ہے۔ ۵۶ء کا دستور انتخابات کے
لیے نافذ کر دیا جائے اور منتخب پارلیمنٹ کو چھ ماہ کے
لیے محض اکثریت (Simple Majority) یا واضح
اکثریت (Absolute Majority) کے ذریعے دستور
میں ترمیم کرنے کا اختیار دے دیا جائے۔ سیمپل اور
ایسولیوٹ کا فرق تو آپ جانتے ہی ہیں۔ سیمپل میجاریٹی
سے مراد حاضر ارکان کی اکثریت اور ایسولیوٹ
پارلیمنٹ کے کل ارکان کی اکثریت، ہمارے لیے یہ
دونوں قابل قبول ہیں۔“

”شیخ صاحب، محض اکثریت کے بل پر پورے دستور
کا پوسٹ مارٹم ہو جائے گا۔“

”قریشی صاحب، میں آپ کے خدشات کو پوری
طرح سمجھتا ہوں۔ میری رائے میں یہ زیادہ تر مفروضوں پر
مبنی ہیں۔ انتخابات کے ذریعے عوام کے وہ نمائندے منتخب
ہو کر آئیں گے جن کا سیاسی شعور سابق نمائندوں سے یقیناً
بہتر ہوگا۔ وہ دستور میں کوئی ایسی ترمیم نہ کریں گے جس
سے ملک کی سالمیت کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ ہمیں عوام
کی سیاسی بصیرت پر اعتماد کرنا چاہیے۔“

”شیخ صاحب، اگر عوام کے جذبات قابو میں نہ
ہوں، تو ہوش پر جوش غالب آجاتا ہے۔ دستوری مسائل کو
اس ملک میں کتنے لوگ سمجھنے والے ہیں؟ وہ دستوری

ہم نے ایوب خان سے اقتدار خون دے کر لیا ہے

وہ ہم پر کوئی احسان نہیں کر رہے



الجھنیں جنہیں پختہ سیاسی قائدین نہ سلجھا سکے، عوام ان کے بارے میں کیا فیصلہ دیں گے؟“

”مگر قریشی صاحب، آپ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ۵۶ء کا دستور بھی تو اکثریت ہی کے اصول پر تیار ہوا تھا، اس میں ردوبدل کا حق اکثریت ہی کو ملنا چاہیے۔“

شیخ صاحب کی آواز میں بلا کا تحکم اور غضب کا اعتماد تھا۔

میں ایک بار پھر سہم گیا۔ صحافی میں دم خم ہی کتنا ہوتا ہے؟ کھوئی ہوئی ہمت مجتمع کر کے میں نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھنے کی کوشش کی۔

”اس تجویز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ دستوری مسائل حل کرنے کے لیے سیاسی جماعتوں کو ایک متفقہ فارمولے پر جمع کر لیا جائے۔“

”مجھے اس تجویز سے اصولی اختلاف ہے۔ قریشی صاحب، آج کی سیاسی جماعتیں وہ ہیں جن میں بیشتر انتخابات کے مراحل سے نہیں گزریں۔ فرض کیجیے آج آپ مجھ سے کوئی معاملہ کرتے ہیں، کیا خبر انتخابات میں عوام مجھ پر اعتماد کرتے ہیں یا نہیں؟ یہی معاملہ دوسری شخصیتوں اور سیاسی جماعتوں کا ہے۔ دراصل انتخابات کے بعد ہی معلوم ہوگا، عوام کے حقیقی نمائندے کون ہیں۔ ان نمائندوں ہی کے ذریعے قومی مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔“

”شیخ صاحب، آپ کے چھ نکات شکل و صورت سے بڑے خطرناک دکھائی دیتے ہیں مگر آپ تو ایسے نہیں۔“

اس پر شیخ صاحب کی آنکھیں مسکرائیں۔ ان کا قد اور لمبا ہو گیا اور انھوں نے ملازم کو چائے لانے کو کہا۔

”قریشی صاحب، مجھے افسوس ہے باتوں میں چائے کا خیال ہی نہ رہا۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے! آپ جانتے ہیں مشرقی پاکستان کے لوگ بڑے مہمان نواز ہیں۔“

”جی ہاں، سفر کے دوران میں بڑے خوشگوار تجربات ہوئے۔ مجھے تو یہاں کے رہنے والوں کی یہ ادا بھاتی ہے، بس کبھی کبھی کچھ اور گمان گزرنے لگتا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”یہی کہ شاید آپ لوگ ہم سے نفرت کرتے ہیں۔“

”نہیں، قریشی صاحب، آپ کا گمان ۱۰۰ فیصد غلط ہے۔ ہمارے عوام اور آپ کے عوام ایک ہیں اور ایک ہی رہیں گے۔ پاکستان برصغیر میں مسلمانوں کی متحدہ کوششوں کے نتیجے میں دنیا کے نقشے پر ابھرا اور انشاء اللہ اس کا پرچم ہمیشہ سر بلند و سر فراز رہے گا۔ میرے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی چاہتا ہوں، یہ سراسر بہتان اور افتراء ہے۔ اگر میرا منصوبہ مشرقی پاکستان کو آزاد کرانے کا ہوتا، تو میں ۲۲ فروری ۱۹۶۹ء کو اس کا اعلان کر سکتا تھا۔ جب میں جیل سے باہر آیا، لاکھوں انسان میرے گرد جمع ہو گئے تھے۔ میں ریس کورس میدان میں علیحدگی کا اعلان کر سکتا تھا۔ اس وقت مجھے روکنے والا کون تھا؟ میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں نے پاکستان کی تشکیل میں اپنا خون دیا ہے اور میں ایک پاکستان کی سلامتی کے لیے جدوجہد کرتا رہوں گا۔“

”مگر آپ کے ۶ نکات کچھ اور کہتے ہیں۔“ میں نے گرمی محفل میں جرأت رندانہ سے کام لیا۔

”قریشی صاحب، ۶ نکات قرآن اور بائبل تو نہیں، ان پر نظر ثانی کی جاسکتی ہے مگر میں آپ کو بتاؤں کہ ۶ نکات ظالم طبقے کے خلاف مظلوموں کی دلی آواز ہے ہمیں مغربی پاکستان کے عوام سے کوئی کد نہیں، وہاں کی خوشحالی ہماری اپنی خوشحالی ہے، ہمیں صرف اسی طبقے سے نفرت ہے جس نے کبھی بیوروکریسی اور کبھی صنعت کاروں

کے روپ میں ہمارے حقوق پر ڈاکے ڈالے اور بد قسمتی سے ان سب کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے۔ اس چھوٹے سے طبقے نے مغربی پاکستان کے عوام کو بھی ظلم کی چکی میں پیسا ہے۔ ہم سب مل کر اس طبقے کے خلاف جنگ لڑیں گے۔ یہی طبقہ مسلسل ہمارے مسائل الجھاتا آیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے لوگ صرف انصاف چاہتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ۶ نکات دراصل انصاف کا منشور ہے۔“

”مگر شیخ صاحب، کمزور اور بے نام مرکز دونوں صوبوں کے مفادات کی حفاظت کیونکر کرے گا؟“

”۶ نکات سے مرکز کمزور نہیں ہوتا۔“

”شیخ صاحب، کیا آپ کسی ایسے مرکز کا تصور کر سکتے ہیں جسے ملک کا دفاع کرنا ہو اور اس کے پاس ایک پیسا نہ ہو؟“

اتنے میں مسٹر سلیمان اور بیگم اختر سلیمان بھی تشریف لے آئے۔ وہ مجیب الرحمن ہی کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ شیخ صاحب نے اپنا فلسفہ بیان کرنا شروع کیا:

”میں یہ نہیں کہتا کہ مرکز کو ٹیکس لگانے کا حق نہیں۔ وہ ٹیکس لگائے اور صوبائی حکومت وہ ٹیکس جمع کر کے مرکز کے حوالے کر دے۔“

”اگر صوبائی حکومتیں روپیہ دینے سے انکار کر دیں، تو؟“

”یہ کیسے ممکن ہے، دستور کی رو سے صوبائی حکومتیں قوم ادا کرنے کی پابند ہوں گی۔“

”وہ مختلف بہانوں سے دستوری ضابطوں کو التوا میں ڈال سکتی ہیں۔“

”اگر ایسا ہو، تو مرکزی حکومت فوج کشی کر دے۔“

اس پر مسٹر سلیمان بولے:

”شیخ صاحب، ملک کے اندر ہی فوج ایک صوبے

کے خلاف استعمال ہو، یہ کس قدر نادانی اور بیوقوفی کی بات ہوگی۔ آخر ایسی صورت اختیار ہی کیوں کی جائے جس میں فوج کشی کی نوبت آئے۔ آپ ٹیکس لگانے اور ٹیکس جمع کرنے کی جو سکیم بتا رہے ہیں، اس کا تجربہ ۳۷ء کے لگ بھگ ہندوستان میں کیا جا چکا ہے۔ اس وقت بھی صوبے کی حکومتوں نے وعدہ کیا تھا کہ ہم مرکزی حکومت کو قوم فراہم کیا کریں گی۔ ۶ ماہ کے اندر مرکزی حکومت بالکل کنگال ہو گئی اور صوبوں سے رقوم آتی بند ہو گئیں۔ اس ناکام تجربے کے نتیجے میں غالباً ریزمین ایوارڈ آیا تھا جس میں صوبوں اور مرکز کے درمیان ٹیکسوں کو واضح تقسیم تھی۔“

اس جواب پر مجیب الرحمن کی آواز میں خاصا دھیمپا پن پیدا ہو گیا۔

انتقال زر کی بات چلی، تو مسٹر سلیمان نے ایک اور نکتہ اٹھایا:

”شیخ صاحب، انتقال زر مصنوعی طریقوں سے نہیں روکا جاسکتا۔ آپ جانتے ہیں سرمایہ بڑی حساس شے ہے۔ دنیا کے ہر گوشے میں یہی ہوتا ہے کہ سرمایے کو جہاں بہتر حالات نظر آتے ہیں، وہ اس طرف کھینچتا چلا جاتا ہے اور جہاں اس کے لیے حالات سازگار نہیں، وہاں سے اس کا فرار لازمی ہے۔ آپ مشرقی پاکستان میں خوشگوار حالات پیدا کر دیجیے، سرمایہ خود بخود یہاں آئے گا۔“

”خوشگوار حالات کون پیدا کرے؟“ شیخ صاحب نے پُر سکون لہجے میں پوچھا،

”یہ کام سب کو مل جل کر کرنا ہوگا۔ اور دیکھیے، آپ بینکوں سے انتقال زر کی بات کرتے ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہر بینک کو یہ واضح ہدایات ہیں کہ فصل کی کٹائی کے دنوں میں ایک خاص نسبت سے سرمایہ مشرقی پاکستان میں رکھے۔ جب یہ دور گزر جاتا ہے تو یہ سرمایہ ملک کے اس

میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی چاہتا ہوں



یہ سراسر بہتان اور افتراء ہے

مگر یہ نکات مظلوموں کی دلی آواز ہے (مجیب)

جسے میں چلا جاتا ہے جہاں اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور پھر یہ سرمایہ ضرورت کے وقت مشرقی پاکستان میں آجاتا ہے۔ سرمایے کو جامد نہیں رکھا جاسکتا۔“

”مگر مغربی پاکستان والے ہمارا زر مبادلہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں بیرونی ممالک میں مشرقی پاکستان کے تجارتی مشن ہوں۔“

شیخ صاحب نے بڑے تحمل سے کہا۔
”آپ مرکز کو خارجہ پالیسی دینا چاہتے ہیں؟“ میں نے آہستہ سے پوچھا:
”جی ہاں۔“

”کیا تجارت و اقتصادیات کے بغیر خارجہ پالیسی کا تصور کیا جاسکتا ہے؟“

”ہم اپنے تجارتی مشن سفارت خانوں کے ذریعے اور ملک کی خارجہ پالیسی کے تحت قائم کریں گے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ خارجہ پالیسی کو فوقیت حاصل ہوگی۔ جن ممالک کے ساتھ ہمارے روابط دوستانہ ہوں گے، انہی سے ہم تجارتی تعلقات قائم کریں گے۔“

بیگم اختر سلیمان نے ذرا خشکیوں لہجے میں کہا:
”مجیب، میں ناشتے کے لیے جاتی ہوں، خواہ مخواہ تم سے الجھ پڑوں گی ۶ رنکات پر۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

شیخ مجیب نے بڑے معتدل انداز میں کہا:

”قریشی صاحب، آپ ماہر اقتصادیات ہیں، نہ میں اور مسٹر سلیمان! ہمارے چند مسائل ہیں، ہم ان کا حل چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ماہرین اقتصادیات کی ایک کمیٹی قائم کی جاسکتی ہے، ۲۲ رکن مشرقی پاکستان کے ہوں اور ۲ مغربی پاکستان کے۔ ضرورت محسوس ہو تو باہر سے بھی

کسی بین الاقوامی شہرت کے ماہر کو بلایا جاسکتا ہے۔ یہ کمیٹی جو بھی فیصلہ کرے گی، وہ ہمارے لیے قابل قبول ہوگا۔“
”یہ تجویز تو بڑی معقول ہے“ میں نے شیخ صاحب کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”قریشی صاحب، میں یہ سچے دل سے کہتا ہوں کہ ۶ رنکات قرآن اور بائبل نہیں، یہ تو میں نے سیاسی سمجھوتے کے لیے پیش کیے تھے، مگر بعض اخبارات اور بعض قائدین نے انھیں ایک دوسرے ہی رنگ میں پیش کیا۔ گفتگو اور بات چیت کے ذریعے سیاسی سمجھوتہ ناممکن نہیں۔“

ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک غیر ملکی نامہ نگار آگیا۔ شیخ صاحب نے اسے دوسرے روز ۹ بجے کا وقت دیا۔ کمرے میں ہجوم خاص تھا، میں نے بھی رخصت لی اور کہا:
”مجھے تنہائی میں ایک دو گھنٹے کے لیے باتیں کرنی ہیں۔“

”آپ کل ۱۰ بجے آجائیے، میں کمر بند کر لوں گا۔“
مگر ۹ بجے تو غیر ملکی نامہ نگار آئیں گے۔“

”میں انھیں زیادہ وقت نہیں دیتا، بس یہی پندرہ بیس منٹ، مجھے زیادہ خوشی اپنے ہی لوگوں سے مل کر ہوتی ہے۔“

دوسرے روز میرے ہمراہ جناب اے جی شیخ بھی تھے۔ جناب اے جی شیخ فری لانس فوٹو گرافر ہیں، فنون لطیفہ کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی ہیڈ مسٹرس نے ان کا نام الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں میں نے بھی ان کا نام کچھ کا کچھ نہ لکھ دیا ہو۔ شیخ صاحب کے لیے ہمیں تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ وہ اس بار جناب اے جی شیخ سے بڑے تپاک سے ملے اور مجھ سے مخاطب ہوئے:
”یہ آپ کے دوست تمام ہنگاموں میں میرے ساتھ

رہے۔ ۲۲ فروری کو یہ میری تصویریں لیتے رہے پھر ۲۳ مارچ کے قریب مجھے ڈھاکہ کے گلی کوچوں میں جانا پڑا۔ منعم خاں کی سازش تھی کہ مقامی لوگوں اور مہاجرین کے درمیان فسادات کرا دیے جائیں۔ میں اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے میدان میں نکل آیا۔ اپنے دوست سے پوچھیے، میں نے کس قدر خطرات میں کام کیا۔“
”جناب، مجھے تو سیاست سے ذرا بھی دلچسپی نہیں، میں تو ہنگاموں سے کوسوں دور رہا ہوں۔“ جناب اے جی شیخ نے کہا۔

”مگر تم نے ہمیں کام کرتے ہوئے تو دیکھا ہے۔ تم تو ہماری جیب کے بہت قریب تھے۔“

میرے دوست خاموش رہے اور تصویر لینے کے لیے اپنے آلات درست کرنے لگے۔

”کیا میری پوری تصویر لو گے؟“ شیخ صاحب نے پوچھا۔

”آپ جس قدر چاہیں اور جیسی چاہیں، میں حاضر ہوں۔“ شیخ صاحب کی آنکھوں میں مسکراہٹ رقص کرنے لگی۔

کمرے میں وہی ہجوم عاشقان تھا۔ مجیب صاحب نے میرا سب سے تعارف کرایا۔ زیادہ تر وہی احباب تھے جو شیخ صاحب کے ساتھ گول میز کانفرنس کے سلسلے میں مغربی پاکستان گئے تھے۔

”مجیب صاحب، کچھ اپنی زندگی کے حالات بتائیے۔“

”بھئی میں تو ایک کارکن ہوں۔“
”مگر اب تو آپ قد آور قائد ہیں اور شاید پاکستان کے ہونے والے وزیر اعظم۔“

”قریشی صاحب، سازشیں ہو رہی ہیں۔“
”آپ تو ان سازشوں سے بالاتر ہیں۔“

”میں انتخابات پر یقین رکھتا ہوں، ہمارے مسائل کا واحد حل انتخابات ہیں۔ وہ شخصیتیں جو ہوا میں معلق ہیں، وہ انتخابات کے نام ہی سے چونک اٹھتی ہیں۔ میں اپنی

شیخ صاحب نے فاتحانہ انداز

میں کہا ”بنگالیوں نے میرے

راستے میں آنکھیں بچھائی ہیں

میں بھی اُن کے لیے کسی قربانی

سے دریغ نہیں کروں گا۔“

جماعت کو کل پاکستان بنیادوں پر منظم کر رہا ہوں۔ میں بھاشانی کو چیلنج دیتا ہوں کہ انتخابات کے ذریعے عوام کا سامنا کریں۔ ان میں جرأت نہیں ہم ملک میں انارکی پھیلنے نہیں دیں گے۔“

”آپ کی جماعت کتنے فیصد نشستیں حاصل کر لے گئی؟“

”اگر انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوئے، تو ہمیں بھاری اکثریت حاصل ہوگی۔“

”مفصلات اور دیہات میں تو آپ کی جماعت کا زور خاصا کم ہے۔“

”اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔“

”اچھا، آئیے ماضی کی باتیں کریں، زندگی کے بیٹے ہوئے جسے کے بارے میں کچھ بتائیے۔“

”میری زندگی سلاسل و زنداں کی زندگی ہے۔ ہمیشہ مخالفوں سے ٹکراتا رہا ہوں۔ پاکستان میں ۱۰ برس سے بھی زیادہ عرصہ جیل میں گزرا۔ میری زندگی کے مختصر سے کوائف یہ ہیں:
”۱۹۲۰ء میں ضلع فرید پور کے ایک گاؤں ڈوگی پارا

ہمیں مغربی پاکستان کی بیوروکریسی اور صنعت کاروں سے نفرت ہے

جنھوں نے ہمارے حقوق پر ڈاکے ڈالے

(شیخ مجیب)

میں پیدا ہوا۔ تعلیم کے سلسلے میں کلکتہ آیا۔ وہاں اسلامیہ کالج میں بی اے کا طالب علم تھا کہ سیاسی ہنگاموں نے سر اٹھایا۔ مسلم لیگ کی تنظیم کا کام زوروں پر تھا۔ میں سلسلہ تعلیم منقطع کر کے سیاست میں چلا آیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے ڈیفنس منسٹر قائم کیا۔ کلکتہ میں اس کی سکرٹری شپ مجھے ملی۔ ۴۲ء میں فضل الحق صاحب نے مسلم لیگ کو چیلنج دیا۔ انہی دنوں بالائی گھاٹ میں ضمنی انتخابات ہونے والے تھے۔ مسلم لیگ کے رضا کاروں نے انتخاب کے سلسلے میں بڑے زور شور سے کام کیا۔ میں ان کے ساتھ تھا اور ہمیں انتخابات میں شاندار کامیابی ہوئی۔

بنگلہ مسلم لیگ کی کونسل کا رکن نامزد ہوا۔ ۴۲ء میں مسلم لیگ نے خط کے سلسلے میں ایک ریلیف کمیٹی قائم کی تھی، میں نے مرحوم لال میاں کے ساتھ اس کمیٹی میں کام کیا۔ ۴۵ء میں انتخابات کا اعلان ہوا۔ یہی وہ انتخابات تھے جس میں پاکستان کی تشکیل کا فیصلہ ہونا تھا۔ سہروردی صاحب نے مجھے فریدپور بھیج دیا۔ میں وہاں کی تنظیمی سرگرمیوں کا انچارج تھا۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو بہت عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی۔ پھر ۴۶ء کا دہلی سیشن آیا۔ ہم نے قائد اعظم کی موجودگی میں پاکستان کا حلف اٹھایا۔

۴۷-۴۶ء میں بہار میں ہندو مسلم فسادات بھڑک اٹھے۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد کلکتہ کی طرف آرہی تھی۔ مہاجرین کیمپ قائم کیا گیا۔ سہروردی صاحب کی ہدایت پر میں کانگریس حکومت سے بات چیت کرنے کے لیے گیا۔ ظفر امام سے بھی ملا پھر بنگال مسلم سٹوڈنٹس لیگ میں کام کرتا رہا۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جس کے صدر راجہ محمود آباد تھے، اس میں بھی نمایاں حصہ لیا اتنے میں سہلٹ کا ریفرنڈم سر پر آ گیا۔ میں ۵۰۰ کارکنوں کے ساتھ

سہلٹ گیا، وہاں ہم نے خوب کام کیا۔ آخر سہلٹ کے عوام نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ ہماری آرزوؤں کا محور، پاکستان وجود میں آئی گیا۔ بنگال مسلم لیگ توڑ دی گئی اور ایک ایڈہاک کمیٹی قائم ہوئی۔ اس پر خواجہ ناظم الدین اور سہروردی کے اختلافات ابھر آئے۔

۶ فروری ۴۸ء کو سٹوڈنٹس لیگ قائم ہوئی۔ ان دنوں اردو کو پاکستان کی واحد سرکاری زبان بنانے کی مہم زوروں پر تھی یہ نئی تنظیم اس مہم کے آگے ڈٹ گئی۔ مجھے ۱۱ مارچ ۴۸ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین نے ہماری تحریک کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور صوبائی اسمبلی نے مرکز کو سفارش کی کہ بنگلہ کو بھی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔ اس بنیادی تبدیلی کے آتے ہی ہمیں رہا کر دیا گیا۔

میں نے ۴۷ء میں بی اے پاس کر لیا اور اب یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا۔ ہماری رہائی کے بعد یونیورسٹی میں ایک ہڑتال ہوئی، مجھے یونیورسٹی سے نکال دیا گیا اور زنداں کی دیواروں نے ایک بار پھر خیر مقدم کیا۔

اب سہروردی پاکستان آچکے تھے۔ چند نوجوانوں اور پختہ سیاست دانوں کی کوششوں سے مسلم عوامی لیگ قائم ہوئی۔ میں جیل میں تھا۔ تاہم مجھے جائنٹ سکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ میں جلد ہی چھوٹ گیا، لیکن ایک موقع پر دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی اور جیل کی ہوا کھائی، مگر ضمانت پر رہائی مل گئی۔ نئی سیاسی تنظیم کے صدر بھاشانی اور جنرل سکرٹری شمس الحق منتخب ہوئے۔ رہا ہونے کے بعد لاہور گیا اور پیر ماکی شریف سے ملا۔ نومبر ۴۹ء میں مجھے پھر گرفتار کر لیا گیا اور اس بار ۵۲ء تک جیل میں رہا۔ میرے

خلاف دو مقدمے چل رہے تھے لیکن ایک میں بھی مجھے عدالت میں مجرم ثابت نہ کیا جاسکا۔

اب میں عوامی لیگ کا جنرل سکرٹری تھا۔ ۵۲ء کے آغاز میں خواجہ ناظم الدین نے صرف اردو کو سرکاری زبان بنانے کا ایک بار پھر اعلان کیا۔ اس وقت طلبہ کی آل پارٹیز ایکشن کمیٹی قائم ہوئی۔ میں اس وقت جیل میں تھا۔ طلبہ پر فائرنگ ہوئی میں نے جیل میں بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ نقابت کی وجہ سے مجھے سٹیر پر فرید پور سے ڈھاکہ ہسپتال میں لایا گیا۔ اس وقت سارا شہر بڑا سوگوار تھا۔ یہ قیامت خیز عہد بھی گزر گیا۔ ۵۴ء کے انتخابات کا انقلاب آفرین دور آیا۔ مسلم لیگ کو ذلت آمیز شکست ہوئی، وہ صرف ۹ نشستیں جیت سکی۔ فضل الحق کی وزارت قائم ہوئی۔ میں بھی اس میں وزیر تھا۔ آدم جی مل میں خونریز فسادات ہوئے اور فضل الحق وزارت برطرف کر دی گئی۔ میں ابھی وزیر کی حیثیت سے بنگلہ میں تھا، مجھے وہاں سے گرفتار کیا گیا۔ تقریباً ۴۰۰۰ افراد گرفتار ہوئے۔ سکندر مرزا اپنے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ ۵۵ء کے شروع میں قید و بند سے رہائی ہوئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دوسری دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ہونے والے تھے۔ میں اس کا رکن منتخب ہو گیا۔ ۵۶ء میں صنعت اور تجارت کا وزیر بنا۔ ۵۷ء تک وزارت کی ذمہ داریاں اٹھائیں۔ میں نے محسوس کیا عوامی لیگ کی تنظیم میری خدمات کا تقاضا کرتی ہے، چنانچہ میں نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور جنرل سکرٹری کی حیثیت سے تنظیمی امور میں مصروف ہو گیا۔ میں فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں واحد کارکن ہوں جس نے وزارت سے از خود استعفیٰ دیا۔

۵۸ء میں مارشل لاء آیا اور میرے لیے حکم اسیری لایا۔ میرے خلاف ۱۲ مقدمات چلائے گئے، وہ سب کے سب جھوٹے تھے۔ دسمبر ۵۹ء میں رہائی ملی۔ ۶۲ء میں پھر گرفتار ہوا۔ کراچی میں سہروردی قید کر لیے گئے تھے، وہ ۶۳ء میں چل بے اور عوامی لیگ کا بوجھ میرے کمزور کندھوں پر آن پڑا۔

۶۵ء کی جنگ نے ہم سب کو ہلا دیا۔ مشرقی پاکستان پوری دنیا سے کٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس احساس تنہائی اور بے سروسامانی نے ہمیں سوچنے پر مجبور کیا اور ۶ نکات وجود میں آئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ کھلی کتاب کی طرح سب پر عیاں ہے۔

میں بڑی سعادت مندی سے شیخ صاحب کی زندگی کے نشیب و فراز محفوظ کرتا رہا۔

طلبہ کے مشہور لیڈر طفیل احمد، شیخ صاحب کے پہلو میں تھے۔ آپ میرے اضطرابِ ناتمام کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شیخ صاحب نے یک بیک اونچی آواز میں کہا:

”قریشی صاحب، میں نے پاکستان کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا۔ تحریک پاکستان کے مراحل اپنی آنکھوں سے دیکھے اور آج بھی مجھ ہی پر پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کا الزام لگایا جاتا ہے اور الزام بھی وہ اصحاب لگا رہے ہیں جن کے اپنے دامن تہی ہیں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں، مشرقی پاکستان کے عوام سخت دشواریوں سے دوچار ہیں، ہم صرف ان کا مداوا چاہتے ہیں۔ آپ خود ہی سوچیے، مشرقی پاکستان کو علیحدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری آبادی ۵۶ فیصد ہے۔ مغربی پاکستان تو علیحدگی کا تصور کر سکتا ہے، ہم نہیں کر سکتے۔“

پھر انھوں نے قدرے غضب آلود لہجے میں کہا: ”وہ حصہ اگر علیحدہ ہونا چاہتا ہے، تو ہو جائے۔“ انھوں نے پھرے جذبات پر قابو پاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی:

”ہم مغربی پاکستان سے ناخوش نہیں، مگر یہ کیا انصاف ہے کہ وہاں منگلا اور تربیلا ڈیم بنیں اور مشرقی پاکستان آبپاشی کی سہولتوں سے محروم رہے۔ آپ جانتے ہیں ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان کا زیر مبادلہ ۰.۷ فیصد کے لگ بھگ تھا۔ اب وہ صرف ۴.۶ فیصد ہے۔ مجھے بتائیے یہ کیوں؟ یہ مشرقی پاکستان کے خلاف سازش نہیں تو اور کیا ہے؟ ہمارے پٹ سن کا کاروبار روز بروز زوال پذیر ہے۔ ہمارے زیر مبادلہ کی فی صد تیزی سے گرتی جا رہی ہے۔

میرے سامنے مجیب کا نام نہ لیجیے

میں نے اُس کے تمام لچھن دیکھ رکھے ہیں

(بزرگ سیاستدان)

کیوں؟ آخر کیوں؟

شیخ صاحب مجھ سے تند و تیز انگریزی میں مخاطب تھے: ”پنجاب نے سرحد اور سندھ کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ بلوچستان زنجیروں سے آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے مضطرب ہے۔ میرے صوبے میں ۴۰۰ سے زیادہ افراد نے ڈاکٹریت کی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں، مگر ان پر اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے بند ہیں۔ پیریٹی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک کمیٹی ۱۷ برس تک کام کرتی رہی، مگر موجودہ حکومت نے ایک ہفتے کے اندر مشرقی پاکستان کے چھ سات افسروں کو مرکزی سرکاری بنا دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خلوص نیت سے کام کیا جائے، تو حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔“

میں بڑے خشوع و خضوع سے شیخ صاحب کی سیاسی تقریر سنتا رہا۔ پھر ذرا ہمت کر کے ایک سوال پوچھ ہی لیا: ”آپ کی جماعت نے ۵۵ء میں پیریٹی کا اصول تسلیم کیا تھا؟“

”جی ہاں۔“

”اور اب آپ اس سے منحرف ہو گئے ہیں۔“

”قریشی صاحب، اس کے لیے ہمیں مورد الزام نہ ٹھہرائیے، ہم ۱۵ برس سے پیریٹی کا مذاق اڑاتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایک قدم پر اس کی خلاف ورزی ہوتی رہی، اس معاہدے کے ہم بھی پابند نہیں رہے۔“

ان کی آنکھیں تیزی سے گردش کر رہی تھیں۔

”میں کہتا ہوں مشرقی پاکستان کے لوگوں کی میں نے بے پناہ خدمت کی ہے۔ کوئی ہے ایسا لیڈر جو عوام کے حقوق کی حفاظت کے لیے ۱۰ برس جیل میں رہا ہو؟ میرے عوام میری قربانیوں کی بڑی قدر کرتے ہیں۔“

اس موقع پر مجھے مجیب الرحمن کے متعلق ایک اور پُر عزم سیاسی لیڈر کا قول یاد آیا:

”سیاست میں مجیب کا مثبت کارنامہ کیا ہے؟ بس یہی ناکہ وہ ۱۰ برس جیل میں رہے، کسی بڑے مقصد کے لیے نہیں، منفی کردار کی وجہ سے۔“

شیخ صاحب کی آواز میرے ذہن کو برساتی ہوئی گزرتی گئی۔

”مغربی پاکستان کے لوگ بھی مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ میں ۶ نکات کا خالق ہوں، اس کے باوجود انھوں نے مذاکرات کے زمانے میں مجھے سینے سے لگایا۔ میری راہوں میں بچھ بچھ گئے، وہ مجھے اپنا سمجھتے اور مجھ پر اعتماد کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں مغربی پاکستان کی بھی نمائندگی کروں گا، میں اپنے الفاظ کا پابند ہوں۔“

”مگر عوام تو آپ کے رویے سے خوش نہیں؟“

”کمرے میں کئی آوازیں آپس میں ٹکرائیں۔“

”یہ سب پروپیگنڈا ہے، عوام ہمارے ساتھ ہیں۔“

شیخ صاحب نے فرمایا:

”اگر عوام ہمارے ساتھ نہ تھے تو کرفیو کی خلاف ورزی کیسے ہوئی؟ گولیاں کس نے کھائیں؟ خون کس کا بہتا رہا؟“

”شیخ صاحب، وہ دور اور تھا اور یہ دور اور ہے۔ ہمیں ان میں فرق کرنا چاہیے۔“

”مہاجرین کے بارے میں آپ کا رویہ کیا ہے؟“

”وہ مجھے بے حد عزیز ہیں۔ میرے سیاسی پیشوا سہروردی بھی مہاجر تھے اور ایک طرح سے میں بھی مہاجر ہوں۔ آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ میں نے اپنے

”مغربی پاکستان کے لوگ بھی مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں

وہ مجھے اپنا سمجھتے ہیں اور مجھ پر اعتماد کرتے ہیں“ (مجیب الرحمن)

”اس مملکت کی تعمیر کا کام بہت بڑا ہے اور تمہیں اس کے انجام دینے کا عظیم الشان موقع حاصل ہے۔ تم کو چاہیے کہ اب تک جس عزم مصمم کا اظہار کیا ہے اسی سے کام لے کر مستقبل کا سامنا کرو اور سب سے ضروری یہ کہ ان شرانگیز پروپیگنڈا کرنے والوں اور غرض پسند شورش پسندوں کا آلہ کار ہرگز نہ بنو جو ہمیں بیوقوف بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور ان مشکلات سے جن کا اس نئی مملکت کو پیش آنا ناگزیر ہے، ناجائز فائدہ اٹھانے کے درپے ہیں۔“ (قائد اعظم محمد جناح)

عہد وزارت میں زیادہ تر لائنس اور کاروباری مراعات مہاجرین کو دی تھیں۔“

”مگر وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں۔“

”انھیں ہنگاموں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ زیادہ تر حالات حکومت نے خراب کیے تھے۔ منعم خاں نے اپنے آخری دنوں میں یہ منصوبہ بنایا کہ مقامی لوگوں اور مہاجرین کو آپس میں لڑا دیا جائے اور اس طرح ان کے زمانہ اقتدار میں اضافہ ہو جائے گا۔ میں خود ڈھاکہ کے نازک مقامات پر گیا اور بڑی مشکل سے حالات پر قابو پایا۔ کھانا میں زیادہ تر ہنگامے صبور خاں کے پالے ہوئے غنڈوں نے برپا کیے۔ ہمیں بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنا چاہیے۔“

”شیخ صاحب، اسلام کا رشتہ ہمیں اخوت کا ہی احساس بخشتا ہے۔“

”قریشی صاحب، مجھے اس مسئلے میں آپ سے اختلاف ہے، اسلام کا رشتہ اب سب سے کمزور رشتہ ہے۔ اگر یہ مضبوط ہوتا، تو عالم عرب میں افتراق نہ ہوتا، اسلام انھیں کیوں متحد نہ رکھ سکا۔ آخر کیوں؟“

”وہ تو عرب قومیت کے پرستار بن گئے ہیں اور قومیت انسان کو تقسیم کر دیتی ہے۔“

”مگر ان کی زبان تو ایک ہے۔“

”زبان کسی واضح عقیدے کے بغیر متحد کرنے والی قوت ثابت نہیں ہوتی۔“

شیخ صاحب، گونج دار آواز میں بولے:

”میں سمجھتا ہوں ایک ہونے کا احساس باہمی اعتماد سے پیدا ہوتا ہے۔ سچی بات یہ ہے، ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد نہیں۔ اعتماد کی فضا منصفانہ نظام ہی سے قائم ہوتی

ہے۔ آپ اسلام کی باتیں کرتے ہیں۔ مغربی پاکستان کا ایک طبقہ مشرقی پاکستان کا حصہ کھاتا رہا ہے، آپ کے خطے سے یہ آواز کیوں نہیں اٹھتی کہ بھائی کا مال کھانا حرام ہے؟“

”شیخ صاحب، اگر ہم سب اسلام کے اصولوں کو سچے دل سے تسلیم کر لیں تو ملک کے کسی حصے میں بھی استحصال (Exploitation) کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ہم قدرت کے فطری نظام سے جس قدر دور ہوتے جائیں گے، ہمارے مسائل میں اعتدال کا فقدان بڑھتا رہے گا۔“

”قریشی صاحب، یہ باتیں وعظ کے لیے اچھی ہیں، مذہب ہمارا بڑا مسئلہ نہیں۔ مشرقی پاکستان کے لوگ سیدھے سادے مسلمان ہیں۔ ہندوؤں کے خلاف ان میں شدید نفرت پائی جاتی ہے۔ ہمارے بڑے بڑے مسائل چار ہیں:

- ۱۔ ملک کا دارالسلطنت مشرقی پاکستان میں ہو۔
 - ۲۔ اس حصے میں فوجی ہیڈ کوارٹر قائم کیے جائیں۔
 - ۳۔ یہاں سرمایہ مضبوط بنیادوں پر تعمیر ہو۔
 - ۴۔ ملک میں پارلیمانی نظام حکومت قائم ہو جائے۔
- جب تک یہ مسائل حل نہیں ہوتے، بے اعتمادی کے مظاہرے ہوتے رہیں گے۔“

شیخ صاحب کی ورکنگ کمیٹی میرا محاصرہ کیے رہی، میں نے پیچھے ہٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے ڈر تھا میرا اعتماد بھی بھک سے اڑ نہ جائے۔ میں نے شیخ صاحب کے مضبوط ہاتھ سے آخری بار مصافحہ کیا۔ ہاتھ میں بے پناہ قوت اور بلا کا اضطراب تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اس وقت مجھے نور جہاں کے ہاتھوں سے کبوتروں کے اڑنے کا واقعہ کیوں یاد آیا تھا؟ ایک لمحے کے لیے میں نے محسوس کیا کہ دوسرا کبوتر بھی اڑ گیا اور کسی کی نگاہیں دور خلا میں گھور رہی ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا حَمْدًا لِلْعَالَمِينَ

اپنی زندگی کو خیر اور خوشی سے بھرے
۱۲ ربیع الاول آیاتو

یاد آئے ۱۲ اسباق

دنیا کے آخری رسولؐ کی زندگی سے اخذ کردہ ۱۲ پر اثر باتوں کا مجرا
آج کے مایوس، ناامید اور بے بسوں کے لیے امید کے روشن دیے

نوید اسلام صدیقی

یہی زندگی ہے تو دوستو

زندگی کو میرا سلام ہے

ماحول ایسا ہو کہ جس میں ہر طرف اداسی اور بے کیفی محیط ہو، کیا ایسے ماحول میں رہنا زندگی ہے؟ جہاں مایوسی، تنہائی، فکر اور پریشانی کے جذبات دماغ میں ہر وقت ہلچل پیدا کرتے رہیں کیا وہاں رہنا زندگی ہے؟ جہاں طبیعت ہر وقت بغاوت پر آمادہ رہتی ہو کیا وہاں رہنا زندگی ہے؟ جہاں انسان بے وفا دوستوں، دنیا دار لوگوں اور غیر مخلص رشتہ داروں کی جفا کشیوں کو ہر وقت یاد کر کے گدھتا رہے کیا وہ زندگی ہے؟ جہاں انسان طرح طرح وسوسوں میں گرفتار ہو اور جینے کی تمنا ختم ہوتی جائے کیا وہ زندگی ہے؟ کیا یہ کوئی زندگی ہے کہ انسان کسی 'پلاننگ' کے بغیر محض حالات کی موجوں پر سنبھے جانے دے۔ کیا زندگی کا مقدر جہالت، بیماری تنگ نظری، زوال پذیری، خوفزدگی، نفرت اور بے چارگی ہی ہے.....؟ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے، ہم سب کے لیے ایک در ہر وقت کھلا ہے، ہر وقت امید کا چراغ روشن ہے، مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام، وہ ہم کو ایک ایسا راستہ دکھا گئے جہاں چراغاں ہی چراغاں ہے۔

۱۲ ربیع الاول آپ ﷺ کا یوم پیدائش ہے۔ اس مبارک دن کے موقع پر آپ کے لیے ہم نے ۱۲ باتیں چنی ہیں جو آپ کی زندگی کو خیر اور خوشی سے ہمکنار کر سکتی ہیں۔ آئیے ان اسباق کی روشنی میں اپنی زندگی کی تلخیاں کم کرنے کی کوشش کا آغاز کریں۔ یاد رکھیں ہر دور میں ہر فرد نے اپنی زندگی کے اندھیروں کو امید اور حوصلے کے چراغوں سے خود ہی روشن کرنا ہوتا ہے۔

☆☆☆

۱۔ مثبت کو منفی بنا کر زندگی کو تلخ آلود ہونے

سے بچایا جاسکتا ہے۔

ہماری اس زندگی میں ہر روز اچھے اور بُرے بے شمار واقعات ہوتے ہیں اور ہم ان واقعات کو سب سے بیان

بھی کرتے ہیں۔ کبھی کوئی واقعہ انوکھا ہو تو ہم اس کی شرح بھی کرتے ہیں یا کسی سے اس کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ بُرے واقعات پیش آنے پر ہم ان واقعات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں اور ہم سے اگر کوئی بُری بات کہہ دے یا ہمارے ساتھ کوئی بُرا واقعہ پیش آجائے تو ہم اس کا ذکر بار بار کر کے اس واقعے کو پہلے اپنے ذہن میں بسا لیتے ہیں اور پھر اپنی زندگی کا بوجھ بنا لیتے ہیں۔

زندگی میں جب بھی کوئی منفی واقعہ پیش آجائے، کوئی آپ سے نامناسب بات کہہ دے یا کوئی شخص کسی قسم کی بدتمیزی کا مظاہرہ کرے تو اس واقعہ کو ایک اچھی تعبیر دے دیں۔

رسول اکرم ﷺ نے ایران کے بادشاہ خسرو پرویز کو ایک خط بھیجا جس میں اسے اسلام کی دعوت دی گئی تھی۔ حضورؐ کا سفیر آپؐ کا گرامی نامہ لے کر ایرانی بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور اسے خط دیا۔ اس نے آپؐ کے مکتوب کو پڑھ کر ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا اور کہا کہ اس سفیر کو مٹھی بھر خاک دے دو، یہ خاک وہ خط بھیجنے والے کو پہنچا دے۔ سفیر واپس مدینہ منورہ آیا اور ایرانی دربار کی روداد سنائی تو تمام صحابہ کرامؓ آزرہ ہو گئے۔ لیکن حضور اکرمؐ نے فرمایا ”مبارک ہو! اس کی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور اس نے اپنی زمین خود تمہیں دے دی ہے۔ اب تم ایران فتح کرو گے اور خسرو پرویز کے ننگن سراقہ پہنے گا۔“ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ خسرو پرویز کی سلطنت ٹوٹ گئی، ایران فتح ہوا۔ خسرو پرویز مارا گیا اور اس کے ننگن حضرت سراقہؓ کو دیئے گئے۔

۲۔ غصہ کا جواب تحمل اور بردباری

مکہ میں ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ مسجد الحرام میں گئے اور خانہ کعبہ کے کلید بردار سے خانہ کعبہ کا تالا کھولنے کے لیے کہا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ آپؐ نے اس پر غصہ کیا نہ احتجاج کیا اور نہ ہی کسی سے شکایت کی بلکہ

آپؐ نے تحمل اور سکون کے ساتھ صرف اتنا فرمایا ”ایک دن آئے گا کہ تم یہ چابیاں مجھے پیش کرو گے اور میں جسے چاہوں گا دے دوں گا۔“ اور پھر فتح مکہ کے موقع پر بالکل ایسا ہی ہوا، اس شخص کو خانہ کعبہ کی چابیاں حضورؐ کی خدمت میں پیش کرنا پڑیں۔

آپؐ ہمیشہ غصہ کو کنٹرول کرنے کی نصیحت کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حدیث پاک میں ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک صحابی کو تین بار لا تغذب (تو غصہ نہ کر) کے الفاظ کہے۔ آپؐ کا فرمان ہے ”پہلو ان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔“ (صحیح بخاری)

۳۔ جھوٹ فرد اور قوم کو تباہ کر دیتا ہے

جھوٹا آدمی کسی دوسرے کے سامنے خود اعتمادی (Confidence) کے ساتھ بات نہیں کر سکتا۔ معاشرہ اُس کے سچ کو بھی جھوٹ سمجھتا ہے۔ ایک جھوٹے آدمی پر تو اُس کے اہل خانہ بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ جھوٹ نے بہت سے گھروں کو اجاڑا ہے۔ آدمی سچا ہو تو اُس کی بات میں وزن ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے نبوت کا اعلان کرتے وقت قریش کو بلا کر فرمایا تھا، میرے ۴۰ سال آپ لوگوں کے سامنے ہیں، آپ بتائیے کیا میں نے آج تک جھوٹ بولا؟ اہل قریش یک زبان ہو کر بولے ”ہم گواہی دیتے ہیں آپ صادق اور امین ہیں۔“ اہل قریش کو آپؐ کی بات سننا پڑی اور اُن میں سے اہل خیر کے دلوں میں آپؐ کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ بلا ضرورت اور محض عادتاً جھوٹ بولتے ہیں اور اکثر حضرات میں یہ عادت اس قدر پختہ ہو جاتی ہے کہ انہیں جھوٹ بولتے ہوئے جھوٹ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

۴۔ مایوس نہیں ہونا

کئی لوگ ہر بات اور واقعہ سے مایوس ہو کر دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، اور زبان حال سے یہی کہتے رہتے ہیں:

ایک مدت ہو گئی دکھ جھیلے
کب فلک ہم پر ستم ڈھاتا نہیں
ہوں کبھی حالات بہتر تو ہمیں
اپنی آنکھوں پر یقین آتا نہیں

ہمیں ہر وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ہر رات کے بعد ایک صبح اور خزاں کے بعد بہار ہے، سو آج اگر اندھیرا ہے تو کل روشنی بھی ہوگی، آج اگر زرد پتے بکھرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں تو کل کھلی ہوئی کلیاں بھی ضرور دکھائی دیں گی۔

ملے جو غم، تو اُس غم کو، غم پیہم نہیں کرتے

کسی کی بے وفائی کا سدا ماتم نہیں کرتے

اندھیرے نا اُمیدی کے، ڈراتے ہیں، ڈرانے دو

چراغ آرزو اپنا، کبھی مدہم نہیں کرتے

علامت رزم گا ہوں میں، یہی ہے سر بلندی کی

کسی حالت میں اپنے سرنگوں پر چم نہیں کرتے

ایک مسلمان ہر وقت پر امید رہتا ہے، مایوسی کا اُس کی زندگی میں کوئی گزر نہیں ہے۔

حضورؐ اپنے صحابہؓ کو وقتاً فوقتاً روشن مستقبل کی نوید

سناتے رہتے تھے تاکہ اُن کے حوصلے جوان رہیں۔ بے

حساب مثالیں ہیں، جنگ خندق والا واقعہ تو آپؐ کو بھی

یاد ہوگا۔ اُس وقت مسلمان سخت دباؤ اور اضطراب میں

تھے، لیکن حضور ﷺ کو اُس وقت بھی اپنے ساتھیوں کو پر

امید رکھنے کا احساس تھا۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ خندق کی کھدائی کے دوران

میں حضرت براءؓ کے ساتھیوں کا ایک سخت چٹان سے سامنا

ہوا۔ حضورؐ کے علم میں یہ بات آئی۔ آپؐ نے ”بسم اللہ“

پڑھ کر کدال سے اُس چٹان پر ایک ضرب لگائی تو ایک

ٹکڑا کٹ گیا اور اس سے ایک روشنی نکلی، آپؐ نے

فرمایا: ”اللہ اکبر! مجھے شام کی کنجیاں دی گئیں اور اس وقت

میں اس کے سرخ محل دیکھ رہا ہوں۔“ اس کے بعد آپؐ

نے دوسری ضرب لگائی اور فتح فارس کی خوش خبری سنائی، پھر تیسری ضرب لگائی اور فتح یمن کی خوش خبری سنائی اور پوری چٹان کٹ گئی۔

۵۔ ہر فیصلہ غور و فکر کے ساتھ

کامیاب لوگ وہ نہیں ہوتے جو ہمیشہ آنکھیں بند کر کے ایک گھسے پٹے راستے پر دائیں بائیں دیکھے بغیر سیدھے چلتے چلے جاتے ہیں۔ راستے میں دیوار تو کیا اگر کھمبا بھی آجائے تو وہ پہلو سے بچ نکلنے کے بجائے اس کے اوپر سے گزر کر ناک کی سیدھ میں چلتے رہتے ہیں۔ تاریخ ایسے لوگوں کے تذکروں سے بھری پڑی ہے جو معمولی تعصبات اور ادنیٰ ترجیحات کے اسیر ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔ کشادہ راستے جن کی قسمت میں نہیں ہوتے اور پگڈنڈیوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔

ہمارے سامنے حضور ﷺ کی زندگی کے کئی واقعات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کوئی قدم اٹھانے سے قبل کتنی سوچ بچار سے کام لیتے تھے۔ آپ ﷺ نے مکہ سے جب مدینہ ہجرت کی ہے تو آپ اٹھ کر ایک دم مدینہ روانہ نہیں ہو گئے، بلکہ دو تین دن ایک غار میں قیام کیا جو مدینہ جانے کے بجائے دوسری سمت پر تھا۔

کوئی بھی اہم فیصلہ کرنے سے قبل آپ اپنے اصحاب سے مشورہ ضرور کرتے تھے، مثال کے طور پر جنگ خندق سے قبل آپ نے صحابہ کرام سے مشاورت کرنے کے بعد ہی مدینہ کے گرد خندق کھودنے کا فیصلہ کیا تھا۔

۶۔ اپنے نفس کو قابو میں رکھنا ہے

زندگی کے گتھن سفر میں آگے بڑھنے، اپنی اصلاح آپ کرنے اور ترقی حاصل کرنے کے راستے کبھی مسدود نہیں ہوتے، اُن کے لیے ہر وقت گنجائش باقی رہتی ہے۔ اصلاح اور ترقی کا انسان کی عمر اور صحت سے کوئی تعلق نہیں۔ نفس پر قابو پا کر کامیابی کا در کھولا جاسکتا ہے۔ کسی بزرگ نے کیا خوب کہا کہ کامیابی صرف دو قدم کے

فاصلے پر ہے۔ جب آپ کا پہلا قدم 'نفس' کے اوپر ہوگا تو دوسرا قدم یقینی طور پر 'کامیابی' کے اوپر ہوگا۔

اپنے وجود ہی سے لڑائی رہی سدا اپنا یہ ہاتھ اپنے گریباں تئیں رہا نفس پر قابو پانے کے لیے پیہم جانفشانی اور کوشش کی سنجیدہ ضرورت ہے۔ ایسی کوشش کہ ضبط نفس لاشعوری عادت بن جائے۔ کامیابی کا اس کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔

حضور ﷺ صبح نماز فجر کے بعد ایک دعا پڑھتے تھے۔ اُس میں نفس کے بارے میں یہ الفاظ آئے ہیں

”اللهم..... واجعل فی نفسی نوراً

(خدا یا! میرے نفس میں نور پیدا فرما دے)

۷۔ آزمائشیں اور امتحانات، زندگی کا حصہ ہیں

خدا انسان کو مصائب و آلام کے سمندر میں اس لیے نہیں ڈالتا کہ اسے غرق کر دے بلکہ اس لیے کہ وہ مزید نکھر سکے دل گیر نہیں ہونا چاہیے، اللہ جو کچھ کرتا ہے اس میں اس کے بندے کی بھلائی ہی پوشیدہ ہوتی ہے، پریشانی، تکلیف اور آرام، سب میں اس کی عنایت اور کرم ہی کارفرما ہوتا ہے۔ مگر نادان بندہ اسے نہیں سمجھتا۔ کبھی پریشانی کی وجہ سے پریشان نہیں ہونا چاہیے، خالق کو دل کی گہرائیوں سے یاد کرنا چاہیے۔ جذبہ یہ ہونا چاہیے:

پہنچ ہی جائیں گے منزل پہ اک دن تیرے شیدائی

انہیں راہوں کے پیچ و خم سے گھبراننا نہیں آتا حضور سے زیادہ پریشانیوں اور مصائب کا سامنا کرنے پڑا، مکن زندگی ہو یا مدنی زندگی، نت نئے مسائل نے آپ ﷺ کو گھیرے رکھا لیکن آپ نے ہمت اور جوانمردی سے اُن کا مقابلہ کیا۔

۸۔ شکر، ہر دم شکر

آئیں، ہم ان نعمتوں کو یاد کریں جو خدا نے بن مانگے

ہمیں دے رکھی ہیں۔ عہد کریں، آج سے ہم ان چیزوں کا گلہ شکوہ نہ کریں گے جو ہم حاصل نہیں کر پائے۔ ہم اپنے رب کی نعمتوں کو گننے لگیں تو گن نہ پائیں۔ ہمیں سب سے پہلے شکر گزار ہونا چاہیے کہ اُس نے ہمیں ایک خوب صورت اور صحت مند جسم عطا کیا۔ یہ بازو، یہ ہاتھ، یہ ٹانگیں، یہ پاؤں، یہ منہ، یہ آنکھیں، یہ دماغ اللہ کی کتنی بڑی عنایات ہیں۔ ان میں سے کسی شے کی محرومی انسان کے لیے کتنے مسائل پیدا کر دیتی ہے۔

پھر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک حسین و جمیل ملک عطا کیا، جس میں قدرتی خزانے با افراط ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہم صحیح طریقے سے ان نعمتوں کا فائدہ نہیں اٹھا رہے۔

آدمی غور کرے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو بے حساب نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ ضروری نہیں کہ روپے پیسے کی فراوانی، ایک اچھی رہائش اور زندگی کا ٹھانڈا ہاتھ ہی نعمتوں میں شمار ہوں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں جن کی طرف کبھی ہمارا دھیان ہی نہیں جاتا، بلکہ ہم انہیں اپنا حق سمجھتے ہیں لیکن جن کی غیر موجودگی یا محرومی پر احساس ہوتا ہے کہ ان کی کیا اہمیت تھی۔

زندگی کی چھوٹی بڑی چیزوں کے لیے احساس تشکر دراصل ایک ذہنی رویہ ہے جو ہماری زندگیوں کو زندہ رہنے کے قابل بناتا ہے۔ وہ لوگ جو زندگی سے بیزار اور اپنے حالات سے نالاں رہتے ہیں، انہیں چاہیے کہ اپنی زندگی کا موازنہ اپنے سے کم خوش نصیب لوگوں سے کر کے دیکھیں۔ چھوٹی سے چھوٹی معمول کی باتوں کے لیے اپنے پیدا کرنے والے کا شکر ادا کریں۔ کہتے ہیں اللہ کو اپنے شکر گزار بندے پسند ہیں۔ وہ ان کے لیے اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیتا ہے لیکن اس شکر گزاری کا پہلا اور بنیادی فائدہ آپ کو فوراً حاصل ہو جاتا ہے کہ آپ کے دل میں ایک نرم اور خوش گوار سا احساس جنم لیتا ہے۔ آپ خود کو پہلے سے بہتر محسوس کرتے ہیں۔

حضور سے دریافت کیا گیا کہ جب آپ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں پھر آپ اتنی زیادہ عبادت کیوں کرتے

ہیں؟ آپ نے جواب دیا، کیا میں اُس کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟

۹۔ دعا رحمت کے دروازے کھول دیتی ہے

ہمارے مقاصد و مطالب بلکہ ساری مخلوق کے مقاصد و مطالب کی کنجیاں اس کے پاس ہیں اور وہ سب سے بڑا جواد، سب سے بڑا کریم و رحیم اور سب سے بڑا بخشنے والا ہے۔ سوال کرنے سے پہلے بندوں کی امیدوں سے زیادہ ان کو دیتا ہے، بندوں کے قلیل سے قلیل عمل سے وہ خوش ہوتا ہے اور اسے بڑھا دیتا ہے، بندوں کی خطاؤں، لغزشوں کو معاف کرتا ہے اور محو کر دیتا ہے، آسمانوں اور زمینوں کی ساری مخلوق اس کے سامنے احتیاجات پیش کرتی ہیں، اس کی شان ہی کچھ عجیب و غریب ہے، وہ سب کی سنتا ہے، سب کو دیتا ہے، کسی کو بھول نہیں جاتا، سائلین کی کثرت نہ اسے پریشان کرتی ہے، نہ اسے اس سے کوئی مغالطہ ہوتا ہے۔

دعا کرنے والے انسان کا رشتہ بلا واسطہ خالق کائنات سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ احساس کہ میں اتنی بڑی ہستی سے جب چاہوں بات کر سکتا ہوں انسان کے اندر خود اعتمادی اور حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: بندے کی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے بشرطیکہ کسی گناہ یا قطع تعلق کی دعا نہ کرے اور جلد بازی سے کام نہ لے۔

لوگوں نے پوچھا، ”اے اللہ کے رسول! جلد بازی کا کیا مطلب ہے؟“ آپ نے فرمایا ”دعا کرنے والا یوں سوچنے لگتا ہے کہ میں نے بہت دعا کی لیکن قبول نہیں ہوئی۔ پس وہ تھک جاتا ہے اور دعا کرنی چھوڑ دیتا ہے۔“

۱۰۔ رزق حرام سے بچیں

جس آدمی کے پیٹ میں رزق حرام داخل ہو جائے اُس کا ذہنی سکون تباہ ہو جاتا ہے، وہ حقیقی خوشی سے محروم رہتا ہے۔ جس گھر میں داخل ہو جائے اُس گھر سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ رزق حرام سے اپنے آپ کو بچائیں۔ انسان کے نصیب میں جو رزق ہے وہ اُس کے پیدا ہونے

سے قبل اس کے لیے اللہ تعالیٰ مقرر کر دیتا ہے۔ اللہ کے فیصلے پر صابر و شاکر ہو کر زندگی گزاریں۔

اللہ کے حبیب ﷺ نے اپنی امت کو رزق حرام سے بچنے کی نہایت سختی سے تاکید کی ہے اور واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ رزق حرام میں تمہارے لیے قطعی کوئی خیر و برکت نہیں۔ آخرت میں تو رزق حرام سے مستفید ہونے والے کا ٹھکانا دہکتی ہوئی آگ یعنی جہنم ہے۔ آپؐ نے فرمایا: وہ جسم جس کی پرورش حرام مال سے ہوئی ہو، جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔

اسلام میں رزق حلال کی بڑی اہمیت ہے۔ رسول کریمؐ نے رزق حلال کو نماز اور روزے کی طرح فرض قرار دیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ان فرائض کے بعد جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیے ہیں، پاک اور حلال طریقے سے رزق کمانا بھی فرض ہے۔ (بیہقی) اسلام میں حلال محنت کا کوئی کام یا پیشہ گھٹیا یا کمتر درجہ کا نہیں ہے۔ اسلام میں گھٹیا، معیوب اور ذلیل کام صرف رزق حرام کو حاصل کرنا ہے۔

۱۱۔ گھریلو زندگی کو خوشی اور مسرت کا ذریعہ بنائیں
ذہنی اور جسمانی طور پر ہم نے خود کو الجھا رکھا ہے۔ وہ خوشی اور مسرت جو انسان کو اپنی فیملی کے ساتھ گزار کر حاصل ہوتی ہے، وہ ہم نے خود ہی بج دی ہے۔ خاص طور پر والدین، بیوی بچوں اور بہن بھائیوں کے ساتھ ہم برائے نام وقت ہی گزارتے ہیں، ان کے ساتھ گپ شپ کا موقع بھی ہمیں کم ہی ملتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑی بد نصیبی ہے۔ والدین کی خوشنودی حاصل کرنا، ان کی دعائیں لینا انسان کے لیے بہت بڑا سہارا ہوتا ہے۔ اسی طرح چھوٹے بچوں کی پیار اور خلوص سے بھری ادائیں انسان کے تمام غموں اور پریشانیوں کے لیے ٹانگ کا کام دیتی ہیں۔

حضرت ابو امامہؓ کے حوالہ سے یہ حدیث بیان ہوئی ہے کہ ایک آدمی نے حضورؐ سے دریافت کیا کہ ”والدین کا حق ان کی اولاد پر کیا ہے؟“ آپؐ نے فرمایا: ”وہ تمہاری جنت

اور جہنم ہیں۔“ اولاد کے بارے فرمایا ”تم لوگ اپنی اولاد کے ساتھ رحم و کرم کا برتاؤ کرو اور ان کو اچھی تعلیم و تربیت دو۔“

۱۲۔ نفسیاتی اور ذہنی امراض سے نجات

دور جدید میں نفسیاتی اور ذہنی امراض میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، اس کی بنیادی وجہ اسلامی تعلیمات سے انحراف ہے۔ حسد کی آگ میں لوگ جل رہے ہیں، دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی نعمتوں پر بلا وجہ گڑھ رہے ہیں اور ہر وقت پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ یوں ان کو ایک خاص ٹینشن رہتی ہے۔ ہر وقت کسی کے عیب کی ٹوہ لگانا ذہنی تناؤ کا سبب ہے، باہم بغض و کینہ رکھنا اور بدگمانی کی عادت بھی انسان کو ہر وقت کسی کے خلاف سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر لوگ باہم قطع تعلق کر لیتے ہیں اور پھر کڑھ کڑھ کر اپنی صحت کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔

اس طرح کے تمام رذائل انسان کے لیے ذہنی اور نفسیاتی امراض کا باعث بنتے ہیں۔ ان امراض کا مکمل حل ادویات میں نہیں بلکہ ان کا علاج اسلامی تعلیمات اور اخلاق حسنہ کو اپنانے میں ہے۔ کتاب و سنت نے ان رذائل کو ترک کرنے کا حکم دیا ہے جو نفسیاتی امراض کا سبب بنتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے حضور ﷺ نے فرمایا ”تم بدگمانی سے بچو، بے شک یہ زیادہ جھوٹی بات ہے، کسی کے عیبوں کی ٹوہ میں نہ لگو، اور نہ کسی کی جاسوسی کرو، باہم فخر نہ کرو، نہ تم حسد کرو، نہ باہم بغض رکھو اور نہ باہم قطع تعلق کرو“ (صحیح بخاری)۔ حضورؐ نے فرمایا ”جس کے دل میں ذرہ بھر تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا“ (صحیح مسلم) اسی طرح فرمایا ”آدمی کی بُرائی کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر جانے“ (صحیح مسلم)۔ حضورؐ طمع اور لالچ سے بچنے کی دعا کرتے ”اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے، ایسے دل سے جو خشیت الہی سے خالی ہو، اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہو۔“ (صحیح مسلم)

آنحضورؐ وعظ و نصائح کی محفلیں ناغہ دے کے منعقد فرماتے

صلی اللہ علیہ وسلم

مجالس نبوی

سید سلمان ندوی (انتخاب: غلام رسول اعوان)

دنیا کی سب سے محبوب شخصیت کی محفلوں کا احوال جہاں شکایت کرنے کی اجازت تھی نہ ترغیب وہاں بے باکی سے سوال بھی ہوتے تھے اور حفظ مراتب کے اہتمام سے محبت و عقیدت بھرے سوال بھی

دربارِ نبوتؐ

شہنشاہِ کونین کا دربارِ نقیب و چاؤش اور خیل و خشم کا دربار نہ تھا۔ دروازہ پر دربان بھی نہیں ہوتے تھے۔ تاہم نبوت کے جلال سے ہر شخص ہیکر تصویر نظر آتا تھا۔ حدیثوں میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی مجلس میں لوگ بیٹھتے تو یہ معلوم ہوتا کہ ان کے سروں پر چڑیاں بیٹھی ہوئی ہیں یعنی کوئی شخص ذرا بھی جنبش نہیں کرتا تھا۔ گفتگو کی اجازت میں ترتیب کا لحاظ رہتا تھا۔ لیکن یہ امتیاز مراتب، نسب و نام یا دولت و مال کی بنا پر نہیں بلکہ فضل و استحقاق کی بنا پر ہوتا تھا۔ سب سے پہلے اہل حاجت کی طرف متوجہ ہوتے اور ان کے معروضات سن کر ان کی حاجت برآری فرماتے۔

تمام حاضرین ادب سے سر جھکائے رہتے، خود بھی آپؐ مؤدب ہو کر بیٹھتے۔ جب کچھ فرماتے تو تمام مجلس پر سناٹا چھا جاتا۔ کوئی شخص بولتا تو جب تک چپ نہ ہو جائے، دوسرا شخص بول نہیں سکتا تھا۔ اہل حاجت عرض مدعا میں ادب کی حد سے بڑھ جاتے تو آپؐ کمالِ حلم کے ساتھ برداشت فرماتے۔

آپؐ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے جو بات ناپسند ہوتی، اس سے تغافل فرماتے اور ٹال جاتے۔ کوئی شخص شکریہ ادا کرتا تو اگر آپؐ نے واقعی اس کا کوئی کام انجام دیا ہے تو شکریہ قبول فرماتے۔ مجلس میں جس قسم کا ذکر چھو جاتا آپؐ بھی اس میں شامل ہو جاتے۔ نہی اور مہذب ظرافت میں بھی شریک ہوتے۔ کبھی کسی قبیلہ کا کوئی معزز شخص آجاتا تو حسب مرتبہ اس کی تعظیم فرماتے اور فرماتے **اکرامو کریم کل قوم**۔ مزاجِ بڑی کے ساتھ ہر شخص سے دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت اور حاجت تو نہیں ہے۔ یہ بھی فرماتے کہ جو لوگ اپنے مطالب مجھ تک

نہیں پہنچا سکتے مجھ کو ان کے حالات اور ضروریات کی خبر دو۔ ایران میں معمول تھا کہ جب مجلس میں کوئی معزز شخص آجاتا تو سب تعظیم کو کھڑے ہو جاتے۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ رؤسا اور امراء جب دربار جہاتے تو لوگ سینوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے رہتے۔ آپؐ نے ان باتوں سے منع فرمایا اور ارشاد کیا کہ ”جس کو یہ پسند آتا ہے کہ لوگ اس کے سامنے تعظیم سے کھڑے رہیں، اس کو اپنی جگہ دوزخ میں ڈھونڈنی چاہیے۔“ البتہ جوشِ محبت میں کسی کسی کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ چنانچہ حضرت فاطمہ زہراؓ جب کبھی آجاتیں تو اکثر کھڑے ہو جاتے اور فرطِ محبت سے ان کی پیشانی چومتے۔ (حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے لیے بھی آپؐ نے اٹھ کر چادر بچھا دی تھی۔ اسی طرح ایک دفعہ آپؐ کے رضاعی بھائی آئے تو ان کے لیے بھی محبت سے کھڑے ہو گئے اور ان کو اپنے سامنے بٹھایا۔)

آدابِ مجلس

ان مجالس میں آنے والوں کے لیے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ عموماً بدو اپنے اسی وحشت نما طریقہ سے آتے اور بے باکانہ سوال و جواب کرتے۔

خلقِ نبویؐ کا منظر ان مجالس میں زیادہ حیرت انگیز بن جاتا ہے۔ آپؐ پیغمبرِ خاتم کی حیثیت سے رونق افروز ہیں۔ صحابہؓ عقیدت کیش غلاموں کی طرح خدمتِ اقدس میں حاضر ہیں۔ ایک شخص آتا ہے اور اس کو آنحضرت ﷺ اور حاشیہ نشینوں میں کوئی ظاہری امتیاز نظر نہیں آتا۔ لوگوں سے پوچھتا ہے ”محمدؐ کون ہے؟“ صحابہؓ بتاتے ہیں کہ یہی گورے سے آدمی جو ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ وہ کہتا ہے اے ابنِ عبدالمطلب! میں تم سے نہایت سختی سے سوال کروں گا، خفا نہ ہونا۔ آپؐ بخوشی سوال کی اجازت دیتے ہیں۔

آپؐ کسی کی بات کاٹ کر گفتگو نہ فرماتے جو بات

ناپسند ہوتی، اس سے تغافل فرماتے اور ٹال جاتے

بائیں ہمہ سادگی و تواضع، یہ مجالس رعب، وقار اور آدابِ نبوتؐ کے اثر سے لبریز ہوتی تھیں۔ آنحضرتؐ کی تعلیمات و تلقینات کا دائرہ، اخلاق، مذہب اور تزکیہٴ نفوس تک محدود تھا۔ اس کے علاوہ اور باتیں منصبِ نبوتؐ سے خارج تھیں۔ لیکن بعض لوگ نہایت معمولی اور خفیف باتیں پوچھتے تھے۔ مثلاً یا رسول اللہؐ میرے باپ کا کیا نام ہے؟ میرا اونٹ کھو گیا ہے، وہ کہاں ہے؟ آپؐ اس قسم کے سوالات کو ناپسند فرماتے تھے۔

ایک بار اسی قسم کے لغو سوالات کیے گئے تو آپؐ نے برہم ہو کر فرمایا کہ ”جو پوچھنا ہے پوچھو، میں سب کا جواب دوں گا۔“ حضرت عمرؓ آپؐ نے چہرے کا رنگ دیکھا تو نہایت الحاح کے ساتھ کہا رضیت (میں خوش ہوں)۔

کوئی شخص کھڑے کھڑے سوال نہیں کرتا تھا۔ ایک شخص نے اس طرح سوال کیا تو آپؐ نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ اسی طرح یہ بھی معمول تھا کہ جب ایک مسئلہ طے ہو جاتا تو دوسرا مسئلہ پیش کیا جاتا۔ بعض اوقات آپؐ گفتگو کر رہے ہوتے، کوئی صحرا نشین بدو جو آدابِ مجلس سے ناواقف ہوتا، دفعتاً آجاتا اور عین سلسلہٴ تقریر میں کوئی بات پوچھ بیٹھتا۔ آپؐ سلسلہٴ تقریر قائم رکھتے اور فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوتے اور جواب دیتے۔“

اوقاتِ مجلس

اس قسم کی مجالس کے لیے جو خاص وقت مقرر تھا وہ صبح کا تھا۔ نمازِ فجر کے بعد آپؐ بیٹھ جاتے اور فیوضِ روحانی کا سرچشمہ جاری ہو جاتا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نماز کے بعد آپؐ ٹھہر جاتے اور مجلس قائم ہو جاتی۔ چنانچہ کعب بن مالکؓ پر جب غزوہ تبوک کی غیر حاضری کی وجہ سے عتاب نازل ہوا تو وہ ان ہی مجالس میں آکر آنحضرت ﷺ کی خوشنودی مزاج کا پتا لگاتے۔

چونکہ افادہ عام ہوتا تھا اس لیے آپؐ چاہتے تھے کہ کوئی شخص فیض سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس بنا پر جو لوگ ان مجالس میں آکر واپس چلے جاتے تو ان پر آپؐ نہایت

ناراض ہوتے تھے۔ آپؐ ایک مرتبہ صحابہؓ کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تین شخص آئے۔ ایک صاحب نے حلقہ میں تھوڑی سی جگہ خالی پائی، وہیں بیٹھ گئے۔ دوسرے صاحب کو درمیان میں موقع نہ ملا، اس لیے سب کے پیچھے بیٹھے۔ لیکن تیسرے صاحب واپس چلے گئے۔ آنحضرتؐ جب فارغ ہوئے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک نے خدا کی طرف پناہ لی، خدا نے بھی اس کو پناہ دی۔ ایک نے حیا کی، خدا بھی اس سے شرمایا۔ ایک نے خدا سے منہ پھیرا، خدا نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔ پند و نصائح کتنے ہی مؤثر طریقے سے بیان کیے جائیں لیکن ہمیشہ سنتے سنتے آدمی اکتا جاتا ہے اور نصائح بے اثر ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ وعظ و نصائح کی مجالس ناغہ دے کر منعقد فرماتے تھے۔

عورتوں کے لیے مخصوص مجالس

ان مجالس کا فیض زیادہ تر مردوں تک محدود تھا اور عورتوں کو موقع کم ملتا تھا۔ اس بنا پر عورتوں نے درخواست کی کہ ہمارے لیے خاص دن مقرر فرمایا جائے۔ آنحضرتؐ نے یہ درخواست منظور کی اور ان کے وعظ و ارشاد کے لیے ایک خاص دن مقرر ہو گیا۔

اگرچہ مسائل شرعیہ کے متعلق ہر قسم کے سوالات کی اجازت تھی اور خاتونانِ حرم وہ مسائل دریافت کرتی تھیں جو خاص پردہ نشینوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم جب کوئی پردہ کا واقعہ مجلس عام میں سوال کی غرض سے پیش کیا جاتا تو فرطِ حیا سے آپؐ گونا گوار ہوتا۔

طریقہٴ ارشاد

کبھی کبھی آپؐ خود امتحان کے طور پر حاضرین سے کوئی سوال کرتے۔ اس سے لوگوں کی جودتِ فکر اور اصابتِ رائے کا اندازہ ہوتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ آپؐ نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے جس کے پتے جھڑتے ہیں اور جو مسلمانوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ لوگوں کا خیال جنگلی درختوں کی طرف گیا، میرے ذہن میں آیا کہ کھجور کا



ابو ایوب انصاریؓ مدینہ میں

آنحضور کے پہلے میزبان

خالد محمد خالد ترجمہ و تہذیب: ارشاد الرحمن

ایک پاک دل، پاک باز اور جاں نثار سپاہی کا تذکرہ
وہ عمر بھر اپنی قسم نبھاتے رہے

خوشی سے جوش مار رہے تھے۔ آپؐ اپنی اونٹنی پر سوار تھے۔ ہر کوئی اونٹنی کی مہار تھا منے کے لیے ہجوم کیے ہوئے تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی مہمان نوازی میں کروں گا۔

سواری بنی سالم بن عوف کے گھروں کے قریب سے گزری تو انھوں نے یہ کہتے ہوئے اونٹنی کی راہ روک لی کہ: یا رسول اللہ ﷺ ہمارے پاس قیام فرمائیے۔ ہم نفری والے بھی

کے کامیاب سفر کا اختتام کرتے ہوئے آنحضرتؐ مدینہ میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ دارالہجرت میں مستقبل کے مبارک ایام کا آغاز کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اس جم غفیر کی صفوں کے درمیان سے گزر رہے تھے جس کے دل جرات، محبت اور

ہجرت

خدا نے کہا کیا تمہاری خواہش پوری نہیں ہوئی ہے؟ اس نے کہا ہاں لیکن میں چاہتا ہوں کہ فوراً بوؤں اور ساتھ ہی تیار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے بیج ڈالے، فوراً دانہ اُگا، بڑھا اور کانٹے کے قابل ہو گیا۔ ایک بدو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا یہ سعادت صرف قریشی یا انصاری کو نصیب ہوگی جو زراعت پیشہ ہیں لیکن ہم لوگ تو کاشتکار نہیں۔ آپؐ ہنس پڑے۔

فیضِ صحبت

ایک دفعہ حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کی کہ ہم جب خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوتے ہیں تو دنیا بچ معلوم ہوتی ہے لیکن جب گھر میں بال بچوں میں بیٹھتے ہیں تو حالت بدل جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ایک سا حال رہتا تو فرشتے تمہاری زیارت کو آتے۔ ایک دفعہ حضرت حنظلہؓ خدمتِ اقدسؐ میں آئے اور کہا یا رسول اللہ! میں منافق ہو گیا ہوں۔ میں جب خدمتِ اقدسؐ میں حاضر ہوتا ہوں اور آپؐ دوزخ و جنت کا ذکر فرماتے ہیں تو یہ چیزیں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ لیکن بال بچوں میں آکر سب بھول جاتا ہوں۔ ارشاد ہوا کہ اگر باہر نکل کر بھی وہی حالت رہتی تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے۔ ■

درخت ہوگا لیکن میں کم سن تھا اس لیے جرات نہ کر سکا۔ بالآخر لوگوں نے عرض کی کہ حضورؐ آپ بتائیں۔ ارشاد فرمایا ”کھجور“۔ عبداللہ بن عمرؓ کو تمام عمر حسرت رہی کہ کاش میں نے جرات کر کے اپنا خیال ظاہر کر دیا ہوتا۔

ایک روز آپؐ مسجد میں تشریف لائے۔ صحابہؓ کے دو حلقے قائم تھے۔ ایک قرآن خوانی اور ذکر و دعا میں مشغول تھا اور دوسرے حلقے میں علمی باتیں ہو رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا ”دونوں عمل خیر کر رہے ہیں لیکن خدا نے مجھ کو صرف معلم بنا کر مبعوث کیا ہے۔“ یہ کہہ کر علمی حلقے میں بیٹھ گئے۔

مجالس میں شگفتہ مزاجی

باوجود اس کے کہ ان مجالس میں صرف ہدایت، ارشاد، اخلاق اور تزکیہ نفوس کی باتیں ہوتی تھیں اور صحابہؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس طرح بیٹھتے تھے۔ کان الطیر فوق رؤسہم (جیسے چڑیاں ان کے سروں پر بیٹھی ہوں) تاہم یہ مجلسیں شگفتہ مزاجی کے اثر سے خالی نہ تھیں۔ ایک دن آپؐ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا کہ جنت میں خدا سے ایک شخص نے کھیتی کرنے کی خواہش کی۔

سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء)

سید سلیمان ندوی کی نشر شستہ، رواں اور سادہ ہوتی ہے۔ صحبتِ بیاں اور فصاحت، زبان کے ساتھ ساتھ اس میں علمی متانت اور اعلیٰ وارفع خیالات و تصورات کو ادا کرنے کی استطاعت بھی ہے۔ سلیمان ندوی اپنے عہد کے ایک بڑے عالم تھے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ ”سیرۃ النبیؐ“ کی تکمیل ہے جس میں انھوں نے تحقیق و تفحص کا حق ادا کر دیا ہے۔ زیر نظر اقتباس سیرۃ النبیؐ کی جلد دوم سے لیا گیا ہے۔ ضلع پٹنہ کے ایک گاؤں ”دسنہ“ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پھلواری شریف، درجنگہ میں حاصل کی۔ ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ”ندوہ“ میں داخلہ لیا جہاں انھیں مولانا شبلی نعمانی کی شاگردی اور تربیت میسر آئی۔ ۱۹۰۷ء میں ندوہ سے فارغ التحصیل ہوئے اور ”الندوہ“ کے مدیر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں ندوہ کے اساتذہ میں شامل ہو گئے اور علم کلام اور عربی پڑھانے کا آغاز کیا پھر تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۹۱۸ء میں اپنے استاد مولانا شبلی نعمانی کی آخری عظیم تصنیف سیرۃ النبیؐ کی جلد اول اور دوم کی تدوین کرنے کے بعد اس کو شائع کیا اور یہ سلسلہ تمام عمر جاری رہا۔ ۱۹۳۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری دی۔ ۱۹۳۳ء میں مولانا شبلی کی سوانح عمری ”حیاتِ شبلی“ شائع کی۔ ۱۹۵۰ء میں بھارت کے خصوصی حالات کے پیش نظر آپ پاکستان آ گئے۔ سیرۃ النبیؐ کی تدوین کی تکمیل اور ”حیاتِ شبلی“ کی تالیف کے علاوہ بھی مولانا کی کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ ان کی اہم تصانیف میں عربی الفاظ کی جدید لغت (۱۹۸۱ء)، درس الادب، (۱۹۱۲ء) تاریخ ارض القرآن، حیات مالک (۱۹۱۷ء)، ”رسالہ اہل سنت“ (۱۹۱۷ء)، سیرۃ عائشہؓ (۱۹۲۰ء)، ”خلافت عثمانیہ“ (۱۹۲۱ء) اور اسلام، خلافت اور ہندوستان (۱۹۲۱ء)، خطباتِ مدارس (۱۹۲۵ء)، رسول وحدت (۱۹۳۲ء)، عمر خیام (۱۹۳۳ء)، نقوش سلیمانی (۱۹۳۹ء)، ”رحمتِ دو عالم“ (۱۹۴۰ء)، سیر افغانستان (۱۹۴۵ء) اہمیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے کلام کا مجموعہ ”ارمغانِ سلیمان“ بھی شائع ہو چکا ہے۔



ہیں اور ساز و سامان کے مالک بھی اور دفاع بھی کر سکتے ہیں۔
بنی سالم بن عوف کے لوگ اونٹنی کی مہار تھا ہے
ہوئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے انھیں جواب دیا: **خلو سبیلھا، فانھا مامورۃ** ”اس کی راہ چھوڑ دو، یہ حکم کی پابند ہے۔“

اونٹنی بنی سالم بن عوف کے گھروں سے گزر کر بنی بیاضہ کے گھروں پھر بنی ساعدہ کے محلے پھر بنی حارث بن خزرج کے محلے پھر بنی عدی بن نجار کے محلوں اور ان تمام گھروں کے پاس سے گزر رہی تھی جو اس کی راہ میں آرہے تھے۔ ہر قبیلہ اونٹنی کا راستہ روک رہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے گھروں میں نزول فرما کر انھیں سعادت بخشیں لیکن رسول اللہ ﷺ کے ہونٹوں پر تبسم تھا اور آپ فرما رہے تھے:

خلو سبیلھا، فانھا مامورۃ ”اس کی راہ چھوڑ دو، یہ حکم کی پابند ہے۔“

نبی اکرم ﷺ نے اپنے نزول کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ رکھا تھا کیونکہ عنقریب اس جائے نزول کو بہت بڑا اعزاز و اکرام ملنے والا تھا۔ اس جگہ وہ مسجد تعمیر ہونا تھی جس سے توحید کی صدائیں اور نور کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر چہار دانگ عالم میں پھیلنے والی تھیں۔ اس مسجد کے پہلو میں مٹی اور گارے کے وہ حجرے بھی تعمیر ہونا تھے جن کے اندر ”گزارے“ یا شاید ”گزارے“ سے بھی کم یعنی دنیاوی زندگی کا ”ناگزیر“ سامان بھی موجود نہ ہو۔

دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی ان کٹیاؤں میں انسانیت کے اس معلم اور رسول ﷺ نے قیام پذیر ہونا تھا جو اس لیے مبعوث ہوئے تھے کہ زندگی کے جامد ہو چکے جسد میں روح پھولیں اور شرف و عزت کا حق دار اُن لوگوں کو قرار دیں جو یہ کہیں کہ ”اللہ ہمارا رب ہے“ اور پھر اس بر ثابت قدم ہو جائیں، یعنی ”وہ لوگ جو اپنے ایمانوں کو ظلم کے ساتھ نہیں ملا تے۔“ ہاں وہ جنھوں نے دین کو اللہ کے لیے خالص کر لیا تھا۔ جی ہاں وہ خیر خواہ انسانیت کو زمین میں اصلاح کرنا چاہتے تھے، فساد برپا نہیں کرنا چاہتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے اونٹنی کے ٹھہرنے کا معاملہ مکمل طور

پر اس ذاتِ قدر کے حوالے کر رکھا تھا جو آپ کی رہنمائی کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اونٹنی کی ٹکیل چھوڑ دی تھی۔ آپ اس کی ٹکیل کھینچ کر اس کا رخ کسی طرف موڑتے تھے نہ اس کے قدم روکتے۔ آپ کا قلب اطہر اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ تھا۔ آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری تھے:

اللھم خزلنی واخترلی ”اے اللہ! میرے لیے انتخاب فرما اور بہترین انتخاب فرما۔“
بالآخر اونٹنی مالک بن نجار کے گھر کے سامنے آکر بیٹھ گئی پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور مکان کے گرد چکر لگایا۔ پھر اسی جگہ واپس آگئی جہاں بیٹھی تھی اور پہلو زمین پر لگا دیا۔ پھر وہیں سکون سے بیٹھی رہی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ خوش و خرم اس سے نیچے اتر آئے۔

اس موقع پر ایک مسلمان آگے بڑھتا ہے، اس کا چہرہ خوشی و سعادت سے چمک رہا ہے۔ وہ آگے بڑھتا ہے اور اونٹنی کا کجاوہ اٹھا کر اپنے گھر کے اندر لے جا کر رکھ دیتا ہے۔ پھر رسول رحمت ﷺ سے درخواست کرتا ہے کہ آپ اس گھر میں قدم رنجہ فرمائیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنا سعادت و برکت سے معمور دامن لے کر آدمی کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔

حضرات! کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ خوش نصیب مسلمان کون تھا جس کے گھر کے سامنے اونٹنی بیٹھی تھی اور رسول اللہ ﷺ اس آدمی کے مہمان بنے تھے اور تمام کے تمام اہل مدینہ اس آدمی کی بلند بختی و سعادت مندی کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہے تھے؟
سنیے! یہ مسلمان، ہماری آج کی گفتگو کا عنوان ”ابوایوب انصاری“ یعنی مالک بن نجار کے پوتے ”حضرت خالد بن زید“ ہیں۔

☆☆☆☆

قارئین کرام! رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت ابوایوب انصاری کی یہ پہلی ملاقات نہیں تھی بلکہ اس سے قبل بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر جب اہل مدینہ کا ایک وفد مکہ میں رسول اللہ ﷺ سے بیعت کرنے کی غرض سے آیا تھا تو

حضرت ابوایوب انصاری ان ستر مومنوں میں سے ایک تھے جنھوں نے دستِ رسول ﷺ میں ہاتھ دے کر آپ کی مدد و نصرت کی پختہ قسمیں کھائی تھیں۔
اور اب جبکہ رسول اللہ ﷺ اپنے نزول و قیام سے مدینہ منورہ کو اعزاز بخش رہے تھے اور اسے اللہ کے دین کا مرکز بنا رہے تھے، مقدر نے جناب ابوایوب انصاری کے مکان اور گھر کو شرف بخشا کہ وہ سب سے پہلا گھر قرار پائے جہاں دنیا کے عظیم مہاجر اور کریم رسول محمد ﷺ آرام فرما ہوں۔

ابتدا میں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ کیا کہ آپ مکان کی پہلی منزل میں ہی قیام فرمائیں گے مگر ہوا یوں کہ حضرت ابوایوب گھر کی بالائی منزل پر جانے کے لیے اوپر چڑھنے لگے تو کانپنا شروع ہو گئے۔ ان کے لیے یہ تصور بھی محال ہو گیا کہ میں حالتِ بیداری میں یا حالتِ خواب میں رسول اللہ ﷺ سے اونچی منزل میں رہوں پھر جناب ابوایوب انصاری رسول اللہ ﷺ سے درخواست کرنے لگے کہ آپ بالائی منزل پر تشریف لے جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور بالائی منزل پر قیام پذیر ہو گئے کہ اب رسول اللہ ﷺ کو مسجد کی تعمیر اور حجروں کی تیاری تک یہاں قیام فرمانا تھا۔

☆☆☆☆

قارئین کرام! آئیے آپ کو اس سہانے دور کا ایک یادگار واقعہ سنائیں جس کے اندر محبت کے جذبات بھی ہیں اور حالات کی سختی کے نشتر بھی، تاہم یہ جناب ابوایوب انصاری کی سعادت و خوش بختی کی ایک دلآویز تصویر بھی ہے! حضرت عبداللہ بن عباس بیان کرتے ہیں کہ ایک روز سخت دوپہر کے وقت جناب ابوایوب مسجد کی طرف جا رہے تھے تو جناب عمرؓ نے آپ کو دیکھ کر پوچھا، ابوایوب! اس وقت کس چیز نے تمھیں باہر نکلنے پر مجبور کیا ہے؟

جناب ابوایوب نے کہا: میں بھوک کی شدت سے دوچار ہوں اس لیے باہر نکلا ہوں!
حضرت عمرؓ نے کہا: اللہ کی قسم! مجھے بھی کسی اور چیز نے باہر نہیں نکالا، میں بھی اسی وجہ سے باہر آیا ہوں۔
جناب صدیق و فاروقؓ ابھی یہی گفتگو کر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ بھی ان کے پاس آئے اور پوچھا تمھیں اس وقت کس چیز نے باہر نکالا ہے؟
جناب ابوایوبؓ نے بتایا کہ اس لیے باہر نکلتے ہیں کہ بھوک کی شدت سے دوچار ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ مجھے بھی اس کے علاوہ کسی اور چیز نے باہر نکلنے پر مجبور نہیں کیا، آؤ میرے ساتھ چلو!
پھر صدیق و فاروقؓ اور سرپا رحمت رسول ﷺ چلے اور جناب ابوایوب انصاری کے دروازے پر جا پہنچے۔ دراصل حضرت ابوایوبؓ نے روزانہ رسول اللہ ﷺ کے لیے کھانا رکھا ہوتا تھا۔ جب آپ معمول کے وقت پر تشریف نہ لاتے، ابوایوبؓ یہ کھانا اپنے اہل خانہ کو کھلا دیتے۔

جناب ابوایوبؓ کی اہلیہ محترمہ نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو دروازے پر دیکھا تو آپ کو خوش آمدید کہا، رسول اللہ ﷺ نے پوچھا ابوایوبؓ کہاں ہیں؟ ابوایوبؓ اس وقت قریب ہی کھجوروں کے باغ میں کام کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی آواز سنتے ہی جلدی سے آگئے اور آپ کو خوش آمدید کہا پھر ساتھ ہی عرض کیا: یا نبی اللہ ﷺ! یہ وہ وقت نہیں ہے جس میں آپ تشریف لایا کرتے ہیں یعنی جس وقت آپ کے لیے کھانا رکھا ہوتا ہے یہ وہ وقت نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تو نے ٹھیک کہا۔ پھر جناب ابوایوبؓ باغ میں گئے اور کھجور کی ایک گچھے دار شاخ کاٹ لائے۔

رسول اللہ ﷺ نے دیکھا تو فرمایا میرا مقصد یہ نہیں

گھر کی بالائی منزل پر چڑھتے ہوئے وہ کانپنے لگے

رسول اللہ سے اونچی منزل پر رہنا ان کے لیے محال ہو گیا تھا



حضرت ابویوب انصاری کا گھر

جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان اختلاف رونما ہوا تو آپؐ کسی تردد کے بغیر قافلہ علیؓ میں شریک ہو گئے۔ جب جناب علیؓ شہید کر دیے گئے اور خلافت کا سارا معاملہ حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں چلا گیا تو آپؐ دل میں کوئی خیال ملائے بغیر پاک دل و پاکباز انداز میں اس طرح مجاہدین کی صفوں میں جا شامل ہوئے کہ انھیں دنیا میں کسی چیز کی کوئی خواہش و تمنا نہ تھی سوائے اس کے کہ شہیدان جہاد میں ان کو جگہ ملے۔

وہ جو نبی لشکر اسلام کو قسطنطنیہ کی طرف حرکت کرتا دیکھتے ہیں تو تلوار اٹھاتے ہیں، گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں اور اس شہادت کی تمنا میں نکل کھڑے ہوتے ہیں جس کا مدت مدید سے انھیں شوق تھا۔ اس معرکہ میں انھیں کاری زخم آئے۔ حضرت معاویہؓ کا بیٹا یزید لشکر کا کمانڈر تھا، وہ عیادت کے لیے آیا تو اس وقت آپؐ کے سانس اللہ سے ملاقات کی تیاری میں تھے۔

یزید نے پوچھا: ”جناب ابویوبؓ! آپ کی کوئی ضرورت؟“

قارئین کرام جناب ابویوبؓ نے اس موقع پر اپنی جو ضرورت بیان کی، ذرا غور کیجیے کہ کیا ہم میں سے کوئی اس

کمرے کا بہتر طریقہ اس کے سوا اور کوئی نہیں سمجھتا کہ اسے آزاد کردوں! پھر آپؐ نے اس کنیز کو آزاد کر دیا۔

☆☆☆☆

جب سے کفار مکہ اسلام کے خلاف سازشیں کرنا، دارالہجرت مدینہ منورہ پر چڑھائی کے پروگرام بنانا اور قبائل اکٹھے ہونا شروع ہوئے تھے کہ اللہ کے نور کو گل کر دیں، بالکل اسی وقت سے حضرت ابویوبؓ نے جہاد فی سبیل اللہ کو بطور پیشہ اختیار کر لیا۔ بدر ہو یا احد، خندق ہو یا کوئی اور غزوہ و مشہد، ہر ایک میں اس بہادر نے اپنا جان و مال اللہ رب العلمین کے حضور فروخت کر دیا۔ وفات رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی وہ کسی ایسے معرکہ سے پیچھے نہیں رہے جس میں مسلمانوں کی شرکت لازمی قرار دی گئی ہو خواہ یہ معرکہ کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو!

انفروا خفافا وثقالا ”نکو خواہ ہلکے ہو یا بوجھل!“ جناب ابویوب انصاریؓ کا شعار تھا جس کو وہ دن رات اور چھپے کھلے ہر حال میں گنگاتے تھے۔

ایک بار آپؓ اس لشکر میں شرکت سے رہ گئے جس کا امیر خلیفہ وقت نے ایک نوجوان مسلمان کو بنا دیا تھا اور آپؓ اس نوجوان کی امارت پر راضی نہ تھے۔ صرف اس ایک بار..... اس کے علاوہ اور کبھی نہیں! وہ اس لشکر جہاد میں شرکت نہ کر سکے اور اس عدم شرکت کے اپنے موقف پر اظہارِ ندامت سے ان کا دل مسلسل مضطرب رہتا۔ فرماتے:

ما علی من استعمل علی

”جو میرے اوپر ذمہ دار بنایا گیا، اس کی جواب دہی میری ذمہ داری نہیں ہے۔“

یعنی مجھے تو جہاد میں شریک ہو کر اپنی ذمہ داری ادا کرنی چاہیے تھی۔

اس ایک مرتبہ کے بعد وہ کبھی جہاد و قتال سے غیر حاضر نہ رہے! ان کے لیے بس یہی سب کچھ تھا کہ وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے لشکر اسلام میں زندہ رہیں، اس کے پرچم تلے لڑتے رہیں، اس کی حرمت کا دفاع کرتے رہیں اور اس کی پاسبانی کا حق ادا کرتے رہیں۔

اشبعنا وانعم علينا فافضل

”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہ وہ نعمت ہے جس کے بارے میں قیامت کے روز تم سے پوچھا جائے گا۔ جب تمہیں ایسی نعمت میسر آئے اور تم اس پر ہاتھ ڈالنے لگو تو بسم اللہ پڑھ لیا کرو اور جب شکم میرا ہو جاؤ تو پڑھا کرو الحمد للہ الذی هو اشبعنا وانعم علينا فافضل“ تعریفوں کا حق دار وہی ہے جس نے ہمیں شکم سیر کیا اور ہمارے اوپر اپنی نعمت فرمائی تو بہترین نعمت فرمائی!“

پھر رسول اللہ ﷺ اٹھے اور جاتے ہوئے حضرت ابویوبؓ سے فرمایا، کل ہمارے پاس آنا۔ دراصل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اگر کوئی آدمی بھلائی کرتا تو آپؐ اس کو بہترین بدلہ دینا پسند کیا کرتے تھے۔

دوسرے روز جناب ابویوبؓ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو نبی ﷺ نے اپنی ایک کنیز جو آپؐ کی خدمت کرتی تھی، حضرت ابویوبؓ کو عنایت کر دی اور فرمایا: ”ابویوبؓ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، یہ جب تک ہمارے پاس رہی ہے ہم نے اس کے اندر خیر ہی دیکھی۔“ جناب ابویوبؓ کنیز کو لے کر گھر پہنچے تو ام ایوبؓ نے دیکھ کر پوچھا، ابویوبؓ یہ کس کی کنیز ہے؟

آپؓ نے کہا! یہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تحفہ دی ہے۔ ام ایوبؓ نے کہا: دینے والا کس قدر عظیم ہے اور دی گئی چیز کس قدر معزز ہے!!

پھر جناب ابویوبؓ نے کہا، رسول اللہ ﷺ نے نصیحت کی ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ ام ایوبؓ نے کہا تو پھر رسول اللہ ﷺ کی نصیحت پر عمل کیے بغیر ہم کیسے رہ سکتے ہیں؟

حضرت ابویوبؓ نے کہا: میں اس نصیحت پر عمل

تھا کہ تم شاخ ہی کاٹ کر لے آؤ، تم بھجوریں کیوں نہ توڑ لائے؟ حضرت ابویوبؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ میں نے چاہا کہ آپؐ اس سے تمر، رطب اور بُسر (پکی، کچی اور خشک) بھجوریں کھائیں، البتہ میں آپؐ کے لیے کچھ ذبح بھی کرتا ہوں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر ذبح ہی کرنا ہے تو کوئی دودھ دیتا جانور ذبح نہ کرنا۔

پھر ابویوبؓ نے بکری کا ایک بچہ ذبح کیا اور بیوی سے کہا کہ آٹا گوندھو اور روٹیاں پکاؤ۔ پھر خود آدھے گوشت کو لیا اور اس کو پکایا اور آدھے کو بھونا۔

جب کھانا تیار ہو گیا اور نبی ﷺ اور آپؐ کے ساتھیوں کے سامنے رکھ دیا تو آپؐ نے ایک بوٹی لی اور اس کو ایک روٹی کے اندر رکھا اور فرمایا:

یا ابا ایوب بادر بهذه القطعة الى فاطمة فانها لم تصب مثل هذا منذ ايام ”ابویوبؓ یہ بوٹی جلدی سے فاطمہ کو دے آؤ، اس کو کئی دنوں سے ایسی کوئی چیز میسر نہیں آئی۔“ پھر رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی کھانا کھا چکے تو آپؐ نے فرمایا:

خبزو لحم وتمر و بسر و رطب!! ”روٹی اور گوشت، پکی، خشک اور تر بھجوریں!!“ ساتھ ہی نبی ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور آپؐ کی زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے:

ولا ذی نفسی بیدہ ان هذا هو النعم الذی تسألون عنه یوم القیامۃ فاذا اصبتہم مثل هذا فضربتہم بایدیکم فیہ فقولوا: بسم اللہ فاذا شبعتم فقولوا: الحمد للہ الذی هو

وہ ان ۷۰ مومنوں میں سے تھے جنھوں نے دستِ رسولؐ میں ہاتھ دے کر

مدینہ آنے سے قبل ان کی مدد و نصرت کی پختہ قسم کھائی تھی

ترکی کا "میچ" بری طرح متاثر ہوا ہے "عشق ممنوع"

ترک سیکولر ڈراما کی مقبولیت پر اٹھتے اہم سوال

کوئی سنسر بورڈ، کوئی پیسیرا
ادھر بھی دھیان کرے گا؟



2013

ترکی دسویں بڑی
طاقت بننے کو ہے!

پرتال: اختر عباس

سیاسی و معاشی استحکام کے بعد دنیا پر ترک ثقافتی یلغار کیا رنگ لائے گی؟

سے دو چار ہوتے تو اس کے ذریعے بارش کی دعا کرتے!"
☆☆☆☆

حضرت ابوالیوب انصاریؒ کی زندگی نے انھیں معرکوں میں مشغول رکھا اور تلوار کندھے سے اتار کر ذرا آرام کرنے کی مہلت نہ دی۔ معرکہ آرائی کی اس بھرپور زندگی کے علاوہ ان کی بقیہ زندگی نسیم فجر کی مانند نہایت پرسکون اور رواں دواں تھی۔ اس لیے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے ایک حدیث مبارک سماعت کی پھر اس کو ازبر کر لیا کہ:

اذا صليت فصل صلاة مودع

ولا تكلمن بكلام تعتذر منه

والزم الياس مما في ايدي الناس

"جب تم نماز پڑھو تو دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے آدمی کی مانند نماز پڑھو اور کوئی ایسی بات مت کہو جس پر بعد میں معذرت کرنا پڑے جو کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، اس سے مکمل طور پر مایوس رہو!"

شاید یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنی زبان کو کسی فتنہ میں ملوث اور اپنے دل کو کسی حرص و آز کی طرف مائل نہ ہونے دیا۔ زندگی عابدوں کے سے شوق اور قریب المرگ لوگوں کی سی بے نیازی میں بسر کی اور جب ان کی موت آئی تو دنیا کے طول و عرض میں اس کے سوا کوئی خواہش نہ تھی کہ میری میت کو روم کی بعید ترین سرزمین پر لے جانا اور وہاں دفن کرنا!

آج آپؐ وہیں آرام فرما ہیں اور فضا میں مسجدوں کے بلند میناروں سے اذان کی بہار آفریں آوازیں سنتے ہیں کہ:

"اللہ بہت ہی بڑا ہے۔"

"اللہ بہت ہی بڑا ہے۔"

آپؐ کی روح یہ حسین کلمات سن کر اپنے جنتی گھر اور بلند و بالا محل میں یہ جواب دیتی ہوگی:

هذا ما وعدنا الله ورسوله

"یہ ہے وہ چیز جس کا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ہم سے وعدہ فرمایا تھا۔"

ضرورت کو اپنے تخیل و تصور میں لا سکتا ہے؟

ہرگز نہیں، ہم میں سے کوئی اس بلند خیالی اور دور اندیشی تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ ان کی اس وقت کی ضرورت جبکہ ان کی روح پرواز کر رہی تھی، ایک ایسی شے تھی جو بنی نوع انسان کے تصور و تخیل کو عاجز کر کے رکھ دے!

جان کنی کے لمحات میں جناب ابوالیوب انصاریؒ نے یزید سے مطالبہ کیا کہ جب میں موت کی آغوش میں چلا جاؤں تو میری میت کو میرے گھوڑے پر لا دیا جائے پھر اس گھوڑے کو دشمن کی زمین میں جس قدر ممکن ہو سکے طویل ترین مسافت تک دوڑایا جائے اور وہاں لے جا کر دفن کیا جائے پھر کمانڈر اپنا لشکر لے کر اس راہ پر چلتا ہوا دشمن پر لشکر کشی کرے یہاں تک کہ مسلمان لشکر کے گھوڑوں کے قدموں کی چاپ مجھے میری قبر میں سنائی دے!

اس وقت کمانڈر سمجھ لے کہ مسلمانوں نے اس فوز و نصرت کو پالیا ہے جس کی تلاش میں وہ نکلے تھے!

قارئین کرام! کیا آپ اسے شاعرانہ تصور سمجھتے ہیں؟ نہیں..... نہیں! یہ محض خیال اور تصور نہیں ہے بلکہ دنیا پر رونما ہونے والا ایک حقیقی واقعہ ہے جس کا دنیا نے مشاہدہ کیا اور اپنی نگاہیں اور سماعتیں اسی واقعہ پر مرکوز کر رکھی تھیں کہ انھیں اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا جو ان کی آنکھیں دیکھ اور کان سن رہے تھے!

یزید بن معاویہ نے حضرت ابوالیوب انصاریؒ کی وصیت پر عمل کیا اور قسطنطنیہ جسے آج کی دنیا "استنبول" کے نام سے جانتی ہے، اس کے قلب میں اس عظیم آدمی کی میت کو دفن کیا! جب اسلام نے اس بقعہ زمین کو اپنی روشنی سے منور نہیں کیا تھا تب بھی روم کے اہل قسطنطنیہ حضرت ابوالیوب انصاریؒ کو قبر کے اندر ہونے کے باوجود پاکباز تصور کرتے تھے۔

اس وقت تو آپؐ اور زیادہ حیران ہو جائیں گے جب ان واقعات کو قلمبند کرنے والے مؤرخین کو یہ کہتے ہوئے سنیں گے کہ "اہل روم حضرت ابوالیوب انصاریؒ کی قبر کو بڑی اہمیت دیتے تھے، قبر کی زیارت کے لیے جاتے اور جب قحط

”عشق ممنوع“ اردو و ن نے

ترکی سے حاصل کیا۔ سیکولر ترکی سے آنے والے اس ڈرامے نے دیکھنے والوں کی آنکھیں ہی چندھا دیں۔ جن موضوعات پر کبھی کوئی شائستہ اطوار بات کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کبھی ذکر بھی ہوتا ہوگا تو سات پردوں میں، وہ ذکر ٹی وی سکرین پر روز ہونے لگا۔ جس چینل کا کبھی ذکر نہیں ہوا تھا۔ کسی گنتی شمار میں نہیں تھا، ایک ڈرامے نے اسے دیکھتے ہی دیکھتے ڈرامے کے نئے رجحان کا امام بنا دیا۔ عشق ہمیشہ ممنوع ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے اسے منع کرنے والے تھک جاتے ہیں اور کرنے والے سو راستے نکال لیتے ہیں۔ ملکوں معاشروں کی بنیاد، افکار سے زیادہ معاشرت اور اخلاقی فریم ورک پر ہوتی ہے جس میں ممنوع اور غیر ممنوع جلی الفاظ میں لکھے ہوتے ہیں۔

ذہنی پستی کے نہ رکنے والے سفر کا کوئی پڑاؤ نہیں ہوتا، پاکستانی ڈرامے نے محبت کے نام پر گزشتہ کئی سال سے ہر حد توڑنے کا کام سنبھال رکھا تھا۔ عشق ممنوع اس سے بھی ایک ہاتھ آگے چلا گیا۔ اپنے ہی چچا کی بیوی سے عشق، محترم رشتوں کی تذلیل کے لیے کبھی کبھی تو کہانیاں گھڑنی نہیں پڑتیں بلکہ لگاوٹ اور بدستی کی ایک نگاہ ہی کافی ہوتی ہے۔ مگر عشق ممنوع نے تو کئی حدیں توڑ دیں۔ بدستی کو مستی بنا کر یوں پیش کیا گیا کہ ڈرامے کا ہر کردار اپنی حدود توڑنے پر آمادہ رہنے لگا۔ یہی سب کچھ نیا تھا، شاید روایت، اخلاق اور طے شدہ ضوابط کو کوئی خود توڑ نہ سکے تو دوسروں کو ایسا کرتے دیکھنے سے تسکین ہوتی ہوگی۔ وجہ کوئی بھی ہو، یہ ڈراما ہر جگہ موضوع بحث بن گیا۔

کیا یہ ڈراما ترکی کی نمائندگی کرتا ہے

یہاں سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ڈراما ترکی کی نمائندگی کرتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر درمش بلوگر سے رابطہ کیا

وہ استنبول سے لاہور آئے ہیں، پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج میں رومی چیئر کے سربراہ ہیں۔ وہ بولے: ”ترکی میں ایسا کلچر بے شک ہے مگر اس کی تعداد یا مقدار بہت کم ہے۔ یہ ڈراما جس ناول پر مبنی ہے وہ بھی کوئی سو سال پرانا ہے۔ اس پر پہلے فلم بھی بنی تھی۔ میں تو ہمیشہ اپنے جاننے والوں کو منع ہی کرتا رہا لیکن اس کو پسند کرنے والے تو موجود تھے۔“

ان کا اصرار تھا کہ ”ایسے ڈرامے بنانے والے معاشرے کو خراب کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اسے دیکھنے والے بے شک ضرور ہوتے ہیں مگر پسند اور ناپسند کرنے والوں میں بڑا واضح فرق ہوتا ہے۔ ترکی میں یہ فرق موجود ہے اور موجود رہے گا۔“



ڈاکٹر درمش

ڈاکٹر درمش نے افسوس سے کہا:

”میرا احساس ہے کہ اس ڈرامے نے ترکی کا امیج بری طرح متاثر کیا ہے۔“

عجیب بات یہ ہے کہ پاکستانی پرنٹ میڈیا میں صرف ایک اخبار نے اس ڈرامے کے معاشرے پر منفی اثرات کو موضوع بنا کر خبریں دیں۔ ورنہ باقی تو عشق ممنوع کے ہیرو، ہیروئن کی خوبصورتی اور بے پناہ مقبولیت کی خبریں ہی دیتے رہے۔

خواتین کے ایک نئے میگزین نے تو بھتر کی شادی

کے حوالے سے معلوماتی تحریر بھی شائع کر دی ہے کہ بھلول اور بھتر آج کے پاکستان کے نئے ہیرو ہیں۔ اسے ایف پی کے حوالے سے آنے والی ایک خبر ہمارے ہاں شائع ہوئی ہے کہ ترک صدر عبداللہ گل نے اس ڈرامے کا نوٹس لیا ہے۔ اس خبر کے بعد سے اس محاذ پر خاموشی ہے نہ تو ترک سفارت خانے اور نہ ہی ترکی سے متعلق کسی سیاسی، سماجی یا کاروباری انجمن کا ہی کوئی بیان سامنے آیا ہے۔ عشق ممنوع ایک ناول نگار خالد ضیا او شنگ کلیمگل کے لکھے ہوئے ناول سے ماخوذ ہے۔ اس کی پروڈکشن، کردار سازی اور ماحول اس قدر خوبصورتی سے دکھایا گیا ہے کہ یہ ڈراما جہاں جہاں بھی گیا، ایک سحر طاری کرتا گیا۔

معابل و خلیل



ترکی کے اعلیٰ طبقے کا رہن سہن ہمیشہ سے لوگوں کو Fascinate کرتا ہے۔ لوگ اس ماحول میں جینے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں طبقہ امراء کے لیے بھی یہ خبر تھی کہ ترکی میں لوگ ان سے بھی بہتر زندگی جیتتے ہیں۔ اس ڈرامے کی کامیابی پر ہمارا قومی رد عمل بہت ہی ”شاندار“ رہا۔ میڈیا نے ترکی کی طرف دوڑ لگا دی۔ تاکہ انہی اداکاروں کے مزید ڈرامے خریدے جاسکیں، جیونے ”نور“ خرید لیا جو وہاں پہلے ہی بے حد مقبول ہو چکا تھا۔ ایکسپریس نے ”منابل اور خلیل“ کو پسند کیا۔ کم سے کم ۵ ڈرامے اس وقت آن ائر ہیں۔ لاہور میں ایک پلازے میں کئی نئے سٹوڈیوز وجود میں آگئے وہاں صرف ترکی

ڈراموں کی ڈبنگ ہوا کرے گی۔ ایک ترکی فلم کی ڈبنگ ہو بھی چکی۔ ایس ٹی وی اردو (STV) کے نام سے ترکی کے ایک چینل کو بھی منظوری مل گئی ہے۔

دوسرا رد عمل کراچی اور لاہور کے اداکاروں اور پروڈکشن ہاؤس کے مالکوں کا تھا۔ انھیں دکھ اس بات کا ہوا کہ ہمارے بنائے ڈرامے کی ایک قسط ۶،۵ لاکھ میں بکتی ہے اور ترکی والے ڈرامے کی قسط ایک لاکھ میں دستیاب ہے۔ معاشی طور پر چینلو کو آسانی ہی نہیں بچت بھی ہوگی۔ یوں آنے والے دنوں میں یہ رجحان دنیا کے ہر اچھے برے ڈرامے کو یہاں لانے اور ڈبنگ کر کے دکھانے کی بنیاد بنے گا۔ یوں ان کو مالی نقصان ہوگا۔ ممکن ہے کسی دل والے نے ملک کی

تہذیب، معاشرت یا اقدار کا بھی سوچا ہو مگر جو کچھ ان کے ہاتھوں انجام پا رہا ہے وہ اس سوچ کی تو نفی کرتا ہے۔ سولجہ بھر کو آئی خوش گمانی ٹھہرنے کی جگہ نہیں ڈھونڈ پاتی۔ تیسرا رد عمل عوامی ہے اور وہ بے انتہا کمال کا۔ انھیں نئے اور خوبصورت ہیرو ہیروئن مل گئے۔ گاسپ (Gossip) کے لیے موضوع مل گیا اور دیکھنے کے لیے عمدہ اور خوبصورتی سے بنا ہوا ڈراما۔ مقبولیت کے نئے ریکارڈ کیوں نہ قائم ہوتے؟ اس ساری صورت حال میں ایک بات بہت ہی اہم ہے کہ ثقافتی حملے میں یہ ہماری تیسری پسپائی ہے جو ہمیں بحیثیت قوم نصیب ہو رہی ہے۔ ان درآمدہ ثقافتوں سے اگر تو ملک و قوم کی کوئی بہت بہتری ہوئی ہوتی تو آج ہم

بھی بام عروج پر پہنچے ہوتے اور دنیا کو اپنی ثقافت سے روشناس کرا رہے ہوتے۔ کہیں ہمارے ڈرامے چل رہے ہوتے۔ کہیں فلمیں پسند کی جا رہی ہوتیں، کہیں ہمارے مزاج و اطوار زیر بحث ہوتے۔ ہماری ثقافت کی خوبیاں اور خوبصورتیاں توجہ پا رہی ہوتیں تو یقیناً اطمینان کا موقع ہوتا، مگر آج کا اہم ترین سوال یہ ہے کہ ان ۶۵ برسوں میں بطور قوم ہم نے اپنی کیا ثقافت طے کی ہے؟ اپنی ثقافت کی کون سی خوبیاں اور خوبصورتیاں ہیں، جن پر متفق ہوئے ہیں اور جن کو پذیرائی بخشی گئی اور پھر جسے لے کر ادب پارے، ڈرامے، فلمیں، شاعری، نثر کے شہ پارے تخلیق کیے گئے۔ ادارے بنائے گئے۔ لائق اور بے نیازی کی حد تو یہ ہے کہ پاکستانی ثقافت پر کوئی تحریر پڑھنی

ہو تو فیض احمد فیض کی دو تین تقریروں والے ایک کتابچے کے علاوہ ڈھنگ کی کوئی کتاب نہیں ملتی۔ اہل علم و اہل فکر ہی نہیں اہل دانش اور برسوں سے ملک و قوم کی ثقافت کے مظہر اور استعارا بننے والے فنکار بھی بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔ جنرل ضیاء کے زمانے میں بنے شاہین، آخری چٹان کے بعد کوئی تاریخی ڈراما تک نہیں بنا سکے۔ اچھے موضوع پر فلم کا تو سوچے ہی نہیں، ہر قوم اپنی ثقافت، اقدار اور اطوار سے ہی اپنا کلچر طے کرتی ہے۔ مقامی ثقافتیں اور روایات اس میں شامل ہو کر اسے خوب تر بناتی ہیں۔ قوم کے مذہب کا مزاج اسے قبول صورت بننے میں مدد دیتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اہلیت کے سارے سوتے یہاں

ترکوں میں اسلام، پرانی اور دلچسپ تاریخ

ترکوں میں اسلام کے تعارف کی تاریخ بہت پرانی اور دلچسپ ہے۔ یہ پہلی صدی ہجری اور بنو امیہ کے خلیفہ ولید اول کا دور تھا۔ یہ اعزاز قتیبہ بن مسلم کو حاصل ہوا۔ اس نامی سپہ سالار نے سمرقند و بخارا، خوارزم (خیوا)، غرناطہ، تاشقند اور کاشغر تک کے ترک علاقے فتح کر کے وہاں اسلامی حکومت قائم کر دی۔ ترکوں نے ان فتوحات کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا اور اپنی معاشرت اور بت پرستی کے مذہب پر کاربند رہے، البتہ سمرقند میں پیش آنے والے ایک غیر معمولی واقعہ نے عام لوگوں میں اسلام اور مسلمانوں کا ایک نیا تعارف کرایا۔ سمرقند میں بت خانے دیگر علاقوں میں ریاستوں کی نسبت کہیں زیادہ تھے اور یہ یقیناً راسخ تھا کہ جوان کی توہین کرے گا یا بے ادبی کا مرتکب ہو فوراً مارا جائے گا۔ قتیبہ بن مسلم نے ان سب بت خانوں کو آگ لگوا دی۔ ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب پر پیچنگ آف اسلام (ص ۲۳۸) میں لکھا ہے کہ اتنے بڑے قدم کے بعد بھی جب اسے کچھ نہ ہوا تو عام آبادی کے ساتھ ساتھ بت پرستوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سنہری دور خلافت (۷۲۰ء-۷۴۱ء) میں اشاعت اسلام پر خصوصی توجہ دی گئی۔ انھوں نے ماوراء النہر کے ترک بادشاہوں کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ معروف تاریخ دان بلاذری نے فتوح البلدان (ص ۴۳۲) میں لکھا ہے کہ عبداللہ ابن معمر البشکری کو وہاں بھیجا گیا تو کئی قبیلے اسلام لے آئے۔ خلیفہ ہشام کے طویل عہد خلافت (۷۲۳ء-۷۴۳ء) میں ابو سعید کی کوششوں سے ماوراء النہر کے لوگ کثرت سے دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ترکستان کے علاقوں سمرقند اور بخارا سے جزیہ اور خراج کے سلسلے میں لونڈیاں اور غلام مرکزی بیت المال بھجوائے جاتے۔ جنھوں نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا۔

سب سے پہلے عباسی خلیفہ منصور نے (۷۵۵ء-۷۵۴ء) ترکوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا۔ اس کے عہد میں فوج میں ایرانی اور عرب غالب تھے۔ امین کے زوال کے بعد عربوں کی قوت کا خاتمہ ہوا اور مامون کے عہد میں اس کی ایرانی النسل ماں کی وجہ سے ایرانیوں کا زور بہت بڑھ گیا۔ معتصم باللہ خلیفہ بنا تو ایرانیوں کے خوف کی وجہ سے اس نے ترکوں کی مدد چاہی چونکہ اس کی ماں ترک تھی، اس لیے اس کا میلان ترکوں کی طرف زیادہ رہا۔ اس نے ہزاروں غلام خرید کر انھیں اسلامی تعلیم اور فوجی تربیت

دیکھ کر چکے ہیں۔ ہاں سوچنے سمجھنے اور آگے بڑھ کر کچھ کرنے کا وقت ہم بار بار گنوا چکے ہیں۔ ڈرنے یا قوم کو دوسری تہذیبوں سے ڈرانے کا وقت بھی جاتا رہا۔ اب اس پر شاید چار لوگ رک کر بات بھی نہیں سنتے۔ ترقی کے شوقین معاشرے، ترقی کی دوڑ میں جب پیچھے رہ جاتے ہیں تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ وہ اپنے آس پاس سے آگے نکلتی ہر قوم کو، اس کی عادتوں کو، اس کے لباس، مزاج اور اخلاقیات کو ہی ترقی کا زینہ سمجھ لیتے ہیں۔

دینی اور مذہبی جماعتوں نے گزشتہ چھ دہائیوں سے اس ملک میں بیسیوں مواقع پر شور مچایا اور اس کے بعد لمبا وقفہ اس لیے دیا تا کہ نئے سیاسی ایشو پر صرف بندی کی جا سکے۔ شاید ہی کوئی سماجی یا معاشرتی مسئلہ ایسا ہو جہاں انھوں نے کوئی ایسا حل دیا ہو جسے معاشرے میں قبول عام حاصل ہوا ہو۔ معاشرے کی بد صورتی نہ صرف قائم رہی بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ کاش یہ لوگ مل کر ہی سہی کوئی دو چار ڈرامے سیریل، فلمیں ہی بنا دیتے، اس موضوع پر راہنمائی کے لیے کتابیں لکھی جاتیں۔ کھلی بحثیں ہوتیں اور ایک قابل قبول اور پسند کیا جانے والا کلچر سامنے

آتا، ہر بار یہ تو نہ سننا پڑتا کہ لباس بھی کسی اور کا، زبان بھی، انداز بھی اور اطوار بھی۔ کوئی قوم کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو۔ بے زبان نہیں ہوتی۔ نہ اپنے ماضی سے کٹی اور خلا میں معلق ہوتی ہے کہ جہاں ہر طرف سے وہ ہر کلچر کی زد میں ہو۔ سکھوں نے یورپ جا کر نہ اپنی پگڑی چھوڑی نہ واڑھی نہ روایت۔ شادی بیاہوں پر ویسے ہی بھنگڑے ڈالتے ہیں۔ جیسے امرتسر کی معاشرت میں بندھے ہوں۔ اس سے وہ ہر جگہ پہچانے جاتے ہیں۔

ہم ڈراموں اور فلموں کو فوراً برا بھلا کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اپنا فرض ادا کر دیا ہے، ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا یہ غلط ہے۔ کہیں تو کسی چیز کی Replacement دی ہوتی۔ برا بھلا کہنے، الزام دینے میں ۶۰ برس گزر گئے خلا کو نہ پُر کیا۔ نہ کسی نے پُر کرنے کا سوچا، اب میڈیا پر جو آرہا ہے، وہی کل بچ بن کر ڈسے گا۔ معروف ماہر نفسیات ارشد جاوید کہنے لگے: ”میرے پاس ایسے کتنے ہی نوجوان مریض آتے ہیں جنھوں نے انگریزی ناول پڑھے۔ وہاں محترم اور مقدس رشتوں پہ دست درازی یا آمادی کے ساتھ جنسی تعلق کی منظر کشی پڑھی

سے سرفراز کیا۔ ای گمن نے اپنی رومن ایمپائر (ص: ۴۷) میں لکھا ”معتصم نے جو اس خطرناک مثال کا سب سے پہلا بانی ہے۔ پچاس ہزار سے زائد ترکوں کو دار الحکومت میں لا کر آباد کیا۔ اس نے ان کے لیے طلا کا ریشمی لباس تجویز کیا اور زریں ٹپکے وروی میں شامل کیے جس کی وجہ سے ترکی دستے دوسری فوجوں سے ممتاز معلوم ہوتے تھے۔ ہر سال ہزاروں غلام پایہ تخت لائے جاتے۔ کچھ محافظ بننے، باقی فوج کا حصہ بنا لیے جاتے۔ ترک فوجی اور عہدے دار مزاجا ترش، ظالم اور خود سر تھے۔ اسی لیے بغداد کے باشندے ان کی زیادتیوں سے تنگ تھے۔ وہ بے تحاشا گھوڑے دوڑاتے، اکثر عورتیں اور بچے ان سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتے۔ خلیفہ معتصم کے پاس جب ترک فوجیوں کی شکایات کا سلسلہ رکنے میں نہ آیا تو اس نے خلاف توقع ایک ایسا فیصلہ کیا کہ جس کے اثرات آنے والی کئی دہائیوں پر پھیل گئے۔ معتصم نے بغداد سے ۶۰ میل دور ”سامرا“ کے مقام پر ترک فوجیوں کے لیے چھاؤنی بنوائی اور پھر اس کا نام بدل کر سرمن رائے (جس نے دیکھا۔ دیکھ کر خوش ہوا) رکھ دیا۔ فوجی بارکوں کے علاوہ خلیفہ کے محلات اور وزراء کے گھر بھی تعمیر کیے جانے لگے۔ خلیفہ کے وہاں آنے سے رعایا کے ہر طبقے کے لوگ وہاں آکر رہنے لگے۔

۸۹۳-۸۳۶ء تک سرمن رائے سات خلفاء کا دار الخلافہ رہا۔ معتصم کی ترک نوازی کی وجہ سے ترک شہزادے اور امراء ترکستان سے آکر وہاں آباد ہو گئے اور لوگ بکثرت مسلمان ہونے لگے۔ ترکوں کا اقتدار فوج اور حکومت میں بڑھتا گیا یہاں تک کہ خلفاء کی زندگی و موت، منصب پر فائز ہونے سے معزولی تک سب ترک فوج کے عہدے دارن کے ہاتھ میں آ گیا۔ انھوں نے نہ صرف متعدد خلفاء کو قتل کیا بلکہ ان کو ذلیل کر کے معزول کر دیا۔

خلیفہ سلمان عالی شان

ترک میڈیا کی مادر پدر آزادی کا احوال ایک اور مثال سے بھی سامنے آیا کہ عثمانی ترک سلطان سلمان عالی شان کے حوالے سے ایک ڈراما مختشم یوزگل (Muhtesem Yuzyl)، ان دنوں شدید تنازعات میں گھرا ہوا ہے۔ ترک وزیر اعظم تک نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے کہ آپ اس ڈرامے سے خلافت عثمانیہ کو بدنام کر رہے ہیں۔ اس ڈرامے میں خلیفہ سلمان عالی شان کی حرم کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔



روندنے کی اجازت دی ہے۔ مہا بھارت سے لے کر گیتا کی تعلیمات تک ڈرامے بنتے ہیں، ابھی حال ہی میں کامیاب ہونے والے شیوا سیریل کے علاوہ ہر ڈرامے، سوپ سیریل کو اس خوبصورتی سے مذہبی روایات، مندر، پنڈت سے جوڑا ہے کہ ان کی نئی نسل سے زیادہ ہماری نئی نسل شادی بیاہ سے لے کر مرنے تک کی تمام رسموں اور اشلوکوں سے واقف ہو چکی ہے۔ ہر کردار تھوڑی دیر بعد گھر

مرد و خواتین بچاری گیتا پڑھ رہے تھے۔ ہندو دھرم اور انسانیت پر درس دے رہے تھے۔ ان کا کوئی چینل بھی ایسا نہ تھا جو اس وقت مذہبی نشریات کے علاوہ وقت پورا کرنے کے لیے کوئی گانا، ڈراما، ری ٹیلی کاسٹ (Repeat) نہیں کر رہے تھے۔ اگر میں ان کی اس ادا کی تحسین نہ کروں تو زیادتی ہوگی۔ انھوں نے میڈیا کے طوفان میں اپنے دھرم کو نہ تو خود روندنا ہے نہ کسی کو

کیا اب بھی ایسا ہی ہوگا؟

۲۰۱۲ء نے اپنے اختتام سے قبل ایک حیران کن منظر دیکھا، جب تہذیبوں کے مقابلے میں ہاری ہوئی اس 'مفتوح قوم' کے، مفتوح اداکار، فنکار، ہدایت کار اور پروڈیوسر، سرکوں پر نعرے لگاتے اور پلے کارڈز اٹھائے نظر آئے۔ جو اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں، ضوابط کے تحت زندگی بسر کرتے ہیں وہ ہمیں ایک تیسری تہذیب کے اثرات سے ڈرا رہے ہیں۔ جس کے اندر ان کے خیال میں اخلاقیات اور اقدار نہیں۔ انقلاب ہیں زمانے کے۔ اقدار کی بے قدری کرنے والے اقدار کی حفاظت کے لیے پریشان نظر آئے، اب وہ ہمیں مغربی ثقافت اور پھر بھارتی ثقافت کے بعد ترکی ثقافت کے حملے کا بتا رہے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کی تیسری شرمندگی کا سامنا ہے۔ ہم بھی کیا بے نیاز لوگ ہیں۔ ملک ٹوٹا تو ٹوٹنے کی اپنی اپنی وجوہ کی ڈھیریاں لگا کر بیٹھ گئے۔ تاریخ کی اتنی بڑی فوجی شکست اور آدھے ملک کی علیحدگی پر متفقہ وجوہ ڈھونڈنے، ان پر یکسو ہونے اور آئندہ کے لیے منصوبہ بندی کرنے کی نوبت تک نہیں آنے دی۔ مبادارک کر، ٹھہر کر اپنی کسی کمزوری، کمی اور کمی کو ٹھیک نہ کرنا پڑ جائے۔ کیا اب بھی ایسا ہی ہوگا کہ اجتماعی طور پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں آئے گا؟

وہ بہتات ہوئی کہ فیملی ڈرامے کے نام پہ مقبول ڈرامے کے ایک کردار کو اس کی بیوی نے اپنے بیٹے اور بہو کی موجودگی میں کہا، ”اب کمرے میں چلیں آرام کرتے ہیں۔“ تو شوہر نے خاموشی سے اٹھ کر چلنے کے بجائے اپنے معمول کے مطابق یہ کہنا ضروری سمجھا کہ ”کمرے میں جا کر ہم جو کچھ کریں گے اسے آرام کہتے ہیں؟“

آپ اگر اس پورے منظر نامے سے واقف نہیں ہیں تو سچ کہوں آپ کا یہ روداد پڑھ کر دل پھٹنے کو آجائے گا۔ ہمارا آج کن کے سپرد ہے اور ہم نے اپنے کل کی حفاظت کے لیے کن کو تیار کیا ہے؟ یہ کسی ایک دن کا شاخسانہ نہیں ہے۔ نہ کوئی اتفاقی حادثہ اور واقعہ ہے۔ جیسے ’جگ سا پزل‘ میں ایک تصویر مکمل نہیں ہوتی جب تک اس کے سارے حصے جو بخرے بخرے ہوتے ہیں، مکمل نہ لیے جائیں، ساتھ رکھے ہوئے نہ ہوں تو تصویر سامنے ہی نہیں آتی۔ ترکی جیسے سیکولر ملک سے ڈرامے لانے، ان کو ڈب کرنے اور اس قوم کو اس تہذیب سے متعارف کرانے کا کارنامہ کرنے والے کسی اور ملک سے تو نہیں آئے ہوں گے۔ انھیں اس میں آسانی سے حاصل ہونے والی آمدن نظر آئی جو انھوں نے حاصل کر لی۔ اس کے جواب میں قوم کو کیا ملا۔ اس پر بات نہیں کرتے، اس مائنڈ سیٹ کو ضرور دیکھیے کہ ملک کے ہر چینل کی سربراہی پہ بیٹھے اعلیٰ دماغوں نے فوری طور اسے ایک Opportunity پایا اور ترکی سے نئے ڈرامے لانے کے لیے کود پڑے۔ شام کوئی وی لگائے تو ہر چینل پر ترکی چہرے اپنے کلچر کے لباسوں، عادتوں کے ساتھ اردو میں سب کچھ مفت میں عطا کر رہے ہوتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے انڈیا جانے کا اتفاق ہوا۔ رات شملہ کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ صبح چھ بجے اٹھ کر ٹی وی آن کیا تو یہ بھی تصدیق ہو گئی کہ پسندیدہ ملک والے ہمارا کوئی چینل بھی اپنے لوگوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے۔ ڈرامے تو دور کی بات بے ضرر خبروں والے چینل بھی موجود نہیں تھے۔ ہاں ان کے ۱۸ چینل میں نے بدل بدل کر دیکھے۔ سب پر اپنے اپنے الگ الگ پنڈت، پروہت اور

اور پھر کسی کمزور لمحے اپنے ہی سکے رشتوں کے ساتھ ویسے کرنے کی کوشش کی۔ کامیابی اور ناکامی دونوں صورتوں میں ذہنی مریض بن کر پھر برسوں اپنا علاج کراتے ہیں مگر اس شرمندگی سے نہیں نکل پاتے۔“

سیاسی و معاشی استحکام کے بعد دنیا پر ترک ثقافتی یلغار کیا رنگ لائے گی، اس کے اثرات ایک تجربے میں سیٹنے مشکل ہوں گے مگر یہ ضرور ہوا ہے کہ پاکستان میں ترکی کے لیے ہمیشہ سے موجود محبت اور احترام عشق ممنوع کے اخلاقیات و حدود قیود سے بے نیاز کرداروں کے باعث مجروح بھی ہوا ہے اور متاثر بھی۔ بے شک بہت سے عام لوگوں نے اس ڈرامے اور اس کے بعد آنے والے ڈراموں کو آسانی سے قبول بھی کر لیا ہے۔ اسے اشتہار بھی مل گئے ہیں اور مقبولیت بھی۔ یوں ترکی ڈرامے لانے والوں کا جو ٹارگٹ یا مقصد تھا وہ بہر حال آسانی سے پورا ہو چکا۔ اب ڈراموں کے بعد لوگوں کا باہم رابطہ ہوگا تو اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں والا معاملہ ہوگا۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ترکی کی عام زندگی بھی یورپ کی قربت یا اس کا حصہ ہونے کے باعث ہم سے بہت مختلف ہے بلکہ دس بیس سال آگے ہے۔

اس ڈرامے نے جہاں مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ ریٹنگ میں ڈراما اور چینل کہیں آگے نکل گئے۔ نئے ترکی کے ڈرامے نے بہت کچھ پچھاڑ دیا۔ ایک ایسی ثقافتی یلغار کا آغاز ہوا ہے، جس سے سرمائے کی آمد جڑی ہوئی ہے۔ اسی لیے اسے یہاں سے اپنے وکیل بھی آسانی سے مل جائیں گے جنھیں یہ غرض نہیں ہوگی کہ ان کی آمدن معاشرے کا حلیہ کس حد تک بگاڑ دے گی۔

میڈیا کو آزادی ملنے کے بعد ہر پروڈکشن ہاؤس نے ان موضوعات کو چنا، جن پر بات کرتے ہوئے بھی کانوں سے دھواں نکلتا تھا۔ وفا گالی بن کر حماقت ٹھہری اور بے وفائی ادا۔ شادی کے بعد بھی خوش شکل انسانوں سے جسمانی ذہنی تعلقات کو دلیلوں کی بنیادیں فراہم کی جانے لگیں۔ گلے ملنے، ایک بستر پر سونے اور ذومعنی جملوں کی

کے مندر میں ہی ماتھا ٹیک رہا ہوتا ہے۔ دفتر جاتے ہوئے پرشاد لے اور دے رہا ہوتا ہے۔ اس طرح کے کسی سین پر اضافی پیسے خرچ نہیں ہوتے ہاں لکھنے والے اور بنانے والے کی اپنے مذہب، دھرم اور اس کی اخلاقیات سے مضبوطی سے جڑے رہنے کا ضرور پتا چلتا ہے۔

ہمارے ہاں کسی نے بہت کیا تو خواتین کے رسالوں سے خواتین رائٹر کو لیا اور ان کی طویل مختصر کہانیوں اور ناول پر ڈرامے بنا لیے۔ وہ تحریریں گھر کے کاموں سے تھکی باری خواتین کے وقت گزاری کے لیے بہترین ہوتی ہیں۔ سماج کی بہتری یا کسی واضح پیغام کی اس سے توقع ہی کم کی جاتی ہے۔

ابھی تو اور ڈرامے آئیں گے

ممتاز تجزیہ نگار فرخ سہیل گوئندی جو ۳۸ مرتبہ پاکستان سے ترکی جانے کا ایک منفرد اعزاز رکھتے ہیں۔ ان کی رائے بالکل ایک مختلف منظر دکھاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا، ترکی میں بننے والے ڈرامے عرب دنیا، روس، مشرقی

یورپ اور دیگر ممالک میں اپنی منڈیاں بنا رہے ہیں۔ ان کی برآمد سے ترک میڈیا اربوں ڈالر کم رہا ہے۔ ان کے اس عمل سے ان کا نہ ایمان متزلزل ہوتا ہے اور نہ ہی عقیدہ کیونکہ وہ بلند اور مضبوط عقیدوں کے لوگ ہیں۔

ابھی تو ایک دو ڈرامے آئے ہیں پھر اور بھی آئیں



فرخ سہیل گوئندی

گے۔ پہلے ہم کہتے تھے کہ مغرب کی یلغار ہے۔ یہود و ہنود کے کلچر سے بچیں۔ جو قومیں علمی، فکری اور نظریاتی طور پر کمزور ہوتی ہیں وہ ہمیشہ بیرونی نظریات کے خطرات سے دوچار رہتی ہیں۔ ہم نے شاعری اور ادب میں کتنے نجیب عمر پیدا

کوئی پیسہ، کوئی سنسر بورڈ ہمیں روک کر دکھائے

۹۰ کی دہائی میں پونا میں انڈین سکول آف آرٹ میں پاکستانی ڈرامے دکھائے اور پڑھائے جاتے تھے۔ تب پاکستانی فلم پروڈیوسر اپنے کہانی کاروں کو دو تین انڈین فلموں کی کیسٹ دیتے اور مری جیسے کسی صحت افزاء مقام پر بٹھا کر دکھاتے اور ان کے کرداروں اور کہانی کو مقامی اداکاروں کے ساتھ بنا کر سینما گھروں میں دکھا دیتے۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں پاتے کہ جب لوگوں کو ۱۰ روپے میں اصل فلم زیادہ آزادی اور بولڈنس کے ساتھ دستیاب ہے تو چوری کی ڈری سہی فلم کیوں دیکھیں؟ دیکھتے ہی دیکھتے پاکستانی فلم نظروں سے ہی نہیں سینما گھروں سے بھی اتر گئی۔

۲۰۰۰ میں ڈش کا زمانہ آیا۔ ہفتہ میں ایک قسط والے ڈراموں سے روزانہ ڈرامے کی قسط تک کا سفر دیکھتے ہی دیکھتے طے ہو گیا۔ چینلوں کی بہار آئی اور وہ بھی ۲۴ گھنٹے نشریات کے ساتھ پہلے ٹی وی پر روز ایک ڈراما رات ۸ بجے سے ۹ بجے چلتا۔ ایک شام میں مقامی زبان میں ہوتا اور کبھی کبھی رات گئے ڈراما ۸-۸۲ یعنی طویل ڈرامے کسی منفرد موضوع پر خوبصورتی سے لکھے، بنے اور پیش کیے گئے۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، یونس جاوید، اصغر ندیم سید، جمیل ملک، حسینہ معین، انور مقصود، مرزا اطہر بیگ، بختیار احمد، سلیم احمد، ظہور احمد، عاشق عظیم، رؤف خالد، سلیم چشتی، فاروق قیصر، منو بھائی، فاطمہ ثریا بیجا۔ سوچیں تو کتنے ہی نام سامنے آتے ہیں اور آج دیکھنے ان میں سے کوئی ایک نام بھی نہیں اور نئے ناموں میں سے صرف عمیرہ احمد کا نام سامنے آیا ہے جس کی تحریر میں مثبت پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ ترکی ڈرامے کی وگنیرٹی کا جو لیول سامنے آیا ہے اب اس کو اپنانے کی دوڑ شروع ہو جائے گی۔ کوئی سنسر بورڈ، کوئی پیسہ ہمیں روک کر دکھائے!

کیے ہیں، کتنے محمود درویش اور مان پیدا کیے ہیں۔ ترکوں اور عربوں نے ادب اور شاعری میں بہت ترقی کی ہے۔ آج ہم انھیں صفائی کرنے کے لیے بلا رہے ہیں، اب ان کے ڈرامے بھی آگئے۔ یہ پہلے ہی ڈرامے ملین ڈالر کا چکے ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں ان کی وار ان بس یا میٹرو بس آگئی تو آپ کو اپنی ڈیو بس بھی نیازی بس جیسی لگے گی۔ ہم اپنے شہر کی صفائی کرنے کے بھی قابل نہیں ہیں۔ نظریات کی حفاظت کیا کریں گے؟ ترکی ہمیں اگر آٹو موبائیل کی ٹیکنالوجی دیتا تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔

اصل میں ہم Psychological Colonialism کا شکار ہیں۔ ہمارے ہاں سب سے زیادہ پڑھا لکھا وہ ہے جو انگریزی بولے، کم پڑھا لکھا وہ ہوتا ہے جو اردو بولے اور ان پڑھ وہ ہوتا ہے جو پنجابی بولے۔

طیب اردگان ترکی میں بولتا ہے جب کہ ہمارا وزیر اعظم چاہے انگریزی نہ بھی آئے تو بھی انگریزی میں لگا ہوتا ہے۔ میں اگر وزیر اعظم بنوں تو مجھے انگریزی آتی بھی ہو تو اردو میں بولوں گا۔ قوم بے زبان تو نہیں ہوتی۔ آج دنیا کا مسئلہ معاش ہے۔

آپ لوگوں کو روٹی دے دو لوگ کہیں گے پاکستان اچھا ہے، روٹی ترکی والے دے دیں وہ کہیں گے ترکی اچھا ہے۔ آپ پاکستان کو ایسا بناؤ کہ کل بھارت والے کہیں کہ ہمیں پاکستان بنا دو۔

میں اللہ کا شکر گزار ہوں۔ میں خود کو Extra ordinary ذہن نہیں سمجھتا مگر مجھ میں Clarity of ideas ہے۔ اس کی وجہ مطالعہ اور مشاہدہ ہے۔ کتاب سے ترکی پڑھا اور آنکھ سے دیکھا۔ میں ترکوں کا دوست ضرور ہوں لیکن پہلے میں پاکستانی ہوں۔ میں نے بھارت میں کہا تھا کہ میں بھارت سے دوستی پاکستان کے لیے چاہتا ہوں بھارت کے لیے نہیں۔

سپریم کورٹ آف پاکستان نے صحیح کہا کہ رینٹل پاور والے کیس میں کیا ہم ترکوں کو پاکستان بیچ دیں۔ میں

نے ترکوں، عربوں سے سیکھا ہے کہ اپنے وطن سے محبت کیسے کرتے ہیں؟

ہم تحریک خلافت کے زمانے سے ترکی کے ساتھ ہیں۔ ہم پاکستانیوں نے قبرص میں ترکوں کی حمایت کی۔ ہم پاکستانیوں نے سائپرس پر بلند اجوت کو سپورٹ کیا۔ ہمارا وزیر اعظم نواز شریف جب ۹۸ء میں ترکی میں زلزلہ آیا تو خود جہاز میں ساتھ گیا۔ ہم بے شک ترکی سے جڑے ہوئے ہیں مگر اپنا نقصان نہیں کرانا۔

آج کا ترکی

آج کا ترکی جس کی جڑیں بے شک اس کے ماضی میں پیوست ہیں مگر اس کی آنکھوں میں بہت دور کے خواب سمائے ہیں۔ اس کی ثقافتی یلغار کو سمجھنے سے پہلے نئے ترکی کی تفہیم بے حد ضروری ہے۔ ہمارے جو دوست وہاں کے اسلامی انقلاب سے شدید متاثر تھے، بار بار ایسے مواقع آرہے ہیں کہ ان سے جواب نہیں بن پاتا۔ یہ مشکل ترکی نے پیدا نہیں کی، خود انھوں نے اپنے آپ کو اس مشکل میں ڈالا ہے۔ ترک وزیر اعظم نے گزشتہ سال کی آخری سہ ماہی میں مصر کا دورہ کیا تو ارشاد فرمایا ”یہ ایک سیکولر ملک کے مسلمان وزیر اعظم کا مشورہ ہے۔“ وہ مصری صدر کی اپوزیشن سے بڑھتی ہوئی دویوں اور شکوک و شبہات کے پس منظر میں بات کر رہے تھے۔ یاد رہے کہ برسر اقتدار جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے پاس پارلیمنٹ میں ۳۲۷ نشستیں ہیں۔ ۲۰۰۱ء میں بنی اس پارٹی نے ۲۰۰۲ء میں ۳۲۷ سیٹیں جیتیں۔ عبد اللہ گل وزیر اعظم بنے۔ ۲۰۰۷ء کے الیکشن میں ان کو مزید سراہا گیا۔ سیٹیں ۳۴۱ ہو گئیں، جے ڈی پی اچھی سوچ کی ایک پرویورپ پارٹی ہے۔ پارٹی برسر اقتدار کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ عام لوگوں کی زندگی اور پسند ناپسند بھی بدل جائے۔

ممتاز سیاسی کارکن اور مصنف ڈاکٹر فرید احمد پراچہ نے کچھ عرصہ پہلے ترکی کا دورہ کیا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ترکی نے اس ڈرامے کے ذریعے جو پیغام بھیجا ہے۔

آپ تک تو وہ نہیں پہنچا ہوگا؟ وہ باخبر تھے اور پریشان بھی ان کا کہنا تھا حکومت ابھی بہت سی سطحوں پر بے بس ہے۔

پاکستان میں سرمایہ کاری

ترکی پاکستان میں پہلی بار سرمایہ کاری کر رہا ہے۔ پنجاب میں بڑے منصوبے ایسے ہیں جس پر ترکی کم سے کم ۵۰۰ ملین ڈالر خرچ کر رہا ہے۔ وہ کسی طرح کا رسک نہیں لے رہا، حکومتی سطح پر اگر روابط میں تسلسل اور مشاورت کا مسلسل عمل جاری ہے تو نجی سطح پر People to People contact کا موثر سلسلہ بھی جاری ہے۔ اس حوالے سے پاک ترک بزنس ایسوسی ایشن کا کردار بڑا نمایاں اور موثر ہے۔ اس کے چیف ایگزیکٹو سعدی یلدرم ہیں اور سیکرٹری تزکوچیت۔ یہ ایسوسی ایشن دونوں ممالک کے درمیان تجارتی سرمایہ کاری



سعدی یلدرم

معاشی و اقتصادی کو زیادہ گہرائی اور وسعت دینے پر کام کر رہی ہے۔ ان کی دعوت پر کئی ترک کمپنیاں یہاں آئیں اور بزنس کرنے کے لیے باہمی معاہدات کیے گئے۔ گزشتہ سال ۲۹ نامور کمپنیوں کے اعلیٰ عہدے داروں نے پاکستان کا ۴ روزہ دورہ کیا۔ اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ اول ترکی کا خواب کہ وہ ۲۰۱۳ء میں تیز تیز ترقی کے ساتھ دنیا کے دسویں بڑی معاشی طاقت بن سکے۔ اس کے آثار بہت واضح ہیں کہ گزشتہ ۱۰ برسوں میں معاشی استحکام اور ترقی کے باعث ترکی اس وقت دنیا کی ۱۵ ویں بڑی معیشت قرار دی جا رہی ہے۔ یورپ جس لمحے معاشی بد حالی کی زد میں تھا۔ یہ ترکی ہی تھا جو اس سے بچا رہا۔

مسلم دنیا کی ۱۰۰ بڑی کمپنیوں میں ۲۴ کا تعلق ہے۔ ترک ایئر لائن، زراعت، بینک، انڈسٹری، پٹرول آفس، اش بینک، اک بینک، اردبیر، نیکا ہولڈنگ، فنانس بینک، گولڈاش، ان کمپنیوں میں شامل ہیں۔ جو آنے والے وقت دنیا میں ترقی کرنے میں طے کرتی ہوئی زیادہ برتر مقام پر ہوں گی۔

دنیا کی ۱۰۰ بڑی کمپنیوں میں بھی ترکی کی کئی کمپنیاں شامل ہیں، جیسے بوئے وک ہولڈنگ، سہان جی ہولڈنگ، دوش ہولڈنگ، کوچ ہولڈنگ، دوان ہولڈنگ اور اولکر۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ترکی اور پاکستان نہ صرف جی ایٹ ۸-G کے ممبر ہیں بلکہ اقتصادی تعاون کی تنظیم (ای سی او) کے باعث بھی دونوں ممالک کئی معاہدوں میں بندھے ہوئے ہیں۔ اس وقت پاکستان ترکی کو چاول، لیدر، تیل، ٹیکسٹائل فیبرک، کھیلوں کا سامان اور طبی آلات بھجوا رہا ہے جب کہ ترکی پاکستان کو گندم، چنے، دالیں، ڈیزل، کیمیکل، ٹرانسپورٹ وہیکل، مشینری اور توانائی سے متعلقہ مواد بھجوا رہا ہے۔ ترکی کی کئی بڑی کمپنیاں پاکستان میں تعمیراتی

ہائی وے پراجیکٹ، پائپ لائنوں اور نہروں کے منصوبوں پر کام کر رہی ہیں۔ دونوں ملکوں کے درمیان ۲ بلین ڈالر تک کی تجارت ہو رہی ہے۔ لاہور اور انقرہ کے درمیان ہوائی سفر کے علاوہ ٹرین کے سفر پر کافی پیش رفت ہو چکی ہے۔ مقامی کرنسی میں تجارت، فری ٹریڈ زون اور ڈیوٹی کم کرنے پر بڑی سنجیدگی سے غور فکر ہو رہا ہے۔ پنجاب کی حد تک پاک ترک بزنس مین ایسوسی ایشن بڑی سرگرم ہے۔ لاہور میں جوہر ٹاؤن آفس کے علاوہ کراچی، اسلام آباد، کوئٹہ، پشاور میں بھی اس کی برانچیں کھولنے کے انتظامات ہو چکے ہیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور کے فارغ التحصیل اسلم بھٹی جو پی ٹی بی اے کے ڈپٹی سیکرٹری بھی ہیں۔ گزشتہ ۱۳ سال سے ترک دوستوں سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے تصدیق کی ہے کہ پنجاب میں ۷ بڑی کمپنیاں جن منصوبوں پر کام کر رہی ہیں۔ ان میں لاہور ویسٹ مینجمنٹ، لاہور پارکنگ، ٹریننگ سسٹم کی مکمل تبدیلی و اصلاح، ٹرانسپورٹ، توانائی

کے متبادل ذرائع، وکیشنل ٹریننگ کے علاوہ پولیس ٹریننگ شامل ہے۔ وہ چونکہ آفیشل ٹرانسلیٹر بھی ہیں جو ہر معاہدے اور ملاقات میں شامل ہوتے ہیں۔ وہ ترک سرمائے کی پاکستان آمد کے حوالے سے بے حد پُر امید تھے۔ انھوں نے ہمیں نجم الدین کیراولو سے ملوایا، وہ استنبول اور ازمیر کی ٹریفک پارکنگ کے منتظم رہے اور اب ان کی کمپنی UCS parking لبرٹی میں ماڈل پارکنگ کا نظام متعارف کرا چکی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے ۲۰ لاکھ ڈالر اپنی طرف سے لگا کر یہ نظام بنایا ہے اور ۲۱/۳ سے چلا رہے ہیں۔ اس سے پہلے فرانس کی ایک کمپنی نے تو ۵ ملین ڈالر لیے مگر وہ کوئی نظام پارکنگ بنانے میں ناکام رہی۔ انھوں نے کہا کہ ہم Sharing of Technology بھی کر رہے ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ Free of cost اس منصوبے کی

کامیابی کے بعد لاہور میں ۵۰۰ مزید جگہوں پر یہ ماڈل پارکنگ کا نظام لاگو ہوگا اور بے جگمگ ٹریفک میں ایک خاموش تبدیلی آتی محسوس ہوگی۔ ہماری کمپنی کا لوگو ہے Dozanlee d Govenlee محفوظ اور صاف ستھری پارکنگ مسکراہٹ کے ساتھ۔ ہم پیسا کمانے نہیں، پاکستانی عوام کو اپنا نظام دینے آئے ہیں۔ اس سے پہلے لاہور کے ماڈل سلاٹر ہاؤس میں چلنگ سسٹم لگا کر دیا ہے۔

نجم الدین کیراولو نے ایک بڑی اہم بات بتائی کہ موجودہ وزیر اعظم طیب اردگان استنبول کے ۸ سال کے میئر رہے۔ اس گندے شہر کو انھوں نے اپنی ٹیم کی مدد سے بہت خوب صورت بنا دیا۔ اسی دوران انھوں نے مستقبل کی صورت گیری کی اور اپنی ٹیم کا انتخاب کیا کہ کون کون کیا کیا کرے گا۔ اپنے عہدہ کاموں کی وجہ سے عوام میں حکومت کی مقبولیت تیسری ٹرم

ڈرڈر کر جینے میں سہولت ہے

غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ہر بار ڈرڈر کرنے اور ڈرڈر کر جینے میں ہمیں بہت سہولت ہے۔ الزام دینے کے لیے ہدف آسانی مل جاتا ہے۔ خود کرنے کا کام جب نہ کیا ہو تو کسی کو ولن کے کردار کو پیش کرنا کس قدر لطف دینے والا کام لگتا ہوگا۔ ہوش سنبھالا تو مغربی تہذیب نشا نے پر تھی اور ہر کوئی ہاتھ میں کنکر لیے اسے بڑا شیطان سمجھ کر ”ری“ کا فرض نبھا رہا تھا۔ مغربی تہذیب بری، لباس برا، زبان بری، انداز برے، اطوار برے، اخلاق برے، کردار برے، حد یہ کہ کاروبار کے معیارات اور انداز بھی برے۔ ردعمل سمجھنا مشکل نہیں۔ مغربی لباس پہننے والوں کا مسجد میں جانا تک مشکل ہو گیا۔ مغربی زبان بولنا معیوب اور لکھنا معیوب تر، اس میں فیل ہونا ایمان کا حصہ بن گیا۔ ادھر ان کے اخلاق، کردار اور اطوار تسخیر دنیا میں لگے تھے ادھر ہمیں ان کو روکنے کے لیے دلائل سے فرصت نہیں تھی۔ ان کے کاروباری معیارات دنیا نے معیار ٹھہرا لیے۔ ہمیں تب بھی سمجھ نہیں آتی کہ نفسیات والے کیوں کہتے ہیں کہ الزام دینے، رد کرنے اور برا کہنے کے بعد اگلی منزل اپنے ہی دشمن کو پسند کرنے اور اس کی پیروی کرنے کی ہوتی ہے۔ اس کا مظاہرہ صبح و شام ہم دیکھنے لگے۔

پھر ۸۰ء کی دہائی شروع ہوئی تو ہدف بھارتی تہذیب ٹھہری ان کی فلمیں، گانے، ڈرامے، کھلاڑی اور پھر بول چال! یہاں شان زیادہ جلدی سامنے آنے لگے۔ پہلے ان کی فلم دیکھنے لوگ اپنے ٹی وی اٹھا کر لاہور لائے تھے کہ مغل اعظم اور پاکیزہ دیکھ سکیں پھر چتر ہار کے لیے منگل کا دن طے ہوا تو دفاتر، کاروباری مراکز تک سے لوگ جلدی گھر آنے لگے۔ بظاہر دور درشن بہت جلد وی سی آر سے مات کھا گیا مگر وی سی آر پہ دیکھنے کے لیے سب کچھ انہی کا تھا۔ جنرل ضیاء کا قصور زیادہ تھا کہ جس نے وی سی آر عام کیا یا جنرل مشرف کا کہ جس نے ڈش سے کیبل کے سفر کو آسان اور عام کیا۔ نتیجے کے طور پر بیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اختتام یوں ہوا کہ ہمارے گھروں ہی میں نہیں تھیٹر میں بھی انہی کی فلمیں چل رہی تھیں۔ ڈرامے انہی کے کانوں کے بولوں پر ہو رہے تھے۔ شادیاں، لباس اور رسم و رواج ہی نہیں پگڑیاں، کلمے، شیر و انیاں، ساڑھیاں، سیلوئس کپڑوں تک آگئیں حتیٰ کہ دہنوں کے بازو ہی نہیں پیٹ بھی ننگے ہو گئے اور سب دیکھتے رہ گئے۔

میں بھی ۱۲۵۱ فیصد سے زیادہ ہے۔

عشق ممنوع کے سوال پر وہ مسکرائے اور بتایا کہ یہ ڈراما وہاں ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۸ء میں دو بار چلا۔ اسی طرح کے ڈرامے وہاں عام کلچر کا حصہ ہیں۔ سرکاری ٹی وی TRT پر نہیں آتے۔ ملک کے کلچر میں مثبت تبدیلیوں کے لیے فتح اللہ گولن کی تحریک نے ۸۸ نئے ٹی وی اسٹیشن قائم کیے ہیں اور ۴ ریوز پیپر شروع کیے ہیں تاکہ موجودہ حکومت کی سوچ کو عوام تک اچھے انداز میں پہنچایا جاسکے۔ ریجک ٹی وی بچوں کے لیے الگ سے آرہا ہے۔ مہتاب ٹی وی کلچرل ٹی وی ہوگا، ترکی میں ان دنوں جو ڈراما بہت مقبول ہے وہ ہے ”ویوک بلوشی“ دیکھیں اردو پیرہن میں آنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

ترکی کی موجودہ معیشت

ترکی کی موجودہ معیشت مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہے۔ گزشتہ ۱۰ برسوں میں ترقی کی شرح نہ صرف حیرت انگیز ہے بلکہ متاثر کن بھی ہے۔ ترکی چین کے بعد دنیا کی دوسری بڑی برق رفتاری سے ترقی کرنے والی معیشت ہے۔ فی کس

سیاسی و معاشی استحکام کے بعد دنیا پر ترک ثقافتی یلغار کیا رنگ لائے گی؟

آمدن ۱۵۰۰۰ ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔ جس سے ملک بیروزگاری کا خاتمہ، صنعت کی بحالی اور ترقی ہوا۔ ترکی اپنی برآمدات کو ۵۰۰ بلین تک بڑھانے کے لیے کوشاں ہے۔ اس کا جی ڈی پی ۸۰۰ بلین ڈالر تک چکا ہے۔ ترکی اپنے جہاز بنانے کے منصوبے پر کام کر چکا ہے۔ یورپ کی چھٹی مضبوط معیشت بن جانے والے ترکی اس وقت یورپی یونین میں سب سے بے بسی بنانے والا ملک ہے۔ ترکی کی اس تیز رفتار صنعتی ترقی کا ساتھ دینے کے لیے ترکی کے اعلیٰ تعلیمی ادارے ہر سال ۵ لاکھ طلبہ و طالبات کو فارغ التحصیل کر رہے ہیں۔ مختلط اندازے کے مطابق گزشتہ ۱۰ برسوں میں ترکی

ٹی وی چینل پر ہمیشہ ریموونگ کریم والوں کی طرف سے ماڈلنگ کے پردے میں لڑکیوں کے بیوٹی کمپلیکیشن ہونے لگے یہاں تک کہ ان گھروں کی لڑکیاں مختصر ترین کپڑوں میں ریپ پر چلنے لگیں جہاں کبھی پوری فلم تو کیا پورا اشتہار بھی ریموون کنٹرول کے بغیر دیکھا نہیں جاتا تھا۔ ۲۰۱۲ء میں پاکستانی میڈیا نے ایک نیا تحفہ قوم کو یہ دیا کہ خبروں کی پیش کش اور انداز ہی بدل ڈالا۔ ایک دن آیا جب ٹی وی سکرین پر ایک چینل پر خبروں میں منی بدنام ہونے لگی پھر دوسرے میں شیلہ کی جوانی دکھانے کے لیے کمر کی بھی ضرورت نہ رہی۔ انٹرنیٹ کے ٹیلپ چلائے اور ان غلیظ ترین بولوں والے گانوں کے کلیپس دکھادیے جس کا کانوں پر پڑنے کا کبھی امکان تک نہ تھا۔ اس انٹرنیٹ میں ایسے ایسے ماہرین متعارف ہوئے جو لڑکیوں کو پورے ملک کے سامنے بتاتے ہیں کہ ریپ پر یوں چلنا ہے جیسے تمہارے سامنے کھڑا ہوا تمہارے بلی بٹن سے بندھی تار کو کھینچ رہا ہو اور تم سیدھی اس کی طرف کھینچی جا رہی ہو۔ یہی چلنے کے انداز کی معراج ہے۔ یاد رہے بلی بٹن کسی قمیص، شرٹ یا شیر وانی کے اوپر لگا ہوا بٹن نہیں، انسانی جسم پر بنا ہوا وہ قدرتی سوراخ ہے جو قدرت نے تو بچے کی خوراک لینے کے لیے بنایا تھا۔ اس عہد کی تہذیب نے اس میں پہلے رنگ پرورے، پھر وہاں گلینے لگائے اور آخر میں اسے سیکس اپیل کا سبیل بنا دیا پھر خوبصورتی کے معیار کا حصہ بنا کر اسے سب پر یوں کھول دیا جیسے وہ کبھی ڈھانپا ہی نہ گیا ہو۔ مرحوم اشفاق احمد بڑے دکھ سے کہا کرتے تھے کہ ”مضبوط معاشرتی اقدار کے بنیادی جانے والی تعلیم سے فارغ ہو کر آنے والے میڈیا کے نوجوانوں نے ماڈرن بننے کے چکر میں بے خیالی میں ہی سہی ”ڈھنی کلچر“ کو لوگوں پر مسلط کر دیا ہے۔“ اس تہذیب نے جسے بھی بھارتی تہذیب کہا گیا کبھی ہندو تہذیب، کبھی گلوبل وینج کے اثرات کے نام سے موسوم کیا گیا، ۳۰ سال میں قلب و ذہن کو تسخیر کرتے ہوئے سکھ رائج الوقت کا مقام پالیا اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔

ہوئی معیشت اور معاشی ترقی کی تعریف کرتے ہوئے اسے شاندار ترقی کہا اور توقع ظاہر کی ہے کہ ”ترکی اس رفتار سے ترقی کرتا رہا تو چند برسوں میں دنیا کی ۱۰ ویں بڑی معاشی طاقت بن جائے گا۔“

خطے میں بڑھتا ہوا ترک کردار

ابھی حال ہی میں ترکی کے مشہور شہر انقرہ میں

۱۰۰ فیصد سے زائد ترقی کی ہے۔ ہر سال ۳۰ بلین سیاح ترکی آ رہے ہیں۔ سیاحت کے حوالے سے دنیا کا ساتواں بڑا ملک بن چکا ہے۔ گزشتہ ۴ سال میں نہ صرف پورے یورپ میں سب سے زیادہ کپاس پیدا کی ہے ساتھ میں سب سے کمشل ویکو تیار کر کے الگ سے نام کمایا ہے۔ صرف افریقہ سے ۱۶ بلین کا بزنس کیا ہے۔ اسی وجہ سے امریکی کامرس سیکرٹری جوہن کری سن نے ترکی کی بڑھتی

سلطنت عثمانیہ کا آغاز

سلطان علاؤ الدین سلجوقی کی فوج کے ایک سردار ارطغرل نے اس کے نائب کے طور پر بڑا نام کمایا۔ اسی نے سلطان کے علم میں موجود ہلال کے نشان کو اپنایا جو آج بھی ترکوں کی عظمت کا قومی نشان ہے۔ ارطغرل نے ۱۲۸۸ء میں وفات پائی اور مسعود کے قریب دفن ہوا۔ اس کا بڑا بیٹا عثمان کا جاں نشین ہی نہیں دولت عثمانیہ کا بانی اور سلطنت عثمانیہ کا پہلا تاجدار کہلایا۔ اس نے اپنے عہد حکومت (۱۳۲۶-۱۲۸۸ء) میں کبھی سلطان کا لقب اختیار نہیں کیا بلکہ ایر کہلایا اور بے شمار خود سر حکومتوں کے قائم ہونے کے باوجود آخر تک سلطان تونیک کا وفادار اور جاگیر دار رہا۔ دولت سلجوقیہ دوم توڑ رہی تھی۔ ایشیائے کوچک میں طوائف اعلیٰ کی پھیلی ہوئی تھی۔ ان فتوحات کا دائرہ وسیع کرنے کا جو موقع قدرت دے رہی تھی۔ عثمان اول نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اس کی جاگیر سے متصل بازنطینی علاقوں میں شہنشاہ قسطنطین سے ایک سیاسی غلطی ہوئی، جس کے نتیجے میں ترک تھیمینیاں (Bethynia) کے میدانوں میں داخل ہو گئے۔ جلد ہی اس نے قریبہ حصار کا قلعہ فتح کر لیا۔ سلطان علاؤ الدین نے قریبہ حصار اور وہ تمام زمین جو اس نے نبرد شمشیر حاصل کر لی تھی۔ ”نیزبک“ کے خطاب کے ساتھ اسے دے دیں۔ خطبہ جمع میں اپنا شامل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا سکہ جاری کرنے کی اجازت بھی دے دی یوں بادشاہی کے تمام اختیارات عثمان کو مل گئے۔ ۱۳۰۰ء میں تاتاریوں نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا تو سلطان علاؤ الدین مارا گیا۔ تاتاریوں نے اس کے بیٹے غیاث الدین کو بھی مار دیا۔ دولت سلجوقیہ کا خاتمہ ہوا اور عثمان نے ایک خود مختار فرماں روا کی حیثیت اختیار کر لی۔ متواتر فتوحات سے زیادہ عثمان کا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے سلطنت عثمانیہ کی بنیاد (۹۸-۱۲۹۱ء) کے عرصے میں محکمہ قائم کیے۔ رعایا کی فلاح کے کام کیے۔ اپنے بیٹے اور خاں کی فوجی تربیت کی۔ تاتاریوں کو شکست دی اور ۱۳۱۷ء میں بروصہ پر قبضہ کر لیا۔ بستر مرگ پہ اسے یہ خوشخبری ملی۔ اس نے اسی شہر کو سلطنت عثمانیہ کا دار الحکومت بنانے اور خود کو یہیں دفن کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے اور خاں کو جاں نشین مقرر کیا اور عدل و انصاف اور مخلوق سے بھلائی کی ہدایت کی۔ چنانچہ اسے بروصہ میں دفن کیا گیا اور ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا۔ اس نے ۳۸ سال حکومت کی یونانی اور سلاوی باشندوں کی ایک بڑی تعداد بخوشی مسلمان ہو کر ترکوں میں شامل ہو گئی۔ فلاح اور مفتوح کے درمیان معاشرتی تعلقات بھی استوار ہونے لگے۔ دونوں کے میل ملاپ اور شادی بیاہوں کے نتیجے میں جو نسل تیار ہوئی آنے والے دنوں میں ”عثمانی“ کہلائی۔ اور خاں کے بیٹے مراد اول نے صرف ۳ برسوں میں سلطنت کو ۵۰ گنا بڑھا دیا۔ کرلیس نے لکھا ہے کہ ۱۳۸۱ء میں اس نے اپنے فوجی سپاہیوں کے لیے سرخ پرچم تجویز کیا اور پھر یہی رنگ عثمانی فوج کا قومی رنگ ہو گیا۔ مراد کا عہد ۳۰ برسوں پر محیط ہے اس میں بلغاریہ، سر دیا، بوسنیا، نیکری فتح ہوئے۔ وہ اپنے عہد کا بہترین مدیر حکمران تھا۔ محمد فاح اور سلمان اعظم کے بارے میں معلومات زیادہ دستیاب ہیں مگر مراد کی فتوحات اور نظام پانچ صدیاں قائم رہا۔

ایک سہ ملکی سمٹ کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں پاکستان، ترکی اور افغانستان کے صدور نے شرکت کی، بظاہر یہ ایک عام سی خبر تھی۔ مگر یہ کانفرنس اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ امریکا افغانستان سے انخلا کے جس پروگرام پر عمل پیرا ہے۔ اس میں روس کی طرح واپسی کے بعد خلا کی گنجائش نہ چھوڑنے کی ابھی سے منصوبہ بندی جاری ہے۔ ترکی امریکا کا ہمیشہ قابل اعتماد دوست رہا ہے۔ اسلامی دنیا میں ترکی اور ملائیشیا نہ صرف سو فٹ چہرے کے حامل ہیں بلکہ بہت سی جگہوں پر آسانی سے قابل قبول بھی ہیں۔ افغانستان کے معروضی حالات اور پاکستان سے اس کے تعلقات کے پس منظر میں یہ سوچنا بالکل بے جا ہوگا کہ پاکستان کا بھی وہاں کوئی کردار ہوگا۔ دونوں ممالک بد اعتمادی کی جس خلیج کے کناروں پر کھڑے ہیں وہاں کسی موثر سیاسی، سماجی، کاروباری یا فوجی کردار کے بظاہر کوئی امکانات نظر نہیں آتے۔ ایسے میں امریکا ایک ایسے اتحادی

کو آگے لانے کا متمنی ہوگا، جو اس کے مفادات کا تحفظ بھی کرے اور افغانستان کے لیے قابل قبول بھی ہو۔ ترکی افواج نیٹو کا بڑا اہم حصہ ہیں اور شروع سے فوجی دستے افغانستان میں موجود ہیں۔ امریکا کے بعد ترکی زیادہ بڑے ایجنڈے اور مرتبے کے علاقے میں بروئے کار ہوگا۔ وقت وقت کی بات ہے کہ زمانہ تھا ترکی خلافت کو بچانے کے لیے برصغیر میں تحریک خلافت برپا تھی اور لوگ اپنا زور تک انھیں بھجوا رہے تھے ترکی کے لوگ اس تعلق اور محبت کو آج تک نہیں بھولے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب مدد ترکی کی طرف سے آرہی ہے، چاہے معاشی ہو یا ثقافتی۔ اس سال عید قربان ۱۵ ہزار گایوں کا گوشت تک وہاں سے آیا، جس کی خاطر اعلیٰ نے بڑی تعریف کی، بے شک ترکی کا وژن بڑا ہے۔ سوچ بڑی دور کی ہے۔ بقول جناب رؤف طاہر، وہاں بڑی مفاہمت اور احتیاط سے چل رہے ہیں۔ ان

سے توقع نہ کریں کہ خلیفہ الحق کے دور جیسے عمدہ ڈرامے بنائیں گے۔ وہ سوسائٹی بہت آزاد خیال ہے ہاں اچھے مناظر ابھر رہے ہیں مگر ان کی رفتار دھیمی ہے۔ ایک موثر طبقے کی رائے یہ بھی ہے کہ موجودہ ترکی کی ثقافتی لہر کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے یہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ جس میں ترکی کے مذہبی کرداروں کو اجاگر کرنے کے بجائے سیکولر چہرے کو نمایاں کیا گیا ہے چونکہ عام لوگ اسی کو پسند کرتے ہیں۔ ثبوت مانے ہے کہ کس قوت اور شدت کے ساتھ لوگ اس کی تہذیبی برتری اور خوبی کے قائل اور گھائل ہو گئے ہیں۔ ترکی کی طرف سے یہ حربہ اس سے پہلے یورپ، افریقہ اور عرب دنیا پر آزمایا جا چکا ہے اور وہاں اس نے کامیابی سے دونوں اہداف حاصل کیے ہیں۔ کاروباری وسعت بھی ہوئی ہے اور معاشرے میں مقبولیت بھی ملی ہے۔ ڈرامے بھاری قیمتوں پر فروخت ہوئے اور ترکی

کے لیے ہر جگہ ایک نرم گوشہ پیدا ہوا ہے۔ ہم برسوں سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے زمانہ بدلتا دیکھ رہے ہیں، کبھی پاکستان عالم اسلام کا لیڈر ہوتا تھا۔ آج یہ مقام ترکی کے پاس ہے اور ہر آنے والا دن اس کی قیادت اور راہنمائی پر مہر تصدیق ثبت کر رہا ہے۔ دنیا میں فیصلے مذہب کی بنیاد پر نہیں معیشت کی بنیاد پر ہوتے ہیں یا طاقت کی بنیاد پر۔ دوسرے لفظوں میں فیصلے طاقت کرتی ہے یا بھوک۔ آج بڑی طاقتیں بھوک دکھا کر فیصلے کراتی ہیں۔ ممکن ہے ترکی کا معاملہ ایسا نہ ہو۔ ان کی ہم سے محبت بے لوث ہو۔ ان کی معاشی سرگرمیاں بھی ہمارے فائدے کے لیے ہوں مگر یہ تو کسی طور لازم نہیں کہ ۲۰۱۳ء کی اس بڑی معاشی طاقت کی تحسین کے ساتھ ساتھ اس کی ثقافتی یلغار کے سامنے بھی خاموشی اختیار کر لی جائے۔ بیچاری ڈراما انڈسٹری ہی نہیں پاکستانی اقدار اور اخلاقیات کو بھی بے موت مرنے دیا جائے۔ ہمارے ہاں کی کوئی حد تو ہونی چاہیے۔

مولانا روم اور عشق ممنوع

ترکوں نے دنیا کی تاریخ اور جغرافیہ پر ہی نہیں معاشرت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ مولانا جلال الدین رومی کی سوچ و فکر کو دنیا کے ہر خطے میں ترکوں کا اعلیٰ اخلاقی و علمی اثاثہ مانا جاتا ہے۔ انگریزی میں مولانا روم اور ان کی تعلیمات پر لکھی کتابوں کی کثرت دیکھ کر کبھی کبھی تو حیرت ہوتی ہے۔ امریکی انھیں یوں ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں جیسے وہ انہی کے مفکر (Intellectual) ہوں۔ ترک معاشرت کے پس منظر میں لکھے اشعار اور کہی ہوئی مثنوی کا اسلامی لٹریچر میں بھی بے حد اہم مقام ہے۔ علامہ اقبال انھیں مرشد رومی کہتے اور خود کو مرید ہندی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے ہاں مثنوی صرف فال نکالنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ عقل و دانش کی باتیں دوسروں کے لیے رکھ چھوڑی ہیں۔ مولانا کہتے ہیں: ”ایک ترک جسے اپنی عقل و بصیرت پر بہت ناز تھا۔ داستان گو سے کہنے لگا کہ دعا و فریب اور مکر تو سب درزیوں کا شہو ہے۔ مجھے کسی گرو کا نام بتاؤ جس کو میں ناکام بناؤں۔ داستان گو نے بتایا کہ پورش زیادہ نامی گرامی ہے، ورنہ تو ایک سے ایک عیار درزی موجود ہیں ہاتھ کی ایسی صفائی دکھاتے ہیں کہ کپڑا تو کپڑا، آنکھوں کا کاجل تک چرائیں اور پتا بھی نہ چلنے دیں۔ ترک کہنے لگا مجھ سے شرط لگا لو، دیکھتا ہوں وہ مجھے کیسے دھوکا دیتا ہے؟ وہ عیار ہے تو میں بھی بڑا ہوشیار ہوں۔ بحث کے بعد گھوڑے گھوڑے کی شرط لگ گئی۔ ترک نے پوری تیاری کی، درزی کے ہتھکنڈوں سے بچنے کی ممکنہ تدابیر کرنے کے بعد استنبول کے بنے ہوئے قیمتی اطلس کا ایک ٹکڑا لیا اور درزی کی دکان پر پہنچ گیا۔ درزی ترک کا ہک کو دیکھ کر تعظیم سے کھڑا ہو گیا۔ بولا زہے نصیب! آپ میری دکان پر تشریف لائے یہ بڑے فخر کا مقام ہے۔ حکم فرمائیے کیا خدمت کروں؟ ترک نے اطلس سامنے کی اور اپنی قبائین کی فرمائش کی۔ درزی نے کپڑا گز سے ناپا اور پھر اس کو کاٹنے کے لیے جگہ جگہ نشان لگا

دئے۔ پھر کام کے ساتھ ساتھ دلچسپ قصے سناتے لگا۔ بڑے بڑے رؤسا کے قصے، ان کی سخاوت کی باتیں، بخیلوں کی کہانیاں کہ سن کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔ درزی نے ایک ایسی حکایت سنائی کہ ترک ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گیا۔ درزی نے جھٹ سے ایک ٹکڑا ناگ کے نیچے ایسے چھپا لیا کہ سوائے خدا کی ذات کے کوئی نہ دیکھ سکا، پھر اس نے اس سے بھی دلچسپ قصہ سنانا شروع کیا، ترک ہنسی کے مارے اپنا چہرہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ درزی نے دوسرا ٹکڑا بھی چھپا لیا۔ درزی خاموش ہوا تو ترک بولا، طبیعت ابھی بھری نہیں تو کوئی اور قصہ بھی سناؤں۔ درزی کے ہاں ایسے قصوں کی کیا کمی تھی۔ اس نے پھر چرب زبانی کا مظاہرہ کیا۔ ترک اتنا ہنسا کہ آنکھوں سے پانی رواں ہو گیا۔ ہوش و حواس رخصت ہو گئے۔ اس بار درزی نے اطلس کی پٹی نیچے میں اڑس لی۔ چوتھی بار فرمائش ہوئی درزی نے معذرت کر لی کہ حضور اطلس تو بچا نہیں میں بھی تھک گیا ہوں۔ آپ کو بھی کئی کام ہوں گے، پھر بھی سہی۔“ یہ مثنوی معنوی کی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ کہانی سے زیادہ مولانا روم نے اس کے جو نتائج نکالے ہیں وہ اہم ہیں۔ ان کی کوئی کہانی بے مقصد نہیں تھی۔ ہر کہانی میں سے کوئی ایسا سبق ضرور ہوتا جو دلوں کے تاریچھیر دیتا۔ مثلاً اس کہانی کے آخر میں وہ کہتے ہیں: ”اے عزیز! اس حقیقت پر غور کرو وہ ترک کون ہے اور دعا باز درزی کون، وہ اطلس کیا ہے اور ہنسی مذاق کیا؟ سن اے غافل! ترک تیری ذات ہے، جسے اپنی عقل و خرد پر بڑا ناز ہے مگر یہ عقل بڑا دھوکا کھانے اور دینے والی چیز ہے۔ وہ عیار درزی یہ دنیا ہے۔ اطلس کی قبا جو تجھے تقویٰ، بھلائی اور نیکی کے لیے سلائی تھی، فضول قہقہوں اور قصوں میں تباہ و برباد ہو گئی۔ اطلس تیری عمر ہے، ہنسی مذاق جذبات ہیں۔ تیری عمر کی اطلس پر درزی کی فینچی دن رات چل رہی ہے اور تیرا دل لگی کا شوق تیری غفلت ہے۔ اے عزیز! اپنے ہوش و حواس درست کر، ظاہر کو چھوڑ، باطن کی طرف توجہ دے، تیری عمر کی اطلس لیل و نہار کی فینچی سے دنیا کا مکار درزی ٹکڑے کر کے چرائے جا رہا ہے اور تو ہنسی مذاق میں مشغول ہے۔ کل کا درزی آج کا میڈیا اور عشق ممنوع ہے۔ مولانا روم زندہ ہوتے تو ضرور ایک نئی اور خوبصورت حکایت لکھتے۔ ہم سے تو ایک ڈھنگ کی حکایت بھی نہیں لکھی جاتی۔

آج کی مسلم دنیا کے
نوجوانوں کا سب سے بڑا کریئر

ماہر زین

جس نے نشید (عربی حمد و ثنات) کو
دنیا میں دی بلندی، ایک نئی پہچان



ولی زاہد

KSOCITY.COM

مذہبی گائیکی جس کو عربی میں نشید کہا جاتا ہے۔ آج کل نوجوان نسل میں بہت مقبول ہے۔ اسلام سے تعلق رکھنے والے آج کی دنیا کے نمایاں فنکاروں میں جو اسلامی دنیا کے نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا کریز بن چکے ہیں۔ سوئڈن کے ماہر زین، برطانیہ کے سمیع یوسف، کینیا کے زین بیکھا، کویت کے مشاری الفاسی اور شارحہ کے احمد بخاطر کے نام آتے ہیں۔ اردو ڈائجسٹ آپ کے لیے ہر ماہ ایک فنکار کی زندگی اور کام کا احوال پیش کرے گا۔ جس کو پاکستان کے نمایاں صحافی اور ٹریڈرولی زاہد تحریر کر رہے ہیں۔ اس ماہ باری ہے سب سے نمایاں فنکار ماہر زین کی۔

جونہی

یوٹیوب پر امریکی اور برطانوی گلوکاروں کا کوئی نیا گانا یا البم ریلیز ہوتا ہے، ایک ہی ہفتے میں اس کے

ناظرین کی تعداد کروڑوں میں پہنچ جاتی ہے۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ ایک حمد، نعت یا نشید کو بھی اتنے ناظرین دیکھ یا پسند کر پائیں؟ دو تین برس پہلے شاید ایسا ممکن نہ تھا۔

پھر آیا ماہر زین، اس نے دیکھتے ہی دیکھتے نشید کو بھی عوام کی پسندیدگی کی اسی منزل تک پہنچا دیا۔ ماہر زین کون ہے؟ وہ سوئڈن سے تعلق رکھنے والا

ماہر کی فیس بک پر ۷۰ لاکھ سے زائد مداح ہیں یہ دنیا میں کسی بھی مسلمان فنکار کے مداحوں سے زیادہ ہیں

ایک گلوکار ہے۔ طرابلس، لبنان میں ۱۹۸۱ء میں پیدا ہوا۔ ایروناٹیکل انجینئر بنا اور موسیقی کے میدان میں آگیا۔ اس کا مراکش نژاد سوئڈن پر ڈیوٹر ریڈون (Redone) جب نیویارک گیا تو یہ بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ سوئڈن واپسی پر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عام گلوکار نہیں بلکہ اسلامی موضوعات پر بالخصوص حمد و نعت پر اپنا تشخص بنائے گا۔

۲۰۱۰ء کے آخر تک ماہر زین ملائیشیا میں سب سے زیادہ Google کیا جانے والا فن کار بن گیا۔ سب سے

زیادہ کامیابی بھی ماہر زین کو ملائیشیا میں ملی۔ اس کو وارنر میوزک ملائیشیا نے ۸ پلاٹینیم ایوارڈ دیے۔ Thank you Allah۔ کو سوئی میوزک انڈونیشیا نے ڈبل پلاٹینیم ایوارڈ دیا۔ ماہر زین کی نشید زیادہ تر انگریزی میں ہیں لیکن وہ زیادہ پسند کیے جانے والی نشیدوں کو تیزی سے دوسری زبانوں میں بھی منتقل کرتا ہے۔ مثلاً اس کی نشید ”ان شاء اللہ“ فرانسیسی، عربی، ترکی، ملائشین اور انڈونیشین زبانوں میں بھی پسند کی گئی ہے۔ اسی طرح معروف پاکستانی گیت ”اللہ ہی اللہ کیا کرو“ جو کبھی ناہید اختر نے گایا تھا، ماہر زین نے اردو میں پاکستانی نژاد کینیڈین عرفان مکی کے ساتھ مل کر گایا۔

۲۰۱۲ء میں ماہر زین نے اپنی دوسری البم ریلیز کی جس کا نام ”Forgive Me“ ہے۔ اس البم کی نشیدوں نے بھی خوب دھوم مچائی۔ ماہر نے ۲۰۰۹ء میں فلسطین آزاد ہوگا، پر ایک گیت بھی گایا اور ۲۰۱۱ء کے عرب ممالک میں آزادی کی لہر پر ”فریڈم“ کے نام سے بھی گانا اور ویڈیو ریلیز کیا۔

ماہر زین کے فیس بک پر تقریباً ۷۰ لاکھ مداح ہیں یہ تعداد کسی بھی دوسرے مسلمان فنکار کے مداحوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔ یوٹیوب پر ہر ویڈیو کے لاکھوں ویوز ہیں۔ ماہر کا فیس بک کا صفحہ ہر وقت تازہ اطلاعات سے بھرا رہتا ہے۔ منٹوں بلکہ سیکنڈوں

کے اندر ہزاروں مداح اس کی پوسٹ پر تبصرہ کرتے ہیں۔



ماہر زین کی آواز میں بلا کا جادو اور چمکی ہے

کی ویڈیو گرافی اور کانوں کے لیے بہت بھلی موسیقی۔

۲۔ ”ان شاء اللہ“۔ اس نشید میں اُمید کا پیغام ہے ان لوگوں کے لیے جو زندگی سے مایوس ہو چکے ہیں، نشے میں مبتلا ہیں یا ظلم و جبر کر رہے یا گناہ کی زندگی سے پریشان ہیں۔

۳۔ ”The Chosen one“۔ یہ ویڈیو ہمیں حضور اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی یاد دلاتی ہے کہ کس طرح آپ ﷺ اُس عورت کی عیادت کے لیے جاتے ہیں جو ہر روز آپ پر کوڑا پھینکتی ہے۔

۴۔ ”الحمد للہ“۔ یہ صرف آڈیو میں دستیاب ہے۔

۵۔ ”For the rest of my life“۔ از دواجی موضوع پر ہے۔

۶۔ ”I Believe“۔ یہ نشید ماہر نے پاکستانی نژاد کینیڈین عرفان مکی کے ساتھ مل کر گائی ہے۔

۷۔ ”No I forme“

۔ اس کا موضوع

ماں ہے۔

۸۔ ”اللہ ہی اللہ

کیا کرو“۔ ۷۰، ۸۰

کی دہائی کا یہ معروف

گیت ہے۔ ماہر نے

اس کو نئی زندگی دی

ہے۔

ماہر صرف گلوکار ہی نہیں وہ اپنی موسیقی کا برانڈ ایمپیسڈر بھی ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں جاتا ہے وہاں مداحوں کے ساتھ تصاویر اتارتا اور انھیں اپنے ہر پل کی خبر دینا بھی شامل ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ماہر کے سر پر بال نہیں ہیں اس لیے آپ اس کو ہر ویڈیو میں ٹوپی یا ہیٹ پہنے دیکھیں گے۔ بالوں کی کمی اس کی مردانہ وجاہت نے پوری کر دی ہے۔ اگر ماہر گلوکار نہ ہوتا تو وہ آسانی سے بین الاقوامی ماڈل یا ہالی وڈ میں اداکار ہو سکتا تھا۔

ماہر زین کی آواز میں بلا کا جادو اور پختگی ہے وہ اپنی ویڈیو میں جس میں وہ خود ایپیر (Appear) ہوتا ہے کمال اور پر وقار طریقے سے نظر آتا ہے۔

میں ایک ٹرینر ہوں۔ ورکشاپس میں وقفوں کے دوران موسیقی کا استعمال ہمارے پیشے میں کافی عام ہے۔

جب سے ماہر زین اور اس سے پہلے سمیع یوسف اور احمد بخاطر کی نشید منظر پر آئی ہیں اپنی ورکشاپس میں، میں انھی کا استعمال کرتا ہوں۔ میرے شرکاء ان کے ساتھ اللہ کی حمد کرتے ہیں اور نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔

پسندیدہ نشید: ماہر زین کی درج ذیل نشید اور ان کی ویڈیو میری سب سے زیادہ پسندیدہ ہیں۔

۱۔ یا نبی ﷺ سلام علیک۔ اس کا انٹرنیشنل ورژن اور

عریبک ورژن دونوں یوٹیوب پر موجود ہیں۔ انٹرنیشنل ورژن

میں اردو حصہ بھی ہے۔ اس نشید میں ماہر جہاں جہاں جاتا

ہے وہاں ایک چھوٹے سے لفافے میں ”صل علی الحبیب“

لکھا ہوا چھوڑ جاتا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی نور پھیل جاتا ہے

اور لوگوں کی تکالیف دور ہو جاتی ہیں۔ لا جواب تھیم، کمال

اس کی پہلی البم ”Thank you Allah“ کے نام سے

نومبر ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی جس میں ۱۳ نشید

تھیں۔ اس کے پروڈیوسر Awakening Record نے

فیس بک اور یوٹیوب کو استعمال کیا اور کچھ ہی مہینوں

میں اسلامی اور عرب ممالک میں اس کے لاکھوں

مداح بن گئے۔ اسی طرح مغرب میں رہنے والے

نوجوان لڑکے، لڑکیاں ماہر زین کے دیوانے ہو گئے۔

ان کیلئے تحفہ خاص جن پر دولت بارش کی طرح برستی ہے

غریبوں کے سر جی ارب پتی

جو خدمت خلق پر خرچ کرتے ہیں۔ وہی خوشی پاتے ہیں



آج کے حاتم پتی

کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں؟

امریکی رسالہ فوربس وقتاً فوقتاً
امیر ترین شخصیات کی فہرستیں شائع
کرتا ہے۔ چند ماہ قبل رسالے کی

انتظامیہ نے ایسے ۱۶۱ ارب پتیوں کی کانفرنس منعقد کرائی
جو اپنی دولت کے ذریعے دنیا سے غربت، جہالت اور
بیماریاں ختم کرنا چاہتے ہیں۔

ان ۱۶۱ امراء میں ۶ امریکی دولت مند.....
وارن بفت، بل گیٹس، میلنڈہ گیٹس، سٹیوکیس، ڈیوڈ رینشٹین
اور لیون بلیک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اب تک نوع
انسانی کے مسائل حل کرنے کی خاطر ۱۰۰ ارب ڈالر
(۹۶۰۰ ارب روپے) کی خطیر رقم خرچ کر چکے۔ دوران
کانفرنس ایک دن یہ ۶ مخیر ہستیاں جمع ہوئیں اور انھوں
نے خدمت خلق کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی۔ اس
مذاکرے کے منتخب حصے پیش ہیں۔

میزبان..... ایک بڑا سوال یہ ہے کہ کیا کامیاب
لوگوں کی یہ اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ فیاضی کا مظاہرہ
کریں؟ یعنی یہ کہ مجھے نیکی کرنے چاہیے یا یہ عقلی فیصلہ
ہے کہ ہاں، نیکی کرنا مجھ پر فرض ہے؟

میلنڈہ گیٹس:- میرے خیال میں دونوں باتیں اہم
ہیں۔ انسان جب بھی کچھ دے تو اسے دل سے یہ عمل کرنا
چاہیے۔ کم از کم میرے نزدیک خدمت خلق کی یہ بہت بڑی
خوبی ہے کہ اس کی بدولت دنیا گھومنے اور اجنبیوں سے
بات چیت کا موقع ملتا ہے۔ لوگوں سے ملنے ملانے کے
ذریعے ہی مجھے علم ہوا کہ تمام انسانوں کی ضروریات ملتی جلتی
ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں مقیم ہوں۔ بہر حال
میں جذباتی طور پر ہی خدمت خلق سے زیادہ وابستہ ہوں۔

لیکن عقل سے کام لینا بھی ضروری ہے۔ دماغ ہی
آپ کی رہنمائی کرتا ہے کہ آپ اپنی دولت کے ذریعے

ایک فرد سے لے کر لاکھوں افراد تک کی زندگیاں
بدل سکتے ہیں۔ عقل ہی بتاتی ہے کہ دولت کیونکر
کی جائے تاکہ وہ موثر اثرات مرتب کرے۔

ڈیوڈ رینشٹین:- میں میلنڈہ کی باتوں سے اتفاق
ہوں۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ اول خدمت خلق کے واسطے
دے کر انسان دلی مسرت اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔
اس کی ذہنی و جسمانی صحت بہتر ہوتی اور عمر بڑھتی ہے۔

دوسرے اس طرح کسی دکھیارے کی مدد بھی ہو
سکتی ہے۔ گو آپ کو عموماً اس امر کا پتا نہیں چلتا مگر آپ کی دلی
رقم لوگوں کی زندگیوں میں ضرور تبدیلی لاتی ہے۔ دراصل
مصیبت زدگان کی مدد کرنا فطری ہے۔ تیسرے خدمت
کرنے سے انسان سیدھا جنت میں جا پہنچتا ہے۔

ایک امیر شخص اپنی دولت تین طرح سے استعمال
سکتا ہے۔ اول یہ کہ اپنی اولاد کو دے ڈالے، موت
بعد اسے خرچے کی وصیت کر دے یا اپنی زندگی ہی
اسے صرف کرنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دولت
بہترین مصرف یہ ہے کہ اپنی زندگی ہی میں اسے
خدمت خلق پر لگایا جائے۔

انسان اپنی اولاد پر بے تحاشا دولت لگائے تو عموماً
ضائع جاتی ہے۔ پھر اس کی چھوڑی ہوئی دولت بہت کم
دنیا میں تبدیلی لا پاتی ہے۔ عام طور پر دنیا میں انقلاب
وہی لاتے ہیں جو اپنی زندگی ہی میں خدمت خلق پر دولت
خرچ کریں۔ یوں نہ صرف انھیں دلی خوشی ملتی ہے بلکہ
بچے بھی ان پر ناز کرتے ہیں۔

سٹیوکیس:- دولت دینے کے علاوہ یہ بھی ضروری
ہے کہ خدمت خلق پر وقت اور توانائی خرچ کی جائے
مزید برآں مقصد یہ پورے جوش سے دھیان دینا
لازمی ہے۔ میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ مل جل کر

خدمت خلق کے واسطے دولت دے کر انسان
دلی مسرت اور اطمینان محسوس کرتا ہے



سرگرمیاں انجام دی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

پہلے ہم میاں بیوی خاموشی سے خدمت خلق کرنا مناسب سمجھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ احساس ہوا کہ لوگوں کو ساتھ ملا کر دکھی انسانیت کی خدمت کرنا زیادہ سہل اور کارآمد طریقہ ہے۔ اسی لیے اب ہم ”گیونگ پیج“ (Giving Pledge) کو دولت دے کر خدمت خلق کر رہے ہیں۔

بل گیٹس:- میں سمجھتا ہوں کہ دولت مندوں کو چاہیے وہ اپنے دفاتر سے نکل کر غریبوں کی بستیوں کا دورہ کریں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے غرباء کی حالت زار کا مطالعہ کریں۔ انھیں چاہیے کہ وہ دنیا کی خوبصورتی دیکھنے کے ساتھ ساتھ بد صورتیاں بھی دیکھیں۔ اس طرح دنیا بدلنے کا عزم رکھنے والے امراء کو حقیقی تجربے حاصل ہوں گے۔ وہ پھر دکھی انسانیت کی خدمت کرنے والے عملی اقدامات کر سکتے ہیں۔

وارن بفٹ:- میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ہزاروں سال قبل پیدا نہیں کیا۔ تب جلد یا بدیر میں کسی حیوان کا شکار ہو جاتا لیکن آج میں اس قابل ہوں کہ ہزار ہا انسانوں کی مدد کر سکوں۔ یہ بہت بڑا انعام ہے جو مجھے ملا۔ میزبان..... آپ مہمانوں میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ اس پر کب یہ ظہور ہوا کہ وسیع پیمانے پر خدمت خلق کرنی چاہیے؟

وارن بفٹ:- مجھے اتنی پرانی باتیں یاد نہیں۔ میری یاداشت کمزور ہو چکی کہ یاد نہیں، میں نے عصرانے پر کیا کھایا تھا۔ (قہقہہ)

میلنڈہ گیٹس:- جب بل اور میری شادی ہوئی تو ہم نے اسی وقت طے کر لیا کہ مائیکروسوفٹ سے ہمیں جو دولت ملی وہ معاشرے کو لوٹانی ہے۔ دراصل ہم دونوں کا تعلق ایسے خاندانوں سے ہے جنہوں نے ہمیشہ خدمت

خدمت خلق کے واسطے بہترین خیالات پیش کرنا بھی ایک بہت بڑی ٹنگی ہے۔ تاہم دولت کو بھی چاہیے کہ وہ محض چیک لکھ کر یہ نہ سمجھیں کہ فرض ادا ہو گیا بلکہ وہ خدمت خلق پر اپنا وقت، ذہن بھی لگائیں۔ (وارن بفٹ)

خلق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۱۹۹۳ء میں پھر شادی سے قبل ہم افریقہ سیر و تفریح کرنے گئے۔ وہاں پھیلی غربت نے ہمارے چودہ طبق روشن کر دیے۔ بس پھر ہم اپنی پوری توانائی خدمت خلق پر جُت گئے۔ اس منفرد سفر کے دوران جوڑے نے بہت کچھ پایا اور سیکھا۔

لیون بلیک:- ۵ سال قبل مجھ پر انکشاف ہوا کہ بیوی خون کے کینسر کی مریضہ ہے۔ اس جان لیوا مرض کا علاج کراتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ دنیا بھر میں مرد و زن بھی اس بیماری کا نشانہ بنتے ہیں۔ لیکن فی الوقت اس کا توڑ دریافت نہیں ہو سکا۔

چنانچہ پچھلے سال میں نے خون کے سرطان پر تحقیق کرنے کی خاطر ایک تحقیقی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ اس ادارے ۳۰ محقق دن رات محنت کرتے ہوئے کوشش کر رہے ہیں۔ بذریعہ تحقیق خون کے سرطان کا شافی علاج دریافت کرنا سٹیو کیس:- ہم دولت اس لیے صرف کر رہے ہیں کہ وہ دنیا میں مثبت تبدیلی لائے۔ تاہم یہ ضروری ہے سوچ سمجھ کر خرچ کی جائے۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ منصوبوں پر پیسہ لگانا گناہ ہے۔ ہماری حکمت عملی یہ ہے کہ کم سے کم رقم میں زیادہ بڑی تبدیلیاں جنم لیں۔ ڈیوڈ رینسٹین:- میرے نزدیک ہر وہ انسان خدمت خلق کر رہا ہے جو مصیبت زدگان کی مدد کرتے ہوئے



خدا کا شکر ہے اس نے مجھے ہزاروں سال پہلے پیدا نہیں کیا

دولت، وقت، توانائی اور ذہن خرچ کرتا ہے۔

میزبان..... ایک حد تک امراء کا فرض ہے کہ وہ واپس لوٹائیں، لیکن کیا اس فیاضی کی تشہیر ضروری ہے؟ سٹیو کیس:- اعتدال کی حد تک تشہیر ضروری ہے تاکہ دیگر مختیر شخصیات بھی خدمت خلق کی طرف متوجہ ہوں نیز آپ کو معاشرے کے مختلف طبقوں کی مدد حاصل ہو جائے۔ تاہم ذاتی شہرت کی خاطر اچھے کاموں کی تشہیر نمودنمائش کے علاوہ کچھ نہیں۔

میلنڈہ گیٹس:- میں شروع میں تشہیر کی مخالف تھی لیکن تجربے نے بتایا کہ اگر مشہور شخصیات خدمت خلق کے کاموں کی تشہیر کریں تو اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ یوں دوسرے بھی آپ کے ساتھ آ شامل ہوتے اور فلاحی سرگرمیوں میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ اس طرح حکومتوں پر بھی دباؤ پڑتا ہے کہ وہ خدمت خلق کے منصوبے شروع کریں۔ تشہیر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ یوں دوسروں کو بھی کام کرنے کی تحریک ملتی ہے۔

وارن ہفٹ:- گیونگ پلج کا یہ بنیادی اصول ہے کہ آپ اپنی فلاحی سرگرمیوں کی تشہیر کریں۔ آخر جو اپنی آدمی یا زیادہ دولت خدمت خلق کے لیے وقف کر رہا ہے، لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے یہ اقدام کیوں اٹھایا؟

بل گیٹس:- امریکا، چین، بھارت وغیرہ میں منعقدہ تقاریر و محفلوں میں کئی بار یہ موضوع زیر بحث آیا کہ ذاتی تشہیر ہونی چاہیے یا نہیں؟ اس ضمن میں سب سے دلچسپ واقعہ جدہ، سعودی عرب میں میرے ساتھ پیش آیا۔ میں سعودی امراء کے ساتھ ایک تقریب میں شریک تھا وہاں بھی یہی بحث چل پڑی۔ تب ایک سعودی دولت مند نے قرآن پاک کی ایک آیت پڑھ کر سنائی۔ اس کے معنی تھے کہ امیر یہ سوچ کر اپنی فلاحی سرگرمیوں کی تشہیر کر سکتا ہے

تاکہ دوسروں کو بھی خدمت خلق کرنے کی تحریک ملے۔ میزبان..... آپ پانچوں شخصیات دینا بھرت سے ملتے ملا تے ہیں۔ ان ملاقاتوں سے آپ لوگوں کیا کچھ سیکھا؟

وارن ہفٹ:- میں چین، بھارت اور روس ارب پتیوں سے مل چکا۔ گو یہ تمام لوگ مختلف تہذیب و ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی عادات و رسوم متفرق ہیں لیکن مجھے یہ جان کر حیرت و خوشی ہوئی کہ خدمت خلق کے سلسلے میں بیجنگ، نئی دہلی اور نیویارک سبھی مختیر لوگ کئی مشترک خصوصیات رکھتے ہیں۔

میلنڈہ گیٹس:- میں نے بھارت اور چین میں دیکھا ہے کہ جس نسل..... موجودہ نسل نے دولت کمائی ہے بڑے جذبے سے دکھی انسانیت کی خدمت کر رہی ہے۔ چاہتے ہیں کہ ان کا ملک ترقی کرے اور خوشحال بنے۔ بہت ضروری ہے کہ جن لوگوں نے اپنے ہاتھوں سے دولت کمائی، وہ اسے اپنے معاشرے پر بھی خرچ کریں۔ وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقات یہ دولت اگلی نسل کو منتقل ہوتی ہے۔

وہ یہ سوچ کر اسے خدمت خلق پر نہیں لگاتی کہ یہ تو اس وراثت میں ملی ہے۔ لہذا اس کا فرض ہے کہ اسے تحفظ دے اور پھر اگلی نسل کو دے ڈالے۔ یوں وہ فلاحی سرگرمیوں کی زیادہ رقم نہیں خرچ کرتی۔ چنانچہ بہتر یہ ہے کہ جو دولت کمائے، وہ اپنی زندگی میں ہی اسے استعمال بھی کرے۔ ڈیوڈ رینٹمین:- میں نے دیکھا ہے کہ بہت سے لوگ فلاحی اداروں کو یہ سوچ کر رقم نہیں دیتے کہ یوں سے جان جائیں گے ان کے پاس بہت دولت ہے۔ حالانکہ اب آزاد میڈیا اور امراء کی فوربس فہرست کے باعث دولت پوشیدہ رکھنا آسان نہیں۔ لہذا انھیں چاہیے کہ خدمت خلق میں حصہ ڈال کر عزت و شہرت کمائیں۔

دنیا میں بیشتر انسان اپنی ہمت، لیاقت، ذہانت اور محنت کی بدولت ہی کامیابیاں پاتے ہیں



بار بار کہے اور سوچے لفظ اکثر سچ ثابت ہو جاتے ہیں



موت کا سفر

ماسکو سے دور رہنے والے ایک میاں بیوی کی سچی داستان
میاں کو ہمیشہ گمان رہتا تھا کہ اب کی بار جہاز ضرور گر پڑے گا

سید عاصم محمود

دولت زندگی ہی میں خرچ کیجئے۔

جون ۲۰۱۰ء میں وارن بٹ اور بل اینڈ میلنڈ گیش نے ایک تنظیم ”گیونگ پلج“ (Giving Pledge) کی رکھی۔ اس میں صرف ارب و کھرب پتی ہی داخلہ لے سکتے ہیں۔ رکن بننے کا اصول سادہ ہے۔۔۔۔۔ اعلان کر دیجئے کہ آپ نے اپنی کم از کم نصف دولت (حیات میں یا موت کے بعد) خدمت خلق کی خاطر وقف کر دی۔ ساتھ ہی مختصر الفاظ میں بیان کرنا پڑتا ہے کہ آپ نے یہ مفرد قدم کیوں اٹھایا؟

اب تک دنیا بھر سے ۹۱ ارب و کھرب پتی گیونگ پلج کے رکن بن چکے۔ ۴۰ تو پہلے ماہ ہی بن گئے۔ گزشتہ چند ماہ میں ۱۰ ارب و کھرب پتی بھی تنظیم کا حصہ بنے۔ جن کی مجموعی دولت ۱۸.۴ ارب ڈالر ہے۔ گویا اب وہ ۱۹.۲ ارب ڈالر خدمت خلق پر صرف کریں گے۔ ارکان تنظیم ہر سال میٹنگ کر کے سوچ بچار کرتے ہیں کہ غریبوں کی حالت زار کیونکر بہتر بنائی جائے۔ تنظیم کا دفتر بل اینڈ میلنڈ گیش فاؤنڈیشن کے ہیڈ کوارٹر میں واقع ہے۔

گزشتہ دنوں امریکی توانائی کمپنی، ۵۷ پاور انرجی (5-Hour Energy) کا بھارتی نژاد مالک منوج بھارت بھی گیونگ پلج کا رکن بنا۔ اس کمپنی کی مالیت ۵.۵ ارب ڈالر (۱۴۴ ارب ڈالر) ہے۔ منوج بھارت کو دولت مند ہونا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے وطن میں غریبوں کی حالت سدھارنے کے لیے کثیر رقم خرچ کرے گا۔ تاہم انھوں نے بھارت میں کوئی تنظیم نہیں گھولی اور نہ ہی کوئی منصوبہ شروع کیا۔ بس ایک دفتر کھولا اور ۲۰ افراد ملازم رکھ لیے۔ وہ ایسی تنظیمیں تلاش کرتے ہیں جو دیانت داری اور خلوص سے خدمت خلق کر رہی ہیں۔ بھارتی تنظیموں کو بھرپور مدد دیتا ہے۔ لیکن بھارت میں بہت کم لوگ منوج بھارت کو جانتے ہیں۔ لہذا رقم لینے والی تنظیمیں یہی سمجھتی ہیں کہ منوج در پردہ یہ عزائم رکھتا ہے۔ لیکن گیونگ پلج کا رکن بن کر اسے سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ وہ بھارت میں بحیثیت مخیر ہستی مشہور ہو گیا۔ اب وہاں ہر کوئی خدمت خلق کرنے میں اس سے بڑھ چڑھ کر تعاون کرتا ہے۔

ان کی ساری جائیداد یہیں رہ جائے گی۔

میزبان..... فلاحی سرگرمیاں انجام دیتے ہوئے آپ سب کو مشکلات پیش آتی ہوں گی۔ ناکامیوں سے بھی سامنا ہوا ہوگا تو آپ نے اپنا جوش و جذبہ کیسے برقرار رکھا؟

وارن ہفٹ:- میں سمجھتا ہوں کہ اگر آپ نے ۵۷ فلاحی منصوبے شروع کیے اور ان میں سے ایک بھی کامیاب ہوا تو سمجھیے کہ آپ کی محنت ٹھکانے لگی۔ دراصل دولت زیادہ ہو تو آپ ہزاروں لاکھوں انسانوں کی زندگیاں بدل سکتے ہیں۔ پھر خطرات مول لینا بھی ممکن ہے۔ چنانچہ اگر میرا کوئی فلاحی منصوبہ ناکام ہو جائے تو میں بدول نہیں ہوتا۔ کوئی اور کامیاب منصوبہ مجھے خوشی و مسرت عطا کر دیتا ہے۔

لیون بلیک:- دنیا میں بیشتر انسان اپنی ہمت، لیاقت،

ذہانت اور محنت کی بدولت ہی کامیابیاں پاتے ہیں۔ دولت کماتے اور فوربس فہرست میں جگہ پاتے ہیں۔ مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے اور چیلنج سلجھاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدمت خلق کے دوران پیش آنے والے رکاوٹوں کا بھی وہ بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔

ڈیوڈ رینٹن:- خدمت خلق میں بھی اسی وقت کام آتا ہے جب آپ من پسند منصوبوں پر کام کریں۔ کوئی امیر شخص سماجی سرگرمیوں میں بوریت محسوس کرے اسے چاہیے کہ وہ خدمت خلق کے مختلف شعبوں کو دیکھے کہیں نہ کہیں اسے من پسند منصوبہ مل ہی جائے گا۔ وہاں اپنی دولت اور توانائی صرف کر کے انسانیت کی بے بھرم مدد کر سکتا ہے۔

ستمبر ۲۰۱۱ء کی سرد صبح تھی جب

۷۵ مسافر ٹیولیف ٹی یو۔ ۱۵۳ نامی

مسافر بردار روسی ہوائی جہاز پر سوار

ہوئے۔ جہاز نے شمال مغرب روس

میں واقع شہر، پولیارین سے ماسکو جانا تھا۔ یہ تقریباً ۵ گھنٹے

کی پرواز تھی۔ شاسلیف اور اس کی بیگم اکثرینا بیشتر

مسافروں کے مانند مبینے میں دو تین بار پولیارین سے ماسکو

جاتے آتے تھے۔ اسی لیے اب جوڑا پورے عملہ ہوائی جہاز

کے ناموں سے واقف ہو چکا تھا۔

۳۰ سالہ شاسلیف اگرچہ ہوائی سفر سے خاصا خوف

کھاتا تھا۔ مگر ماسکو دور ہونے کے باعث اسے یہ کڑوا

گھونٹ پینا پڑتا۔ دلچسپ بات یہ کہ جب وہ سفر کرنے

لگتا، یہ جملہ اس کی زبان پہ ہوتا ”اس بار ہوائی جہاز ضرور

گر پڑے گا۔“ اس کی بیوی ۲۸ سالہ اکثرینا ہمیشہ اسے

ڈھارس دیتی ”اگر ہمارے جہاز کی قسمت میں گرنا لکھا ہے

تو وہ گر جائے گا۔ اگر نہیں لکھا تو وہ کبھی نہیں گرے گا۔“

لیکن بیوی کی تسلی شوہر کو کم ہی مطمئن کر پاتی۔

پولیارین کے مضافات میں معدنیات کی کانیں واقع

ہیں۔ لہذا وہاں روس بھر سے آئے ہوئے انجینئر،

سائنسدان اور کارکن آتے اور عارضی قیام کرتے ہیں۔

جب انھیں چھٹیاں ہوں یا کوئی کام پڑے تو وہ واپس اپنے

شہر چلے جاتے۔ چونکہ شاسلیف اور اکثرینا کا وطن، ماسکو

سے کئی سو میل دور تھا، لہذا مجبوراً انھیں جانے کے لیے

ہوائی جہاز کا سہارا لینا پڑتا۔ پولیارین تا ماسکو دو تین جہاز

اور ان کا عملہ ہی چکر لگاتا تھا، چنانچہ پائلٹوں اور فضائی

میزبان وغیرہ کی مسافروں سے شناسائی ہونا لازم تھا۔

میاں بیوی پر ویسے بھی کڑا وقت آیا ہوا تھا۔ دراصل

ایک ماہ پہلے اکثرینا کا مرتی تبادلہ ہو گیا جو پولیارین سے

۵۰۰ کلومیٹر دور ہے۔ وہ محکمہ پولیس میں ملازمت کرتی

تھی۔ تاہم اب شاسلیف چاہتا تھا کہ بیوی یہ ملازمت خیر

باد کہہ کر اپنی ۵ سالہ بیٹی، کو سنبھالے۔ تاہم اکثرینا اسے

اپنی پرکشش نوکری چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ ان دونوں

کے مابین جھگڑا اتنا بڑھا کہ بیٹی کو ماسکو دادا دادی کے پاس

بجھوانا پڑا تا کہ وہ ذہنی طور پر پریشان نہ ہو۔

ایک ہفتہ میاں بیوی کے مابین خاصا نزاع رہا اور

تو تکار بھی ہوئی، پھر فیصلہ ہوا کہ اکثرینا ملازمت چھوڑ کر

گھر سنبھالے گی۔ یہ فیصلہ ہوتے ہی حالات معمول پر آ

گئے۔ اب دونوں مطمئن اور خوش میاں بیوی بیٹی کو اپنے

ماسکو جا رہے تھے۔ وہ بے تابی سے منتظر تھے کہ کب اس

سے ملاقات ہوتی ہے۔ تاہم ہوائی سفر کی ہیبت نے

شاسلیف کا کچھ سکون غارت کر دیا۔

ہوائی جہاز کے کاک پٹ میں اگرچہ حالات معمول

پر تھے۔ دونوں پائلٹوں، ۴۲ سالہ اکنیف نوویلو اور

۴۳ سالہ اندزی کمانوف کی تیاری آخر مراحل میں تھی۔

ادھر فلائٹ انجینئر، رفیق کرییوف اور فضائی میزبان ایلینا

دزوموف بھی اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ عملے کے ان

چاروں افراد کو بھی یقین تھا کہ یہ پرواز بھی حسب معمول

انجام پائے گی۔۔۔۔۔ مگر اس بار شاسلیف کی پریشانی بجا

تھی، اب ایک آفت بھی کو چھٹنے والی تھی۔

☆☆

ہوائی جہاز کو پرواز کرتے ڈھائی گھنٹے بیت چکے

تھے۔ جہاز شمال مغرب روس کی سرد ہواؤں میں اڑا جا رہا

تھا۔ پائلٹ چائے پینے میں محو تھے۔ باتوں کا سلسلہ بھی

جاری تھا۔ انھوں نے جہاز خود کار پائلٹ کے طور پر کام

کرنے والے کمپیوٹر کے سپرد کر رکھا تھا۔ اچانک کمپیوٹر نے

کام کرنا چھوڑ دیا اور جہاز تھوڑا سا ڈگمگا گیا۔

نوویلو اور کمانوف، دونوں پائلٹوں نے فوری طور پر

جہاز کا کنٹرول سنبھال لیا۔ نوویلو نے پھر فلائٹ انجینئر،

رفیق کرییوف سے کہا کہ پتا لگاؤ، خود کار پائلٹ کے نظام

نے کام کرنا کیوں چھوڑ دیا؟ جب رفیق نے آلات کے

پتیل کا جائزہ لیا تو اسے ایک جگہ سرخ بتی جلتی نظر آئی۔

رفیق تھوڑا پریشان ہو گیا۔ اس نے بھنویں اوپر

چڑھائیں اور سوچنے لگا کہ آخر خرابی کہاں ہوئی ہے؟ اس

نے پھر کمر کسی اور پھرتی سے آلات کی جانچ پڑتال کرنے

لگا۔ اس وقت صبح کے ۷ بجے تھے۔

اس روز نوویلو پرواز کا انچارج تھا۔ چنانچہ اس نے

قریبی ایئر ٹریفک کنٹرول سینٹر سے رابطہ کیا اور انھیں بتایا

”شاہد ہمیں جلد ہی ہنگامی بنیادوں پر اترنا پڑے۔ لہذا پتا

لگائیے کہ یہاں سے قریب ترین ہوائی اڈا کون سا ہے؟“

ادھر سے پوچھا گیا ”جناب! ایئر جنسی لینڈنگ کی

وجہ بتائیے تاکہ.....“ کنٹرولر بول رہا تھا کہ رابطہ منقطع ہو

گیا۔ اسی دوران یکے بعد دیگرے جہاز کے تمام آلات

ایک ایک کر کے بجھتے چلے گئے۔ یہ دیکھ کر دونوں حیران و

پریشان پائلٹ ایک دوسرے کو تنکٹے لگے۔

ٹیولیف ٹی یو۔ ۱۵۳ جہاز میں چار محفوظ بیٹریاں ہوتی

ہیں۔ جب کہ اس پرواز کے جہاز میں نصب چاروں

بیٹریاں ۱۱ سال پرانی تھیں۔۔۔۔۔ گویا ان کے ختم ہونے

میں صرف ایک سال باقی تھا۔ یہ فرسودگی ہی جہاز میں

نظام بجلی تباہ کرنے کا سبب بن گئی۔

ہوا یہ کہ ایک بیٹری کا پانی اتنا گرم ہوا کہ ابل پڑا۔ اس

پانی نے قریب موجود دوسری بیٹری بھی خراب کر دی۔ لیکن پھر

اصل خرابی سامنے آئی۔۔۔۔۔ ایک بیٹری نے ناکارہ ہوتے

ہوئے اپنا کرنٹ جہاز کے مرکزی نظام بجلی میں چھوڑ دیا۔ یہ

کرنٹ بیرونی حملہ ثابت ہوا اور اسی نے پورا نظام تباہ کر ڈالا۔

جب مرکزی پاور سپلائی ختم ہوئی تو بجلی فراہم کرنے کا

سارا بوجھ ۲ بیٹریوں پر پڑ گیا۔ انھوں نے چند منٹ تو جہاز

کو بجلی فراہم کی لیکن پھر وہ بھی ڈھس گئیں، کیونکہ پیچیدہ

آلات کو بہت زیادہ پاور درکار تھی۔ چنانچہ اب پائلٹوں اور

دیگر عملے نے ہاتھوں سے ہی سارے آلات چلانے تھے۔

☆☆

شاسلیف اور اکثرینا اکانومی کلاس میں سب سے آگے

بیٹھے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کی نشستوں پر نصب

بتیاں اچانک بجھ گئیں۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد جہاز ہوا میں

بھکولے کھانے لگا۔ لگتا تھا کہ پائلٹ اسے قابو میں رکھنے کی

بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ شاسلیف خوفزدہ لہجے میں بیوی

سے بولا ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ لگتا ہے، جہاز گر جائے گا۔“

بیگم نے ترنت جواب دیا ”ارے پریشان مت ہو،

ابھی جہاز معمول کے مطابق اڑنے لگے گا۔“

فضائی میزبانوں (ایئر ہوسٹس) کی ناظم، ایلینا

روزموانے بھی عجیب واقعات نوٹ کیے۔ چنانچہ وہ کاک

پٹ پہنچی اور پائلٹوں سے پوچھا کہ خیریت تو ہے؟ جہاز

ڈول کیوں رہا ہے؟ فکر مند رفیق نے دبے دبے لفظوں

میں اُسے بتایا ”ہم ایک بڑے مسئلے میں گرفتار ہو چکے۔

میں بعد میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا۔“

۵۰ سالہ خوش شکل اور ابھی تک جوان نظر آنے والی

ایلینا تجربے کار فضائی میزبان تھی۔ اُسے ہوا بازی سے

منسلک ہوئے ۳۰ برس بیت چکے تھے۔ اُسے احساس ہو

گیا کہ بجلی کے نظام میں نقص سے یہ مصیبت آئی ہے۔ وہ

واپس اپنے کیمین میں چلی آئی، دیگر فضائی میزبانوں کو

تشویش ناک صورت حال سے آگاہ کیا اور انھیں بتایا کہ

چوکنا رہو۔ سبھی نے اطمینان کر لیا کہ جیبوں میں شناختی

پائلٹ نے کاک پٹ میں جھانکتی ایئر ہوسٹس سے

کہا ہم ایک بڑے مسئلے سے دوچار ہو چکے ہیں۔“

پائلٹ چائے پینے میں محو تھا اچانک خود کار کمپیوٹر نے کام کرنا چھوڑ دیا

کارڈ موجود ہیں تاکہ کسی حادثے کی صورت میں ان کی لاشیں شناخت ہو سکیں۔

اس وقت جہاز ساڑھے ۱۰ ہزار میٹر کی بلندی پر بادلوں کے درمیان اڑ رہا تھا۔ اب پائلٹ اسے بادلوں کے نیچے لے جانے کا سوچنے لگے۔ دراصل اس آلے نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا جو بادلوں میں پائلٹوں کو اس قابل بناتا تھا کہ وہ کچھ نظر نہ آنے کے باوجود بخوبی جہاز اڑا سکیں۔ چنانچہ پائلٹ جہاز کو ۱۲۰۰ میٹر بلندی تک لے آئے۔ اس سے نیچے جانا خطرناک تھا۔ لہذا وہ ۱۵۰ کلومیٹر دور تک اڑتے چلے گئے تاکہ بادلوں میں کوئی شگاف نظر آئے، تو وہاں سے نیچے جا سکیں۔

اچانک ایک انتباہی بتی جل اٹھی..... یہ ان چند آلات میں سے تھی جو بدستور کام کر رہے تھے۔ اس نے پائلٹوں کو خبردار کیا کہ سطح ایندھن خطرناک حد تک کم ہو چکی۔ دراصل مرکزی ٹینکوں سے انجنوں تک ایندھن پہنچانے والے پمپ بھی بجلی جانے کے بعد رک گئے تھے۔ لہذا اب تینوں انجنوں نے اس ٹینک میں بچا کچھا ایندھن استعمال کرنا تھا جس سے وہ براہ راست تیل لیتے تھے۔ پائلٹ جان گئے کہ صرف ۳۰ منٹ کا ایندھن رہ گیا ہے۔

اب وقت کم تھا اور مقابلہ بڑا سخت! جہاز کے نیوی گیٹر، ۵۲ سالہ سرگئی شاسلیف کا دل حالات سے آگاہی کے بعد تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ تاہم اس نے اپنی پریشانی پر قابو پایا اور ایمرجنسی فریکوئنسی پر مدد طلب کرنے والا (ایس او ایس) پیغام بکھوا دیا۔ تاہم اسے خبر نہ تھی کہ سگنل بکھوانے والا ٹرانسمیٹر عرصہ ہوا بند ہو چکا۔

اس دوران ایک فضائی میزبان، ۴۴ سالہ کولائی دمتریف صورت حال کا جائزہ لینے کا ک پٹ چا آیا۔ تھوڑی دیر بعد نوویلو نے اسے کہا ”ہم بادلوں کے نیچے جانے لگے ہیں، بہتر ہے تم واپس اپنے کیبن جا کر ساتھیوں اور مسافروں کو حالات سے آگاہ کر دو۔“

دمتریف نے پہلے یہ پریشان کن خبر اپنے ساتھیوں کو سنائی جن میں اس کی بیگم ایلینا بھی شامل تھی۔ دونوں پچھلے سات برس میں کئی بار اکٹھے سفر کر چکے تھے۔ اس نے پھر مسافروں کو اطلاع دی۔ وہ جہاز کی بے ترتیب اڑان سے پہلے ہی جان چکے تھے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ لہذا خبریں کر وہ سراسیمہ تو ہوئے لیکن اتنی بے چینی نہیں پھیلی کہ حالات قابو سے باہر ہو جائیں۔

اسی وقت شاسلیف بولا ”اس بار ہوائی جہاز ضرور گر پڑے گا۔“ ہمیشہ کی طرح اکثریت نے اسے تسلی دی ”ارے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ لیکن اندر سے اسے شوہر کی بات پہ یقین آنے لگا تھا۔

☆☆☆
جب تمام مسافر نشستوں سے جڑی حفاظتی پٹیاں باندھ چکے اور ساری تیاری مکمل ہو چکی تو جہاز کی اڑان شروع ہو گئی۔ دونوں پائلٹ اس دوران چاق و چوبند رہے تاکہ کسی ناگہانی آفت کا بھرپور مقابلہ کر سکیں۔ خوش قسمتی سے بادلوں کی موٹائی زیادہ نہیں تھی اور چند ہی سیکنڈ بعد زمین نگاہوں کے سامنے آ گئی۔

جہاز کے نیچے زمین صنوبر اور سرو کے درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ شمالی روس میں ان درختوں کے جنگل عام

ہیں۔ پائلٹوں کو پھر ایک دریا نظر آیا جس کے درمیان میں ریت و مٹی کے قطعے بنے تھے۔ ۸۲ ٹن وزنی جہاز کو ریتلے پانی میں اتارنا کارے وارد تھا اور ایک خطرناک عمل بھی، لیکن بہر حال وہ جنگل میں اترنے سے بہتر تھا۔ کاک پٹ میں بیٹھے دمتریف کو اب اپنے لیڈر سے نئی اطلاع ملی ”ہم ریت پر اترنے کی کوشش کریں گے۔“

دمتریف نے اپنے ساتھیوں کو یہ اطلاع دی۔ انھوں نے پہلے سارا سامان سمیٹا پھر مسافروں کو ان جگہوں کے قریب لے گئے جہاں سے ہنگامی طور پر نکلا جاتا تھا۔

پائلٹوں نے اب جہاز مزید نیچے کیا تاکہ علاقے کا واضح جائزہ لے سکیں۔ اچانک نوویلو کو دور آبادی سی نظر آئی۔ اس نے سوچا کہ وہاں پہنچا جائے، شاید لینڈنگ کے لیے کام کی کوئی جگہ مل جائے۔ جب وہ اس کے قریب پہنچے، تو ان کی حیرت اور خوشی کا کھکا نہ نہیں رہا..... ایک ہوائی پٹی (Airstrip) ان کی نگاہوں کے سامنے دھوپ میں چمک رہی تھی۔

یہ ماسکو سے ۱۵۰۰ کلومیٹر دور واقع ازیمیا کا چھوٹا سا قصبہ تھا۔ قصبے کے رہائشی بارہ سنکھے پال کر روزی کماتے تھے۔ ۱۹۸۵ء میں سوویت حکومت نے قصبے کے مضافات میں ایک چھوٹا سول ہوائی اڈا بنایا تھا۔ لیکن ۱۹۹۷ء میں اسے بند کر دیا گیا۔ بعد ازاں اسے ہیلی پیڈ کی شکل مل گئی۔ تاہم ہوائی اڈے کے منیجر سرگئی مونیکوف نے ہوائی پٹی کے کنٹرول کو اچھی حالت میں رکھا۔

اب پائلٹوں نے فیصلہ کیا کہ اس ہوائی پٹی پر اتر جائے۔ چنانچہ وہ جہاز کو اترنے کی پوزیشن پر لانے لگے۔ گواہوں نے کی باقاعدہ جگہ مل گئی تھی، لیکن خطرات ابھی تک سر پہ منڈلا رہے تھے۔ دراصل ہوائی پٹی صرف ۱۳۲۰ میٹر طویل تھی، جب کہ جہاز کو اترنے کے لیے کم از کم ۲۵۰۰

میٹر لمبا رن وے درکار تھا۔ چنانچہ پائلٹوں کا ارادہ تھا کہ پٹی کے شروع ہی میں جہاز اتاریں تاکہ زیادہ سے زیادہ پختہ راستے سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

جہاز کو نیچے اتارنے والے آلات ہاتھ کے ذریعے ہی کام کرتے تھے۔ تاہم وہ تمام برقی آلات ناکارہ ہو چکے تھے جو ہوائی جہاز کی رفتارست کرنے میں کام آتے ہیں۔ گویا نوویلو اور کمونوف نے ہوا بازی کے قدیم طریقوں کی مدد سے جدید ٹیکنالوجی کے شاہکار جہاز کو ایسے رن وے پر اتارنا تھا جسے چھوٹے جہازوں کی خاطر بنایا گیا تھا۔

اب پائلٹوں نے ہوائی پٹی کے دو چکر لگائے تاکہ جہاز کی بلندی کم کر کے اترنے کے بہترین زاویے تک پہنچ سکیں۔ اس دوران بھی فضائی میزبان ایمرجنسی لینڈنگ کے سلسلے میں مسافروں کو ہدایات دیتے رہے۔

دوران اترائی بعض مسافروں ہی دل میں اپنے رب سے سلامتی کی دعائیں مانگنے لگے۔ کچھ کو ہوائی بیماری کے باعث قے آ گئی۔ جہاز کا عملہ انھیں تسلی دینے کی اپنی سی کوشش کرتا رہا۔ ساری ہلچل دیکھ کر اچانک شالیف نے بیوی سے پوچھا ”اگر ہم مر گئے، تو ہماری صوفیہ کا کیا بنے گا؟“ اکثریت نا ہاتھ ملتے ہوئے بولی ”میری ماں اُسے سنبھال لے گی۔“

تیسرے چکر پر پائلٹوں کی نگاہیں اپنی منزل پر مرکوز ہو گئیں۔ تب صرف بلندی، افقی رفتار اور ہوا کی رفتار بتانے والے آلات کام کر رہے تھے۔ جب جہاز ہوائی پٹی کی طرف بڑھا تو سارا عملہ ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا۔ بعض نے پکار کر دوسروں کو خبردار کیا ”ہم اترنے لگے ہیں۔“

دمتریف اپنی ایک ساتھی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے اسے بتایا ”میرا حلق اتنا خشک ہو چکا کہ میں کچھ نہیں نکل سکتا۔“

پھر اس نے سوچا ”اگر کوئی اڑیل درخت جہاز کی راہ میں رکاوٹ بنا، تو ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ تب کوئی ہمیں مرنے سے نہیں روک سکتا۔“

”انھیں ۸۲ ٹن وزنی جہاز کو ریتلے پانی میں اتارنا جنگل میں اتارنے سے بہتر لگا“



میں قتل کرنا چاہتا ہوں

ایک زیر تربیت استاد کی خواہش

پروفیسر محمد مزمل احسن شیخ

جاتا۔ اس کی بات سن کر میں لرز اٹھا کیونکہ وہ مجھ سے یہ مشورہ کرنے آیا تھا کہ وہ بھائی کے قاتل کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ ”کیا آپ کے بھائی صاحب قتل ہو گئے تھے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”نہیں! وہ گئے تو قتل کرنے ہی تھے۔ لیکن خود مارے گئے“ یہ اس کا جواب تھا۔ ”تو کیا یہ ضروری ہے کہ آپ قاتل کو قتل کرنے جائیں تو خود مقتول نہ ہوں؟“ ”ہاں! یہ بھی ممکن ہے۔“ ”تو اس صورت میں آپ نے سوچا کہ آپ کے

تیسری بار میرے کمرے میں آیا اور پھر دوبارہ آنے کا کہہ کر جانے لگا تو میں نے اسے روکا تا کہ وہ بات کر ہی لے۔ کیونکہ مجھے یاد آیا کہ کسی پروفیسر نے طالب علم سے ملنے سے انکار کیا اور کہا کہ وہ کل آئے تو اسے ساری عمر صدمہ رہا کہ اس کے طالب علم نے خودکشی کر لی تھی۔ میں ڈر گیا کہ کہیں اسے بھی کوئی ایسا مسئلہ درپیش نہ ہو۔ دراصل میں کچھ رپورٹیں مرتب کر رہا تھا اور اس کی آمد کا وقت بھی وہی تھا۔ وہ دوبارہ آنے کا کہہ کر لوٹ

ابتدی نہ پھیلے۔ چنانچہ وہ شاسلیف سے بولا ”آگے بڑھنے کی کوشش مت کریں، پلیز واپس اپنی جگہ بیٹھ جائیے۔“ اسی وقت اکثرینا سسکیاں لے کر رونے لگی، جب شاسلیف کو احساس ہوا کہ اسے اس کی ضرورت ہے۔ وہ بیوی کے پہلو میں بیٹھا، اس کا ہاتھ نرمی سے ہاتھوں میں لیا اور بولا ”فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

دوسرے مسافروں کو بھی یہ سمجھانے میں کچھ دیر لگی کہ وہ افراتفری نہ مچائیں۔ اس دوران ایک فضائی میزبان نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا اور پھر اعلان کیا کہ جہاز میں کہیں آگ نہیں لگی۔ اس اعلان نے سبھی کو شانت کر دیا۔ جلد ہی ایمرجنسی شوٹ (Chute) کے ذریعے تمام مسافر نیچے اتار دیے گئے۔ اس اثناء میں ہوائی اڈے پر متعین فائر بریگیڈ اور دوسرے افراد بھی آپہنچے۔

ڈرے سب مسافروں کی تواضع چائے و کافی سے ہوئی تو ان کی جان میں جان آئی۔ تاہم عملہ جہاز کا کام جاری تھا۔ اس نے پہلے جہاز سیل کیا اور افسران بالا کو تفصیل سے سارا ماجرا بتایا۔

یہ کارروائی جاری تھی کہ امدادی سرگرمیوں میں مصروف ایک کارکن بہت سنجیدہ صورت بنائے نوویکو کے پاس پہنچا اور بولا ”افسوس، حادثے میں ایک موت واقع ہو گئی۔“

نوویلو نے ہڑبڑا کر پوچھا ”وہ کون ہے؟“ کارکن نے بتایا ”آپ نے ایک خرگوش ہلاک کر ڈالا۔“ یہ کہہ کر وہ مسکرانے لگا۔

یہ سن کر نوویلو نے طویل قہقہہ لگایا۔ وہ پھر جنگل کی پاک صاف ہوا سے آکسیجن لے کر اپنا سینہ معطر کرنے لگا۔

☆☆

اس سہ پہر ایک دوسرے ہوائی اڈے سے مسافر دوسرے ٹی یو۔۱۵۳ کے ذریعے ماسکو پرواز کر گئے۔ صرف ایک جوڑے نے ریل سے جانے کو ترجیح دی جسے جہاز کے حادثے نے ذہنی و جسمانی دھچکا پہنچایا تھا..... اور وہ شاسلیف و اکثرینا نہیں تھے۔

وہ بولی ”میں خود بہت گھٹن محسوس کر رہی ہوں۔“ دمتریف کی بیوی جہاز کے دوسرے حصے میں تھی۔ انھیں یہ موقع بھی نہیں ملا تھا کہ ایک دوسرے کو الوداع کہہ سکیں۔ اس نے کھڑکی سے دیکھا، زمین قریب آتی جا رہی تھی۔

ہوائی پٹی سے قبل جب درختوں کا آخری جھنڈ بھی گزر گیا، تو نوویلو اور کماتوف نے جہاز کا رخ ہوائی پٹی کی طرف موڑ دیا۔ اترنے سے قبل جہاز کے انجن اٹنے چلا دیے گئے تاکہ وہ رکنے میں رکاوٹ نہ بنیں۔ جیسے ہی پیپے کنکریٹ سے ٹکرائے، پائلٹوں نے بریک لگا دی۔

اس وقت جہاز کی رفتار تقریباً ۳۸۰ کلومیٹر فی گھنٹہ تھی۔ بریکس لگیں تو رفتار ۱۰۰ کلومیٹر تک رہ گئی۔ لیکن صرف ۱۳۳۰ میٹر لمبی ہوائی پٹی دیوہیکل جہاز کے لیے ناکافی ثابت ہوئی۔ چنانچہ پٹی ختم ہوتے ہی ٹی یو۔۱۵۳ درختوں کے جھنڈ میں جا گھسا۔ درختوں کی شاخیں زور دار آوازیں پیدا کر کے جہاز کے پروں سے ٹکرائے لگیں۔

اسی وقت نوویلو نے دعا مانگی ”اے اللہ! ہماری مدد کر۔“ پھر اس نے سوچا ”اگر کوئی اڑیل درخت جہاز کی راہ میں رکاوٹ بنا، تو ہمارے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ تب کوئی ہمیں مرنے سے نہیں روک سکتا۔“

جہاز سے جب شاخیں تڑا تڑا ٹکرائیں، تو بعض کمزور دل مسافر ڈر کے مارے چیخنے چلانے لگے۔ تمام مسافروں کی خوش قسمتی کہ جھنڈ میں کوئی مضبوط درخت جہاز سے نہیں ٹکرایا۔ چنانچہ وہ ۲۰۰ میٹر دور جا کر آخر کار تھم گیا۔

وہ جیسے ہی رکا، پیہوں سے سیاہ دھواں اٹھنے لگا۔ مسلسل بریکیں لگانے سے ان کا ربڑ جل گیا تھا۔ جہاز رکتے ہی مسافروں نے سکون کا سانس لیا۔ بعض لوگ خوشی کے مارے تالیاں بجانے لگے۔ لیکن جب کچھ لوگوں نے باہر پیہوں سے اٹھتا دھواں دیکھا، تو وہ سمجھے کہ جہاز کو آگ لگ گئی۔

چنانچہ وہ چلانے لگے ”دروازے کھولو، دروازے کھولو۔“ انہی لوگوں میں شاسلیف بھی شامل تھا۔ وہ اچھل کر کھڑا ہوا اور ایک ایمرجنسی دروازے کی طرف لپکا۔ تاہم ایک فضائی میزبان اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی خواہش تھی کہ جہاز میں

والدین آپ کی بھانج اور اس کے بچوں کے علاوہ آپ کے بھائی بہنوں کا کون وارث اور محافظ ہوگا؟ اگرچہ اصل حفاظت تو اللہ ہی فرماتا ہے کیونکہ ہمارا ایمان ہے۔

”فَاللّٰهُ خَيْرُ حَافِظًا وَهُوَ اَرْحَمُ الرَّحِمِيْنَ“

”اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا“ اس نے کہا۔
”آپ کا دھیان اب بھی پوری طرح اس طرف نہیں گیا۔ کیونکہ دوسری صورت بھی ممکن ہے کہ آپ واقعی قاتل کو قتل کر دیں۔ اس طرح آپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ لیکن قاتل کے مقتول کی طرح قتل در قتل کا سلسلہ چل پڑے گا“ اس پر وہ کہنے لگا کہ واقعی یہ بھی بعید نہیں۔ لیکن پھر میرا کلیجہ کیسے ٹھنڈا ہوگا؟

میں نے اس کو پھر غور کرنے کے لیے اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ اگر وہ قتل کر کے گرفتار ہو جاتا ہے تو پھانسی یا عمر قید بھی ممکن ہے ضروری تو نہیں جس طرح اس کے بھائی کا قاتل رہا ہو کر آگیا ہے اسی طرح عدالت اسے بھی بری کر دے۔

یعنی ہر صورت میں والدین تو زندہ درگور ہوں گے ہی، بیوگان کی عزتیں کون چھوڑے گا؟ والدین تو پہلے ہی نور چشم کو رو کر ہلکان ہو رہے ہیں۔ وہ جو خود اپنے آپ کو سنبھالنے سے عاجز ہیں یعنی محتاج زندگی گزار رہے ہیں۔ کس طرح دوسرے جواں بیٹے کی موت سہہ سکیں گے۔ کیا یہ صدمہ دوبارہ پیش آیا تو ان کے لیے جان لیوا ثابت نہ ہوگا۔

ریٹائرڈ جج نے پوچھا

شعبہ تبلیغ اوقاف نے ایک کتاب ”قتل عمد“ شائع کی تھی اس میں ایک واقعہ ریٹائرڈ جج نے لکھا ہے کہ وہ عدالت کے باہر کسی گواہی کے سلسلے میں کھڑا تھا کہ اس کے قریب ایک نوجوان کو برآمدے کے باہر سے دوسری پارٹی نے لٹکرا تو اس نے بھی بھڑک کر بڑک ماری۔ ۳،۲ بار ایسا ہوا تو اس سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ مخالف پارٹی اس کے بھائی کی قاتل ہے اور اسے پیروی اور گواہی سے روکنا چاہتی ہے۔ ورنہ مارنے کی دھمکی دے رہی ہے۔ جج نے اس سے پوچھا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا ”میں چاہتا ہوں کہ قاتل پھانسی لگ جائے۔ تاکہ ہمارے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے“

ریٹائرڈ جج نے پوچھا۔
”اگر قاتل کو ہمیشہ ہی جیل میں رکھا جائے اور اسے آگ میں جلایا جاتا رہے تو کیا پھر تم خوش ہو جاؤ گے۔“
وہ کہنے لگا ”کیا ایسا ممکن ہے؟ پھر تو کلیجہ ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

جج نے بتایا کہ یہ تو اللہ کے قرآن میں (جس پر ہمارا ایمان ہے) قاتل کی سزا کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ جو کسی مومن کو جان بوجھ کر بلا وجہ قتل کرے گا۔ اس کی سزا جہنم ہے اور وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے تو پین آمیز عذاب ہے۔“
اگر دنیا کی عدالت چھوڑ بھی دے تو اللہ کی عدالت سے اسے کون چھڑائے گا اور وہاں اسے ہمیشہ آگ کے عذاب کی ذلت سہنی ہوگی۔“

”اگر قاتل کو ہمیشہ ہی جیل میں رکھا جائے اور اسے آگ میں جلایا جاتا رہے تو کیا پھر تم خوش ہو جاؤ گے“

اس نے میں فریق مخالف کی طرف سے لٹکار آیا تو یہ نوجوان آگے بڑھ کر کہنے لگا۔
”اب جو چاہے کہو، میں نے کچھ نہیں کہا۔ چچا نے نیت ہی ایسی ایمان کی کی ہے کہ میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہے۔“

یہ واقعہ سن کر زیر تربیت استاد کہنے لگا
”جناب! میں اس لیے آپ کے پاس آیا تھا کہ آپ اجازت دیں گے تو پھر قاتل کو جہنم رسید کروں گا۔ ورنہ تمہیں“ بھلا میں کیسے اجازت دے سکتا تھا۔ جہنم رسید کرنے کا اختیار تو اللہ مالک کو ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں دخل دینے والے۔

میں نے اسے کہا۔ وہ اصل فیصلہ کرنے والے احکم الحاکمین اللہ جبار و قہار اور عادل پر فیصلہ چھوڑ دے۔ والدین، بہن بھائیوں، بھانج اور اس کے بچوں کی سرپرستی کرے۔
قاتل کا قتل دنیاوی عدالت سے چھوٹنے کے باوجود اسے جہنم نہیں لینے دیتا۔ اس کے سینے میں ہر وقت آگ لگی رہتی ہے اور وہ کسی نہ کسی صورت میں ذلت کی موت سے دوچار ہوتا ہے جو عبرت ناک بھی ہوتی ہے۔

ایک واقعہ ہمیں ہمارے استاد نے آٹھویں جماعت میں سنایا تھا۔ ”نہر کنارے جاتے ہوئے ایک آدمی نے لاش دیکھی، افسوس کیا اور پھر لالچ سے آلہ قتل خوبصورت تلواریں اٹھانے پر مجبور ہوا۔ جونہی تلوار کو نہر میں دھو کر اٹھا۔ پولیس آ پہنچی۔ موقع پر شواہد کے ساتھ پکڑا گیا۔ یہ منظر ایک اور آدمی دیکھ رہا تھا۔ اس نے پولیس کو کہا کہ یہ تو راہ گیر تھا لالچ میں پکڑا گیا۔ لیکن پولیس نے کہا۔ عدالت میں گواہی دیجئے ہم نے تو مقتول اور آلہ قتل

شواہد کے ساتھ اکٹھے پالے ہیں۔ چنانچہ اس بھلے آدمی نے اس شخص کے مقدمے کی پیروی کی لیکن سیشن جج نے بھی پھانسی کا فیصلہ کیا۔ جج سے علیحدگی میں حقیقت حال بیان کرنے پر یہ کہا گیا کہ اس شخص سے پوچھو کہ اس نے کبھی کوئی اور قتل کیا ہو۔ کیونکہ قدرت لکھوا رہی ہے۔ چنانچہ جب بھلے آدمی نے اس ملزم سے پوچھا تو اس نے اعتراف کیا کہ سوائے اللہ کے اور میرے کسی کو معلوم نہیں۔ واقعی میں نے قتل کیا تھا۔ تو اسے بتایا گیا کہ یہ اسی قتل کی پھانسی مل رہی ہے۔ ورنہ تیری رہائی کے لیے محض اللہ کی خوشنودی کے لیے میں نے کوشش کی تھی کیونکہ رشتہ تو کوئی نہ تھا۔“

زیر تربیت استاد کو اس کے بعد توجہ دلائی گئی کہ حدیث پاک کے حوالے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہوتے ہیں۔ قاتل کی سزا کو تو قرآن نے بیان کیا ہے۔ مقتول بھی چونکہ قتل کرنے کی نیت سے لڑتا ہے۔ لہذا نیت پر فیصلے کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس صورت میں تو مرے ہوئے بھائی کی فکر ہونی چاہیے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

حدیث پاک میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ قاتل مقتول جنتی ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی شخص نے کفر کی حالت میں کسی مسلمان کو شہید کیا، مقتول یعنی شہید تو جنتی ہوا لیکن قاتل بعد میں مسلمان ہو گیا۔ جیسے صحابہ کے واقعات موجود ہیں۔ اسلام میں آنے سے پہلے کے گناہ معاف ہو گئے اب یہ قاتل بری الذمہ ہو گیا اور ایمان کی برکت سے نہ صرف قتل سے بری ہوا بلکہ جہنم سے بھی بری ہو گیا۔
ہمارے ہاں عام طور پر دیہات میں دور جاہلیت کی طرح

”چچا نے بات ہی ایسی ایمان کی کہی تھی کہ میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی“

سینٹرل جیل

چوری کے ملزم نے عدالت میں اپنی صفائی میں کہا: ”میں اس بھری دنیا میں اکیلا ہوں۔ کھانے کو روٹی نہیں رہنے کو مکان نہیں اور بہت سے عرصے سے بے روزگار ہوں، اور نہ میرا کوئی دوست ہے۔“ یہ سن کر جج نے ”واقعی تمہاری کہانی بڑی دکھ بھری ہے، لہذا میں تمہیں جگہ بھیج رہا ہوں، جہاں تمہیں رہنے کی جگہ، دو وقت کا کھانا، دوست بنانے کا موقع ملے گا اور سب کچھ سرکاری خرچ پر ہوگا۔“ ملزم نے خوش ہو کر پوچھا: ”کہاں؟“ جج نے بولا: ”سینٹرل جیل میں۔“

ورغلا تے ہیں اور یہ گمراہی میں جا پڑتا ہے۔

یہود نے نافرمانیوں کی انتہا کی، مغضوب ہوئے، اللہ کا غضب ہوا۔ نصاریٰ نے راہ راست کو چھوڑا، بھٹکے، گمراہ ہوئے، ضال بنے۔ اسی لیے ہمیں رات دن میں پانچ بار نماز باجماعت میں سیدھا راستہ مانگنے کی توفیق دی گئی اور یہود و نصاریٰ کے راستے سے بچنے کی تلقین کی گئی اور دعا سکھائی گئی۔ اس ساری تحریر کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا غصہ اور ہماری خوشی، ہمارے کسی کو صدقہ، خیرات، نذر نیاز دینا، غرضیکہ جینا اور مرنا صرف اللہ کے لیے ہے اور سنت مصطفیٰ ﷺ کے مطابق ہوگا اور اللہ جہنم سے بچا کر جنت الفردوس میں فرمائیں گے تو کامیابی ہے۔

الحمد للہ کہ زیر تربیت استاد اپنے ارادے سے باز آگیا اور اسلامی نیک زندگی گزارنے کا عہد کیا۔ اللہ کریم ہمیں کفر، شرک، بدعت، ریا کاری، نفاق، تعصب، عناد، جہالت اور سینے کے کینے سے بچائے اور بچے سچے مسلمان کی زندگی اور ایمان والی موت نصیب فرمائے۔ آمین

عشق سے پیدا نوائے زندگی کا زیرو بم
عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوز دمدم
آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق
شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

(اقبال)

معمولی معمولی باتوں پر قتل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مسلمان کی نشانی یہ بیان کی گئی ہے کہ ”مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں“ (حدیث)

لہذا جس کے ہاتھ یا زبان سے کسی کو ناحق اذیت پہنچے اس کا یہ عمل گواہ ہے کہ وہ امن پسند (مومن) نہیں بلکہ فتنہ پرداز ہے اور فتنہ قتل سے بھی شدید ترین فعل ہے۔

(الفتنۃ اشد من القتل)

سچا مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسروں کی خیر خواہی، ہمدردی، بہتری، بھلائی، پیار، محبت، شفقت، دلجوئی، صلح، صلاح اور اصلاح کی بات اور عمل ہو نہ کہ وہ دوسروں کی عزت آبرو، جان مال اور عفت و عصمت کے درپے ہو۔ اس طرح معاشرہ بد امنی اور انتشار کا شکار ہو گا اور قعر مذلت میں گر کر عبرت کا کھنڈر بن کر رہ جائے گا۔

دراصل انسان دنیا میں خلیفہ یعنی نائب ہے۔ زمین و آسمان اور تمام مخلوقات اس کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ سورج، ہوا، پانی کوئی ایک چیز بھی ناپید ہو جائے تو ۷ ارب انسان ختم ہو جائیں۔ لیکن ۷ ارب انسان نہ رہیں تو سورج، چاند، ہوا، پانی اور زمین کی جملہ سبزیاں پھل پھول نباتات جمادات حیوانات کا کچھ نہ بگڑے گا۔ انسان محتاج ہے لیکن مخلوق اس کی خدمت پر مامور ہے۔ جب کہ اسے اللہ نے اپنی خدمت، اطاعت یعنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسے امانت دے کر بھیجا ہے۔ اس کا جسم اور اس کا ہر عضو اللہ کی امانت ہے اور اسے آمین خداوندی یعنی امانت ”قرآن مجید“ کے ضابطوں کے مطابق استعمال کرنا ہے۔ ورنہ یہ امانت میں خیانت کا مرتکب ٹھہرے گا اور سزا کے طور پر ابدی جیل یعنی جہنم میں جلے گا۔

اطاعت کی صورت میں ابدی جنتوں میں اللہ کا دیدار اور رسول اللہ ﷺ کا قرب نصیب ہوگا۔ اللہ الحمد۔ اللہ کریم میرے اور آپ کے مقدر میں فرمائے۔ (آمین)

انسان فطرتاً گناہ گار نہیں، ورنہ گناہ پر سزا نہ ہوتی۔ یہ فطرتاً معصوم، نیک اور مسلم ہوتا ہے۔ لیکن نفس، شیطان، ماحول اور حکومت (اگر غیر شرعی اور غیر اخلاقی ہو)

ایک چمپینزی کی انمول محبت میں بندھے ایک میاں بیوی کی خوفناک داستان

ان کا بیٹا کہیں کھو گیا تھا

انوکھا رشتہ

مدتوں بھلایا نہ جانے والا واقعہ

ایک نہیں دو چمپینزی اس پر حملہ آور تھے۔ دائیں آنکھ پر گھڑے نوکیلے بیجے

نے اس کی آنکھ نکال دی تھی چہرے کی کھال بُری طرح ادھر چکی تھی۔

چمپینزی پر جنون سوار تھا۔ وہ اس کا ناک کاٹ کر اسے ناقابل شناخت بنا چکا تھا۔

مگر اس کا حوصلہ ابھی تک ٹوٹا نہ تھا

رجی شاہد ترجمہ: صبا شفیق

ایک ماہر کارملینک تھا اور ریس کا شیدائی بھی.... ڈیانا اُس کی کالج کی کلاس فیلو تھی۔ پڑھائی کے دوران ہی دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو چکے تھے۔ مگر پھر جیمز کو لگا کہ اگر وہ شادی کرے گا تو اس کے کارریئر کے شوق میں رکاوٹیں آسکتی ہیں۔ ڈیانا دلہن بنی اُس کا انتظار کرتی رہی اور وہ شادی کرنے نہیں پہنچا۔

یہ کیلیفورنیا کا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ بات جلد ہی پھیل گئی اور لوگ جیمز کو طعنے دینے لگے۔ جیمز کو لگا اگر وہ کچھ عرصہ وہاں رہا تو لوگوں کے طعنے اُسے پاگل کر دیں گے۔ قصبے کے قریبی ساحل سے اُن دنوں ایک تجارتی جہاز افریقہ جا رہا تھا۔ جیمز نے کبھی کشتی بھی نہیں چلائی تھی۔ مگر اُس نے اس جہاز پر ملازمت کے لیے درخواست دے دی۔ خوش قسمتی سے اُسے جہاز پر عرشے کی تزئین و آرائش اور صفائی کا نگران بنا دیا گیا اور یوں جیمز کے لیے اپنے قصبے سے فرار کی راہ آسان ہو گئی۔

جیمز کی قسمت کہ چند دن بعد ہی جہاز میں کچھ خرابی ہو گئی اور اُسے تنزانیہ کے ساحل پر لنگر انداز ہونا پڑا۔ جہاز کے کچھ مسافروں نے مقامی لوگوں کے ساتھ مل کر قریبی جنگل میں شکار کا منصوبہ بنایا۔ جیمز بھی اُن کے ساتھ چل دیا۔ مگر بعد میں جیمز بہت پچھتا یا کیونکہ جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا اس کی سفاکی نے اُسے رات بھر سونے نہیں دیا تھا۔ اُن شکاریوں نے ایک مادہ چمپینزی کو شکار کیا اور اُسے ذبح کر ڈالا تھا۔ جب کہ اُس کا بچہ ابھی صرف ایک دن کا تھا۔ جیمز رات بھر بے چین رہا، صبح وہ اٹھا اور اکیلا جنگل کی طرف چل دیا اور اُس چمپینزی کے بچے کو ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اُسے جھاڑیوں میں چھپا بھورے بالوں، گلابی چہرے اور حیرت، خوف اور معصومیت بھری آنکھوں سے اپنی طرف دیکھتا چمپینزی کا بچہ نظر آ گیا۔ جیمز نے اسے گود میں اٹھا لیا اور جہاز پر واپس آ گیا۔ مگر جہاز میں

کوئی شدید خرابی پیدا ہو چکی تھی اور وہ سفر کرسٹل قابل نہیں تھا۔ اب جیمز کے اوپر نئے چمپینزی کی ذمہ داری تھی۔ جیمز دن کے وقت قصبے اور جنگل گھوم کر پھل، انڈے اور کھانا حاصل کرتا اور راستہ جہاز پر آ کر سو جاتا۔ تقریباً ایک ماہ یہی سلسلہ رہا۔ جیمز اس دوران کوشش کرتا رہا کہ اس کے کیلیفورنیا جانے کا انتظام ہو جائے۔ آخر کار قصبے ایک آدمی کو اُس پر رحم آ گیا وہ اُسے جرمن مشینوں کے پاس لے گیا اور اُس کو گھر پہنچانے میں اُن سے مدد درخواست کی۔ جیمز کی قسمت اچھی تھی۔ چند دن میں اُس کی ٹکٹ کا انتظام ہو گیا۔ جیمز جب جہاز سے اترتا اُس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا صرف اس کی بیٹی میں ایک چمپینزی کا بچہ تھا۔ جیمز کی ماں ایئر پورٹ اُسے لینے آئی تھی۔ مگر بیٹے کی حالت دیکھ کر وہ رو پڑی۔ جیمز بہت کمزور ہو گیا تھا۔ ڈیانا بھی وہاں موجود تھی مگر اس نے اس سے کچھ نہ کہا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ خود اسے بتائے کہ وہ اسے اس طرح چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں مگر دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔ جیمز کی ماں کو بھی چمپینزی کے بچے سے انسیت محسوس ہوئی اور اُس نے اسے گود میں لیا۔ وہ بھی آرام سے جیمز کی ماں کی گود میں چلا گیا۔ انھوں نے اس کا نام ”مونی“ رکھا۔ اب وہ دونوں زیادہ تر وقت مونی کے ساتھ گزارتے۔ ڈیانا کی ماں جیمز کی ماں کی بہت اچھی دوست تھی۔ وہ بھی مونی میں دلچسپی لینے لگی۔ ڈیانا بھی اکثر مونی کو دیکھنے جاتی اور یوں ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جوڑنے لگا۔ جیمز نے ڈیانا سے اپنے رویے کی معذرت کی اور پھر سے اس سے شادی کی درخواست کی گو کہ اس میں اس کو چار سال لگ گئے۔ ڈیانا نے اُس کی درخواست ایک بار پھر قبول کر لی کیونکہ وہ جیمز سے ابھی بھی شدید محبت کرتی تھی۔ شادی پر ان کا مہمان خصوصی تھا مونی جو اب ۴ سال کا ہو چکا تھا۔ کالے پیٹ کوٹ میں ملبوس تھا

اور بے حد خوش تھا۔ وہ ایک میز سے دوسری میز پر چھٹیں مارتا رہا اور تمام مہمانوں کو محفوظ کرتا رہا۔ ان ۴ برسوں کے دوران قصبے کے تمام لوگ مونی سے محبت کرنے لگے تھے۔ وہ بے حد ذہین تھا اور اپنی شرارتوں سے سب کا دل بہلاتا تھا۔ وہ اپنے پیچھے استعمال کرنے میں بے حد محتاط رہتا تھا کہ کسی کو بھی اُس سے کوئی ایذا نہ پہنچے۔

جیمز کو بچے بہت پسند تھے اور اس کی خواہش تھی کہ ان کے ڈھیر سارے بچے ہوں۔ شادی کے چند ماہ بعد جب وہ اور ڈیانا اس سلسلے میں ڈاکٹر کو دکھانے گئے تو ان پر انکشاف ہوا کہ ڈیانا کو بیضہ دانی کا کینسر ہے اور وہ بھی ماں نہیں بن سکتی۔ یہ خبر دونوں پر بجلی بن کر گرئی۔ کیونکہ وہ دونوں چاہتے تھے کہ ان کا گھر بچوں سے بھر جائے اور وہ پورے گھر میں ادھر سے ادھر بھاگتے پھریں۔ ڈیانا اپنی ماں کے گھر آ گئی اور اُس نے جیمز سے کہا کہ وہ اُسے طلاق دے دے اور دوسری شادی کر لے کیونکہ وہ اسے اولاد نہیں دے سکتی۔ ”میں اپنی بیماری کی سزا تمہیں نہیں بھگتے دوں گی۔“ اس نے جیمز سے کہا۔ مگر جیمز بھی ڈیانا سے بہت محبت کرتا تھا وہ روزانہ ڈیانا کو منانے جاتا اور اُس سے گھر چلنے کی درخواست کرتا مگر ڈیانا بھند تھی کہ وہ اسے چھوڑ دے اور دوسری شادی کر لے۔ تب جیمز نے اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیا۔ ”میں کبھی دوسری شادی نہیں کروں گا اور اولاد نہ ہونے کو اپنے رشتے کے ختم ہونے کی وجہ نہیں بنے دوں گا۔“ بالآخر اُس نے ڈیانا کو قائل کر لیا کہ اُس کا مونی بھی تو اس کے بچے کی طرح ہے اور وہ ہمیشہ اُن کے بچے کی طرح ان کے ساتھ رہے گا۔

مگر اچھی قسمت کو ان کا اور امتحان مقصود تھا۔ قصبے سے کسی حاسد نے ان کے خلاف درخواست دائر کر دی کہ انھوں نے ایک جنگلی جانور گھر میں پال رکھا ہے۔ جو بھی بھی شہریوں کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ کیس کورٹ میں چلا گیا۔ مونی جب جیمز اور ڈیانا کے ساتھ

کورٹ میں پیش ہوا تو اُس نے نیلی جیمز اور چیک ٹی شرٹ اور بوٹ پہن رکھے تھے وہ بالکل ایک جنٹل مین کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ رپورٹروں سے گلے ملا اور وکیلوں سے ہاتھ ملایا اور اُن کا منہ چوما۔ جیمز اور ڈیانا نے عدالت میں کہا ”مونی ہمارا بیٹا ہے اور ہمارے خاندان کا حصہ ہے وہ کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچائے گا اور یہ ہماری ذمہ داری ہے۔“

قصبے کے لوگوں نے بھی جیمز کا ساتھ دیا اور سب نے یہی کہا کہ مونی نہایت شریف جانور ہے اور انھیں اُس سے کوئی خطرہ نہیں اور پھر عدالت نے جو فیصلہ دیا وہ پورے امریکا کے اخباروں کی زینت بنا۔ جج جیک نے فیصلے میں لکھا ”میں نے مونی کا جتنا بھی مشاہدہ کیا ہے۔ مونی میں وحشی جنگلی جانوروں والی کوئی خصوصیت نہیں پائی بلکہ مونی بعض انسانوں سے بھی زیادہ تہذیب یافتہ ہے۔“ جیمز اور ڈیانا مقدمہ جیت گئے اب انھیں مونی سے کوئی علیحدہ نہیں کر سکتا تھا۔

ڈیانا بالکل ایک چھوٹے بچے کی طرح اُس کی تربیت کرنے لگی۔ اس نے مونی کو چھری کاٹنے کے ساتھ کھانا سکھایا۔ اُسے لیٹرین کا استعمال سکھایا۔ جیمز اور ڈیانا اس کے ساتھ بالکل یوں کھیلتے تھے جیسے وہ ان کی سگی انسانی اولاد ہو۔

وہ مل کر ٹی وی دیکھتے مونی ان کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتا۔ گھر کے لان میں مونی کے لیے ایک پنجرہ نما کمرہ بھی بنایا گیا اور گھر میں بھی مونی کے لیے علیحدہ کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔ مگر چونکہ شروع میں وہ مونی کو اپنے ساتھ سلاتے تھے۔ اس لیے اب بھی اکثر وہ رات کو ان کے ساتھ سونے کی ضد کرتا یا پھر رات میں ان کے سونے کے بعد ان کے ساتھ آ کر سو جاتا۔

جیمز اس کو اکثر شام کو پارک میں لے جاتا۔ جہاں وہ خوب کھیلتے۔ اگر جیمز تھک جاتا تو بھی مونی ضد کر کے اُسے کھیلنے پر مجبور کر دیتا۔ ڈیانا اور جیمز نے مونی کو رنگ بھرنا اور اپنا نام لکھنا بھی سکھایا۔ مونی بہت ذہین تھا وہ

انتہائی خوبصورت رنگوں کا انتخاب کرتا بعض اوقات ڈیانا حیران رہ جاتی اور جیمو سے کہتی ”دیکھو ہمارا بیٹا تو مصور ہے۔“ مونی جانے اُس کی بات سمجھ پاتا تھا یا نہیں مگر وہ پیار سے اُس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا اور اُس کے گال چومتا۔ جیمو جب کارریس کے لیے جاتا تب بھی اکثر مونی اس کے ساتھ جاتا۔ جیمو اور ڈیانا شاپنگ پر جاتے یا گھومنے ساحل پر جاتے تو مونی ان کے ساتھ ہوتا۔ ہولوں اور ریستورانوں میں بھی مونی ان کے ساتھ ہوتا۔ مونی پیڑ، کافی اور پیزا کا شوقین تھا۔ انھوں نے ۳ سیٹوں والی ایک سائیکل خریدی۔ اب مونی درمیان میں بیٹھتا اور وہ ایک خوش و خرم خاندان کی طرح گھومتے پھرتے۔ اس دوران مونی کی شہرت بڑھنے لگی اور اس نے (Sesame Street) سی ایم اسٹریٹ اور BJ and The Bear جیسے مشہور ٹی وی شوں میں کام بھی کیا۔ وہ جیمو اور ڈیانا کو اشاروں سے ہر بات سمجھا لیتا تھا۔ جب اس کا دل گاڑی میں گھومنے کو کرتا تو وہ ہاتھوں کو یوں گھماتا جیسے گاڑی چلا رہا ہو اور جیمو کو کار کی چابیاں پکڑاتا۔ زندگی کے ۳۰ برس اسی طرح گزر گئے۔ مگر مونی اسی طرح شوخ و شراتی تھا۔ مگر اب وہ کچھ کچھ غصیلا ہوتا جا رہا تھا۔ ڈیانا کبھی کبھی جیمو سے کہتی ”ہمارا بیٹا ۳۰ سال کا ہو گیا ہے مگر ابھی بھی چھوٹا بچہ ہے۔“

جیمو اور ڈیانا کی پُرسکون زندگی اس وقت متاثر ہوئی جب ایک دن مونی کے پنجرے کی روشنیوں میں کچھ خرابی ہو گئی اور انھیں ٹھیک کرنے کے لیے الیکٹریشن کو بلا لیا گیا۔ وہ شاید اناڑی تھا۔ وہ نالائق ایک تارنگی چھوڑ گیا۔ مونی جب پنجرے میں آیا تو اس کا ہاتھ اتفاقاً تار پر پڑ گیا۔ اُسے شدید بجلی کا جھکا لگا، وہ شدید خوفزدہ ہو گیا اور چیختا ہوا گھر سے باہر بھاگ گیا۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ کتنی دیر تک گھر نہیں آیا اور چیختا ہوا گلیوں میں پھرتا رہا۔ کسی نے پولیس کو بلا لیا مگر جب اُسے پکڑنے کی کوششیں کی تو اس نے ۲ پولیس والوں کو زخمی کر دیا اور پولیس کی گاڑی پر چڑھ کر اسے بھی خراب کر دیا۔

مونی اب ۳۱ سال کا ہو چکا تھا اور اس حرکت کے بعد حکومت نے فیصلہ کیا کہ ایک چیمپینزی کا یوں کھلے عام آبادی میں رہنا ٹھیک نہیں کسی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ انھوں نے جیمو سے کہہ دیا کہ وہ مونی کو کسی چڑیا گھر یا جانوروں کے پارک میں دے مگر جیمو نے انکار کر دیا۔

کچھ دن بعد اس دن دوپہر کے ۲ بج رہے تھے جب پولیس کی گاڑیوں نے جیمو کے گھر کو گھیرے میں لیا اور مونی کو ان کے حوالے کرنے کا تقاضا کیا۔ جیمو نے مونی کو ان کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے جیمو کو دھکے مار کر گھر سے نکالا اور باہر لان میں گھنٹوں کے بل بیٹھا دیا۔ پھر انھوں نے بندوں کے ذریعے مونی کو بے ہوشی کا ٹیکا لگا دیا۔ سوئی چبھتے ہی مونی اپنے پنجرے میں پیچنے چلانے لگا اور اپنے ہاتھوں اور پیروں سے پنجرے کی سلاخیں اکھیڑنے کی کوشش کرنے لگا اور پھر جلد ہی دوا کے زیر اثر بے ہوش ہو گیا۔ انھوں نے اسے اسٹریچر پر ڈالا اور لے گئے۔

ڈیانا اور جیمو کے لیے وہ لمحے قیامت کے تھے۔ دونوں گھنٹوں روتے رہے اور تمام رات جاگتے رہے۔ قصبے کے لوگ وقتاً فوقتاً انھیں دلاسا دینے آتے رہے اور سب نے انھیں اپنی حمایت کا یقین دلایا پھر تقریباً ۸ ہزار لوگوں نے حکومت کے نام درخواست پر دستخط کیے جس میں لکھا گیا تھا کہ مونی کو واپس جیمو اور ڈیانا کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دیں۔

مگر قصبے کی انتظامیہ اس بات پر راضی نہ ہوئی۔ معاملہ عدالت میں چلا گیا۔ جانوروں کے حقوق کی تحفظ بھی اس میں شامل ہو گئیں اور جیمو اور ڈیانا پر ایک جانور کو قید میں رکھنے کا الزام لگا دیا گیا۔ ادھر مونی کی حالت خراب تھی وہ کچھ کھاتا پیتا نہیں تھا اور شدید کمزور ہو گیا تھا اور پھر ایک دن اس ادارے سے جہاں مونی کو رکھا گیا تھا آنے والی ایک فون کال نے جیمو اور ڈیانا کو ڈالا۔ انھیں بتایا گیا ”آپ کا چیمپینزی بس مرنے لگا۔“

جیمو اور ڈیانا فوراً ادارے میں پہنچے۔ مونی بہت مایوس تھا مگر اس وقت وہ اپنی ہی گندگی میں لت پت پڑا تھا اس کی حالت بے حد خراب تھی۔ مگر انھیں دیکھ کر اس میں زندگی کی رقی اچانک لوٹ آئی۔ انھوں نے درخواست کی کہ انھیں روزانہ مونی سے ملے دیا جائے۔ ان کی درخواست قبول ہوئی مگر ہفتے میں صرف ایک بار انھیں مونی سے ملنے کی اجازت ملی۔ مگر اس کی قریب جانے کی اجازت پھر بھی نہیں ملی۔ انھوں نے اس کے پنجرے میں بیوی رکھوایا اور ہر ہفتے اس کی پسند کے کھانے اور کھلونے لے کر جاتے وہ اشارے کرتا انھیں پاس بلاتا وہ ڈیانا کا ہاتھ چومنا چاہتا تھا اور جیمو سے گلے ملنا چاہتا تھا۔ وہ اشاروں میں انھیں سمجھاتا کہ اسے گھر لے چلیں۔ جیمو اور ڈیانا غریب جاتے وہ جانتے تھے جتنا پیار وہ مونی سے کرتے ہیں اتنا ہی وہ ان سے کرتا ہے۔ ان کی مجبوری انھیں دلائی۔ سال گزرنے لگے عدالت میں مقدمہ چلتا رہا مگر انھیں مونی واپس نہیں ملا۔

اس دوران وہ مونی کے لیے ایک بہتر جگہ کی کوشش کرتے رہے۔ ۵ سال بعد آخر کار وہ مونی کو ایک ایسے پارک میں منتقل کرانے میں کامیاب ہو گئے جہاں اس کو اس ادارے سے زیادہ سہولیات مل سکتی تھیں۔ وہ مونی کو چھو سکتے تھے، گلے لگا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دونوں جتنی دیر چاہتے مونی کے ساتھ رہ سکتے تھے۔ گو کہ وہ جگہ دور تھی مگر دونوں میاں بیوی ہر ہفتے ڈھائی گھنٹے کا سفر کر کے مونی سے ملنے جاتے۔ وہ اس کے لیے تحفے اور اس کی پسند کے کھانے بھی لے جاتے۔

یہ مونی کی ۳۹ ویں سالگرہ کا دن تھا جیمو اور ڈیانا نے خصوصی طور پر ایک کیک تیار کرایا۔ مونی کو رس بھری بہت پسند تھی۔ اس لیے انھوں نے رس بھری کیک بنوایا اور اس کے لیے چاکلیٹ کا ایک بڑا ڈبا بھی لیا اور غباروں اور دیگر تحفوں کے ساتھ وہ مونی سے ملنے پہنچے۔ مونی تحفے پا کر بے حد خوش ہو رہا تھا۔ وہ تالیاں بجا رہا تھا اور پھر اس نے جیمو کا منہ چوما اور اس کے ہاتھ چومنے لگا۔ جیمو بھی

آج اتنے برسوں بعد مونی کو خوش دیکھ کر بہت مسرور تھا وہ بھی پنجرے کی سلاخوں سے ہاتھ ڈال کر مونی کو گلے لگا رہا تھا اور پیار کر رہا تھا۔ ڈیانا نے کیک کاٹا، مونی اور جیمو کے منہ میں دونوں ہاتھوں سے ایک ساتھ ڈال دیا۔ مونی کیک کھانے اور تالیاں بجانے لگا۔

ڈیانا اور کیک لینے مڑی تو اسے کوئی ۴۰ رفٹ دور ایک چیمپینزی کھڑا نظر آیا۔ وہ پنجرے سے باہر تھا اور نجانے کیسے کھلا رہ گیا تھا۔ پلک جھپکنے میں وہ ڈیانا کے سر پر پہنچ گیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ ڈیانا بھاگی اسی اثناء میں جیمو اس کے قریب پہنچ گیا اور اسے بچانے کی کوشش کرنے لگا مگر اس دوران چیمپینزی ڈیانا کا بائیں ہاتھ کا انگوٹھا چبا کر توڑ چکا تھا۔ جیمو نے ڈیانا کو اس گرفت سے چھڑایا اور میز کے نیچے دھکیل دیا جس پر کیک رکھا تھا۔ وہ خوفناک چیمپینزی اب جیمو کے درپے ہو گیا۔ جیمو بھاگنے لگا مگر کیا دیکھتا ہے کہ دوسری طرف سے ایک اور چیمپینزی اس کی طرف بھاگا آ رہا ہے۔ اب جیمو درمیان میں تھا اور دونوں چیمپینزی اس پر حملہ آور تھے وہ اپنے ہاتھوں سے انھیں پیچھے دھکیل رہا تھا مگر ان کی طاقت کے آگے وہ بے بس تھا۔ ایک چیمپینزی نے اپنے دانت اس کی دائیں آنکھ کے قریب اس کی پیشانی پر گاڑ دیے اور پھر اپنے لمبے نوکیلے ناخن سے ایک دائیں آنکھ نکال ہی دی پھر اس نے جیمو کی ناک کو بری طرح چبا ڈالا۔ اس دوران دوسرا چیمپینزی اس کے ہاتھوں کی انگلیاں چبا رہا تھا۔ پھر پہلے والے چیمپینزی نے اپنے خونی پنجوں سے جیمو کے چہرے کی بائیں طرف کی کھال کو بری طرح ادھیڑ ڈالا اور پھر اس کی کھوپڑی میں دانت گاڑ دیے۔ دونوں چیمپینزیوں پر جنون سوار تھا انھوں نے پھر اس کے ہونٹ بھی چبا ڈالے۔ جیمو زمین پر گر گیا۔ ڈیانا مسلسل چیخیں مار رہی تھی مگر ابھی تک وہاں مدد کے لیے کوئی نہیں آیا تھا۔ جیمو کے نیچے گرنے کے بعد انھوں نے اُس کا بایاں پاؤں بری طرح چبا ڈالا اور اس کی ٹانگوں کو نوچنے لگے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اسے زندہ کھا جانا چاہتے ہیں۔ ڈیانا

سرخ فیتہ ہے کیا جو تاخیر کے اسباب کا لازم حصہ بن گیا

سرخ فیتے کے کرشمے

ان کیلئے خاص جنہیں سرکاری دفاتروں اور افسروں نے بے دم کئے رکھا
آپ کی حیرتوں کو دو چند کرنے والے دلچسپ واقعات

قدرت اللہ شہاب نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ضروری
فائلیں دبا کر رکھنے کی اہلکاروں کی پرانی عادت ہے۔ ان کی
اسی عادت کو ہم نے سرخ فیتے کا نام دے رکھا ہے۔
تاخیر کے اسباب میں سرخ فیتے کا کردار دنیا بھر میں
دیکھا جاسکتا ہے۔ اس میں کسی ملک اور قوم کی تخصیص نہیں۔
ان واقعات کا ذکر قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔
ڈاکٹر جاسن سیلی، میک گل یونیورسٹی مانٹریال، کینیڈا
میں ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ ایک کم وقوع پذیر مرض
(PERI-ARTERITIS NODOSA) پر تحقیق کر رہے
تھے۔ اس قسم کے مریض کا پیشاب تحقیق کے لیے درکار
تھا۔ ایسا مریض برٹنن قصبے میں دریافت ہوا۔ اس کا
پیشاب حاصل کر کے بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ لیکن کینیڈا کے
کسٹم کے حکام کے قواعد میں اس قسم کی کسی تجارتی چیز کا
اندراج نہ تھا۔ چونکہ تاخیر سے پیشاب تجارت کے قابل
نہ رہتا، اس لیے کالج کے ڈین نے کسٹم کے اعلیٰ ترین افسر
سے رابطہ قائم کیا۔

محکموں میں کام نمٹانے میں
تاخیر کے متعدد اسباب ہو سکتے
ہیں لیکن سب سے زیادہ بدنامی
کا حامل سرخ فیتہ ہے۔ اصل
میں جب کسی معاملے کو حل کرنے میں دشواری محسوس ہوتی
ہے تو تحقیق اور استفسارات کا ایک چکر چلتا ہے۔ اس طرح
فائل خنجم ہوتی جاتی ہے۔ ان کاغذات کو سنبھالنے کے لیے
ایک گتے کے ساتھ سرخ فیتے سے باندھ دیا جاتا ہے۔
ہوتے ہوئے یہ سرخ فیتہ بھی تاخیر کے اسباب میں نمایاں
ہوتا چلا گیا اور ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔
تقسیم ملک کے بعد ابتدائی دور میں سرکاری طور پر
پاکستان کا شخص اجاگر کرنے کے لیے جو تبدیلیاں کی
گئیں، ان میں سے ایک دلچسپ تبدیلی یہ تھی کہ سرخ کے
بجائے فیتے کا رنگ سبز کر دیا گیا۔ لیکن اس سے کارکردگی
پر کوئی اثر نہ پڑا کیونکہ یہ محض ایک فیتہ نہیں بلکہ ایک ذہنیت
کا نام ہے جو بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔

سرکاری

کا منہ بس اس قابل ہو سکا کہ کچھ تھوڑا بہت کھا لیا
مگر وہ بھی منہ ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے آدھا کھا لیا
اندراج جاتا تھا اور آدھا باہر گرتا تھا۔ اس کے دائیں
کی تین انگلیاں نہیں تھیں۔ صرف ان کی چوڑی
اس کے بائیں ہاتھ کی حالت اس سے بھی بُری تھی
اپنے ہاتھوں سے کچھ پکڑ نہیں سکتا تھا۔
مگر جیمو کی ہمت کہ وہ زندہ تھا۔ اس کی وفاداری
اور خدمت گزار بیوی نے اس کی خدمت میں دن رات
ایک کر رکھا تھا۔ گزر اوقات کے لیے اب وہ جیمو کی
اپنے گیراج میں گاڑیاں ٹھیک کرتی تھی اور جیمو اس
رہنمائی کرتا تھا۔ اس سارے مشکل دور میں بھی
نے مونی کو کبھی فراموش نہیں کیا اور اسے پہلے سے
بہتر ایک جنگل پارک میں بھجوانے کی کوشش کرتے
رہے۔ حادثے کے چند مہینوں بعد مونی کو پارک منتقل
دیا گیا۔ جیمو کی جیسی بھی حالت تھی وہ اسی حالت میں
۳۵ منٹ کا سفر کر کے ہر ہفتے پھر سے مونی سے ملنے
جانے لگا۔ گو کہ اس کی یہ حالت چیمپیونز نے کی تھی مگر
مونی اس کے لیے چیمپیونز نہیں بلکہ اس کی سگی اولاد کی
مانند تھا اور پھر ایک دن ایک خبر نے انھیں ہلا ڈالا۔
پارک کے مالک نے انھیں کال کی اور بتایا کہ مونی اپنے
پنجرے کی ۶ سلاخیں توڑ کر فرار ہو گیا ہے۔ جیمو اور ڈیانا
فوراً پارک پہنچے اور مونی کی تلاش شروع ہو گئی۔ انھوں
نے سارا پارک چھان مارا مگر مونی نہیں ملا۔
آج بھی جیمو اور ڈیانا زندہ ہیں۔ جیمو اپنی تمام
معذوریوں کو ہمت سے سہہ رہا ہے اور ڈیانا اپنی ہمت سے
بڑھ کر اس کی خدمت کر رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ
دونوں محبت، پیار، ایثار، وفا اور ہمت کی انمول داستانیں
ہیں۔ وہ کبھی قسمت سے گلہ نہیں کرتے، کبھی اپنی حالت پر
نہیں روتے..... ہاں روتے ہیں تو صرف اس بات پر
ان کا بیٹا مونی کہیں گھو گیا ہے اور وہ دونوں اس امید پر
زندہ ہیں کہ وہ ایک بار پھر اس سے ضرور ملیں گے۔ انھیں
یقین ہے وہ لوٹ کر آئے گا.....

کے مسلسل چیخنے پر گارڈ وہاں آ گیا اور اس نے دونوں
چیمپیونز کو باری باری گولی ماری۔
جیمو کی حالت نازک تھی۔ انھوں نے اس کو نوچ نوچ
کر ناقابل شناخت بنا دیا تھا مگر ایسے میں جیمو نے ثابت
کیا کہ وہ نہایت مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ اس کا
خون بُری طرح بہہ رہا تھا جسم کا کوئی حصہ سلامت نہ تھا مگر
وہ ہوش میں تھا۔ جب اس کو ایمبولینس میں ڈالا جا رہا تھا۔
ڈیانا رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی ”تم مجھ سے پہلے نہیں مر
سکتے جیمو کبھی نہیں.....“
جب ڈیانا کی نظر مونی پر پڑی تو وہ سکتے میں تھا اور
اپنے پنجرے کے کونے میں ڈبک گیا تھا اس کی نگاہیں
جیمو پر گڑی تھیں اور جیمو کے جسم سے نکلتا خون مونی کی
آنکھوں سے آنسو بن کر گر رہا تھا۔
جیمو کی زندگی باقی تھی۔ جو وہ اس قدر خوفناک
حملے کے بعد بھی بچ گیا۔ ڈیانا کے اس یقین اور محبت
نے اسے بچا لیا۔ اس کی سیکڑوں کے حساب سے
سرجریاں ہوئیں۔ وہ زندہ بچ گیا تھا مگر جب مہینوں
بعد اسے پہلی بار مکمل ہوش آیا تو اس کا پہلا سوال ہی تھا
”مونی کیسا ہے؟“ ڈیانا نے اسے تسلی کرائی کہ مونی
بالکل ٹھیک ہے اور وہ جلد اسے دیکھے گا۔ جب جیمو کی
حالت ذرا سنبھلی تو ڈیانا اسے گھر لے آئی۔ مگر وہ اب
ایک معذور شخص تھا جو نہ خود کپڑے بدل سکتا تھا نہ نہا
سکتا تھا یہاں تک کہ کسی کی مدد کے بغیر کھانا بھی نہیں کھا
سکتا تھا۔ اپنے ضروری امور کے لیے بھی وہ ڈیانا کا
محتاج تھا۔ دائیں پاؤں کی ایڑی میں ایک دو انچ کا
سوراخ تھا۔ اس کے چہرے پر اب ناک نہیں بلکہ اس
کی جلد کے ساتھ ہی دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے
جن سے وہ سانس لیتا تھا۔ اس کی بائیں آنکھ کی جگہ
ایک مصنوعی عدسہ لگا تھا اس کے چہرے اور گالوں کی
چونکہ کوئی ہڈی بھی سلامت نہیں بچی تھی۔ اس لیے کوئی
بھی اسے پہچان نہیں سکتا تھا۔ چیمپیونز نے اس کے
ہونٹ چبا ڈالے تھے اور کئی سرجریوں کے بعد بھی اس



شہنشاہ الیگزینڈر اول (روس) کو ایک دفعہ سر درد ہوا۔ معالج نے موم بتیاں منگووانے کو کہا تا کہ شہنشاہ اس کا دوا لے سکیں۔ ۹۱ سال کے بعد چالیس لاکھ موم بتیوں کے ٹکڑے محل میں ملے کیونکہ کسی نے موم بتیاں منگووانے کا حکم واپس نہیں لیا تھا۔



ناول نویس اور مضمون نگار جارج برننگھم، قلم کاری سے پہلے ویسٹ پوائنٹ میں پادری تھا۔ جہاں اسے بشپ اور دیگر مذہبی حکام کی طرف سے آنے والے سوالنامے پُر کرنے پڑتے تھے۔ وہ ہر سال محکمہ تعلیم کی طرف سے آنے والے سوالناموں سے بہت تنگ آگیا جن میں ہر دفعہ یہ دریافت کیا جاتا تھا کہ اس کے ہاں سکول کے کمرے کی لمبائی

چوڑائی کس قدر ہے۔ پہلے اور دوسرے سال تو اس نے مطلوبہ معلومات لکھ بیچیں لیکن اس دفعہ اس نے کلاس روم کی لمبائی چوڑائی دینی کر دی۔ کسی نے اسے کچھ نہ کہا۔ چنانچہ وہ ہر سال اسے بڑھاتا رہتا آئندہ ۶۷۵ سال کے عرصے میں کلاس روم سینٹ پال کے گرجے سے بھی بڑا ہو گیا۔ لیکن محکمہ تعلیم کے دفتر میں کسی نے دلچسپی نہ لی۔ اگلے سال اس نے اچانک کلاس روم کی لمبائی چوڑائی اس قدر کم کر دی کہ وہ ایک چھوٹے کیمین کے برابر رہ گئی۔ اتنے چھوٹے کلاس روم میں تین طالب علم بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ لیکن اس کا بھی کسی نے نوٹس نہ لیا کیونکہ کسی کو ان معلومات کی ضرورت نہ تھی۔ صرف نظام کو مطمئن رکھنا درکار تھا۔ (ریڈرز ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۸۰ء، صفحہ ۶۰)

اتنے عرصے تک مجھے نہیں ملے کہ سال ختم ہو گیا ہے۔ اب اس رقم کی وجہ سے مجھ پر زکوٰۃ واجب ہو گئی ہے۔ اس کا کون ذمہ دار ہے۔ اس قسم کے خطوط لکھنے پر محکمے کے ڈائریکٹر نے ڈاکٹر صاحب کی سرزنش کی لیکن پرنا لہ وہیں رہا، کہ سرخ فیتے



ڈاکٹر نعیم اقبال کی تقرری بطور میڈیکل آفیسر بلوچستان کے قصبے خاران میں ہوئی۔ سرخ فیتے کی وجہ سے چند ماہ انہیں تنخواہ نہ مل سکی۔ کئی یاد دہانیوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو انہوں نے محکمے کے ڈائریکٹر کو لکھا۔ ”میرے واجبات سرکاری خزانے میں جمع ہوتے جا رہے ہیں اور میرے سر پر قرضوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔“ اسی طرح ایک دفعہ ان کی چند ماہ کی تنخواہ ملنے میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ مالی سال ختم ہو گیا اور جیسا کہ عام دستور ہے بجٹ کی جو رقم اسی مالی سال میں خرچ نہ کی جا سکی ہو، وہ واپس سرکاری خزانے میں چلی جاتی اور پھر اس کا وہاں سے برآمد کر کے وصول کرنا بہت دشواریوں کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر نعیم اقبال نے محکمے کو لکھا کہ میرے واجبات

غیر منقسم ہندوستان کی ایک ریاست کے مہاراجہ نے ایک دفعہ یہ فرمان جاری کیا کہ چونکہ بعض شریر لوگ آگ لگنے کی غلط اطلاع دے کر فائر بریگیڈ والوں کو پریشان کرتے ہیں، اس لیے جب بھی کہیں آگ لگے مہاراجہ کے ذاتی حکم کے بغیر فائر بریگیڈ نہ بھیجا جائے۔ اتفاق سے ایک بلڈنگ میں آگ لگ گئی۔ فائر بریگیڈ والوں کو اطلاع دی گئی۔ ان کا نمائندہ مہاراجہ کے محل کو



روانہ ہوا۔ وہاں پہنچنے پر اسے پتہ چلا کہ مہاراجہ تو عازم انگلستان ہو چکے ہیں۔ مہاراجہ کو چھٹی بھیجی گئی چند ماہ بعد مہاراجہ کی منظوری کی اطلاع پہنچی تو فائر بریگیڈ والے زور و شور سے گھنٹیاں بجاتے منزل مقصود پر پہنچے تو جلی ہوئی بلڈنگ کی جگہ نئی بلڈنگ تعمیر ہو چکی تھی۔

ریکارڈ چیک کیا تو پتہ چلا کہ ماتحت ہسپتالوں اور دیگر اداروں میں سے کم و بیش ۲۰ لاکھ روپے ہیں جہاں کوئی ٹرس متعین نہیں۔ لیکن ہر دفعہ وہاں سرکلر پیسجے جاتے تھے اور وہاں سے ہر دفعہ Nil Statement آ جاتی تھی۔ میں نے ایک سرکلر جو نرسوں کے بارے میں تھا، اس کی صرف ۸۰ نقول کی فرمائش کر دی تو دفتری، سائیکلو سٹائل کرنیوالے حتیٰ کہ برانچ سپرینٹنڈنٹ نے بھی اعتراض کیا کہ ہمارے تو سو کے قریب ماتحت دفاتر ہیں، میں بڑی مشکل سے انہیں قائل کر سکا کہ جہاں نرسیں ہی موجود نہیں وہاں سے ہر دفعہ نفی میں جواب حاصل کرنے میں وقت اور پیسے کا کس قدر ضیاع ہوگا۔



چند دن بعد ایک معذرت کا خط آیا کہ اس پارسل کو ”استعمال شدہ ذاتی اشیا“ کے طور پر ڈیوٹی سے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اب دیر ہونے کی وجہ سے یہ پیشاب تجربے کے لیے بیکار تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر جانسن نے سارے معاملے کو بھلا دیا۔ کچھ مدت گزرنے کے بعد کسٹم حکام کی طرف سے ایک نوٹس ملا اگر آپ پانچ دن کے اندر اپنا مال وصول نہ کریں گے تو اسے کھول کر نیلامی کے ذریعے فروخت کر دیا جائے گا۔ (ریڈرز ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۸۳۱)

مغربی پاکستان (ون یونٹ) کے نظامت صحت کی P.E.II Branch میں ہر سرکلر کی ایک سو نقول تیار کی جاتی تھیں کیونکہ ماتحت دفاتر ۹۹ تھے اور ایک نقل دفتر کے ریکارڈ کے لیے درکار ہوتی تھی۔ میں نرسنگ کے شعبے کا متعلقہ کلرک تھا۔ میں نے





۱۸۰۲ء میں برطانوی ساحل پر قصبہ RYE کے
ہندوستانی ارباب اختیار نے ایک مسلح سنتری کی ڈیوٹی ساحل
پر لگائی تاکہ اگر نیپالین برطانیہ پر حملہ کرے تو بروقت اطلاع
میں سکے۔ اس ڈیوٹی پر متعین آخری شخص چمی بارٹن تھا۔
۱۸۰۳ء سے یہ ڈیوٹی اس کے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ وہ
۱۹۳۳ء میں مر گیا تو قصبہ کی کونسل نے یہ ڈیوٹی ترک کر دی۔
اس وقت تک نیپالین کو مرے ہوئے ۱۲۳ سال گزر چکے تھے۔

رومن کیتھولک چرچ نے اٹلی کے قصبہ LEVICO
TERME کے میئر سے ۳۶۰ سال کی خدمات کا معاوضہ
طلب کیا۔ یہ ۱۶۳۰ء کا واقعہ ہے۔ جب اس قصبہ میں
طاعون کی وبا پھیلی اور شہر کے حاکموں نے چرچ کو خاص
دعائیہ تقریبات کی فرمائش کی تاکہ مرض ختم ہو جائے تو چرچ
نے یہ دعائیں شروع کر دیں اور یہ سلسلہ ۳۶۰ سال تک
چلتا رہا۔ اب چرچ نے اس خدمت کا معاوضہ طلب کر لیا
اور یہ بل تیس ہزار ڈالر تک بنا۔ عجیب حقیقت یہ ہے کہ اس
وقت کے بعد سے طاعون نے اس قصبہ پر حملہ نہیں کیا۔
(ریڈرز ڈائجسٹ جنوری ۱۹۹۲ء صفحہ ۱۰۴)



۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کو کوئٹہ اور نواحی علاقوں میں زلزلہ آیا جس
سے بے حد مالی و جانی نقصان ہوا۔ برطانوی حکومت نے
امدادی فنڈ قائم کیا تاکہ متاثرین کی مدد کی جاسکے۔ جب
امدادی رقم پہنچی تو ریاست قلات کے وزیر اعظم ایڈورڈ ویکفیلڈ
نے اس مد میں خرچ کرنے کے لیے ۳۸ ہزار پاؤنڈ طلب
کیے۔ اسے صرف ۸۵۰۰ پاؤنڈ دیے گئے۔

(30 Seconds of Quetta by Rohat Jackson P:233)

PIERRE DE GAULLE پیرس کا میئر۔ پیرس کے شی ہال
کا معائنہ کر رہا تھا۔ جب اس نے ایک جگہ بورڈ لگا دیکھا۔
"۱۹۱۰ء کے سیلاب کے متاثرین کے دعاوی کی ادائیگی"۔ میئر
جب اس کمرے میں داخل ہوا تو وہاں دو سفید ریش اشخاص
بیٹھے تھے جو میئر کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ استفسار پر پتہ چلا کہ
سب دعاوی کی ادائیگی ہو چکی ہے۔ اصل میں آخری ادائیگی
۱۹۱۳ء میں کر دی گئی تھی۔ لیکن اس کے بعد کسی نے بھی وہاں
آکر کام ختم کرنے کے لیے نہ کہا اس لیے وہ لوگ ۳۶ سال
تک فارغ بیٹھے تنخواہیں وصول کرتے رہے اور اس کے
بعد انہوں نے میونسپل حکام کو آخری رپورٹ پیش کی۔ (ریڈرز
ڈائجسٹ مئی ۱۹۳۹ء صفحہ ۹۴)۔

برازیل میں ایک ریٹائرڈ ملٹری اور قانون کے افسر
نے بار ایسوسی ایشن کا ممبر بننے کے لیے درخواست دی۔
اسے کہا گیا کہ وہ ہر اس جگہ سے اپنے امن پسند شہری
ہونے کا سرٹیفکیٹ حاصل کرے گا جہاں جہاں وہ رہ چکا
ہے۔ یہ شہادتیں ۱۸ سال کی عمر سے لے کر اب تک کی
زندگی کے بارے میں ہوں۔ ایسے سرٹیفکیٹ کی معیاد تین ماہ
تھی اور جب تک وہ یہ کام مکمل کر پایا تو پہلے سرٹیفکیٹ کی
معیاد ختم ہو چکی تھی۔ (ریڈرز ڈائجسٹ مئی ۱۹۸۰ء صفحہ ۹۶)



چین میں بھی بیوروکریسی زندہ و تابندہ ہے۔
پیپلز ڈیلی کی ایک رپورٹ کے مطابق بیوروکریسی نے
ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔ جب ایک زمین کی ملکیت اور
قبضہ حاصل کرنے کے لیے ۱۳۴ اسٹامپ لگانے پڑے۔
درجن سے زیادہ لوگوں نے تین ماہ کے عرصے میں
۱۷ اداروں کے ہاں دستک دی اور معاہدے کے ۴۶
فارم پُر کیے۔ یہ سب کچھ نانجنگ کے نوجوانوں کے محل
(Youth Palace) کے لیے تقریباً ڈیڑھ ایکڑ جگہ حاصل
کرنے کے لیے تھا۔ (ریڈرز ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۸۱ء صفحہ ۹۲)



پطرس (سید احمد شاہ بخاری) جن دنوں آل انڈیا ریڈیو
کے ڈائریکٹر جنرل تھے، جنگ کے زمانے میں انہوں نے
ایک تجویز حکومت ہند کو بھیجی۔ خاصا عرصہ گزر جانے کے
بعد جب جنگ ختم ہونے کے آثار تھے، جواب آیا کہ اب
جنگ ختم ہونے والی ہے، اس لیے اس کی کوئی افادیت
باقی نہیں رہی۔ پطرس نے جواب دیا اگر حکومت اسی رفتار
سے کام کرتی رہی تو امن کا زمانہ بھی جلد ختم ہو جائے گا۔

گیا۔ اس شخص کے دادا کو یہاں کھڑا کیا گیا تھا کہ لوگ
گیلے پیٹ پر قدم نہ رکھیں۔
ایک برطانوی اخبار نویس نے جیسے اس کا پتہ لگا، اس پر یہ
دلچسپ تبصرہ کیا۔ "پیٹ تو خشک ہو چکا لیکن یہ نوکری خشک
نہیں ہوئی۔" (ریڈرز ڈائجسٹ فروری ۱۹۹۰ء صفحہ ۹۶)

واشنگٹن کے گورنر ڈکسی لی رے کا بیان ہے۔
ایک بات جس کا مجھ پر انکشاف ہوا ہے، یہ ہے کہ جب
میں واشنگٹن میں کام کرتا تھا تو سیاست دان واقعی سرخ فیتے
کو کاٹنے میں بہت مستعد تھے لیکن وہ اسے لمبائی کے رخ
سے کاٹ دیتے تھے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ جنوری ۱۹۷۹ء)



ایک شخص ۲۰ سال تک بغیر کسی سبب کے برطانیہ کی
پارلیمنٹ کی سیزھیوں کے پاس کھڑا رہا۔ آخر کار کسی نے
پتا چلایا تو انکشاف ہوا کہ یہ ملازمت اس شخص کے
خاندان میں تین پشتوں سے چلی آ رہی ہے۔ یہ ملازمت
اس وقت قائم کی گئی تھی جب ان سیزھیوں پر رنگ کیا



برطانوی پولیس کی عقابی نگاہوں سے بچنا محال ہے

وہائٹ ہیون کا اتو کھالا ڈالا

ایک قاتلانہ شکوہ بھری نگاہ کا اجرا جسکی تاب لانا مشکل ہو گیا تھا

جاوید یوسف کھٹوریہ

خوش قسمتی کہ ۲۰۱۲ء کے موسم گرما کا تمام عرصہ انگلینڈ کے ایک ایسے ٹھنڈے علاقے میں قیام کیا جو واقعتاً جنت نظیر اور نام بھی اسم بہ

مسمہ وہائٹ ہیون (White Haven) ہے۔ یہاں ۹۵ فیصد سے بھی زیادہ اصلی نسلی انگریز رہتے ہیں جب کہ پوری سلطنت برطانیہ کے لیے یہ کہنا بے جا نہ

ہوگا کہ وہاں انگریز بھی رہتے ہیں۔ دوران قیام اپنے ۷ سالہ شوخ و چنچل نواسے کے سکول کی ایک تقریب میں اس کے ایک انگریز ہم جماعت دوست سے گپ شپ کے دوران ہم نے پوچھا کہ اس کے گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں تو فوراً جواب ملا

Five, Me, Mummy, Dady, sister and dog.

(پانچ، میں، مچی، ڈیڈی، بہن اور کتا)۔ یوں پتا

چلا کہ پالتو کتے کو وہاں گھر کے فرد کی حیثیت حاصل ہے۔ سنا بھی جیسی تھا کہ گورے (اہل مغرب) کتوں سے والہانہ محبت کرتے ہیں، ذاتی مشاہدہ پر مزید انکشافات نے ہمیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ گلیوں و سڑکوں کے فٹ پاتھوں پر، بازاروں و پارکوں اور بسوں میں بہت سے لوگ مختلف نسلوں اور قد کاٹھ کے صاف ستھرے (عموماً خوبصورت) اپنے عزیز کتوں کے ہمراہ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ دکانوں، سپر سٹوروں اور دفاتر کے باہر ایک کتا پارک اسٹینڈ بھی ہوتا ہے جہاں وہ اپنے پیارے کو اس کے پنے میں لگے چین لاک کے ذریعے ”پارک“ کر کے دکان وغیرہ کے اندر بے فکری سے جاسکتے ہیں۔ ان لوگوں کے یہ ہمراہی سر رہا ہے۔ فطرت کی آواز پر لبیک بھی کر لیتے ہیں۔ ان کی اس حرکت کو نظر انداز کر دینا ان کے مالک یا مالکہ کو مجرم بنا سکتا ہے کیونکہ ایسی نازک صورت حال میں اگر مالکان نے اپنے چہیتے کی غلاظت کو فوراً ان کے پاس پہلے سے موجود کھریچہ نما اوزار کے ذریعے زمین سے کھرچ کر (اگر کھریچہ گھر بھول آئے ہیں تو پھر..... کسی بھی طرح) مخصوص مونی بیگ میں جمع کر کے اپنے بیگ وغیرہ میں فوراً ہی نہ رکھا تو وہ قانونی پکڑ سے نہیں بچ سکتے۔ یاد رہے کہ ”غلاظت کا ملہ“ اٹھانے کے بعد اس امر کو یقینی بنانا بھی ضروری ہے کہ وہ جگہ پہلے کی طرح صاف ستھری ہو جائے۔ برطانوی پولیس کی عقابی نگاہوں سے بچنا محال ہے۔ بعد ازاں اس خصوصی فرد خاتہ کے ”کے دھرے“ کو کسی بھی نزدیکی کچرا دان کے سپرد کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ پالتو کتے کے لیے وہاں بہت سے قواعد و ضوابط بنائے گئے ہیں جن پر عمل درآمد کیا جانا لازمی ہے۔ چنانچہ ٹریفک کے علامتی بورڈوں کی وضع کے کتوں سے متعلق بھی جا بجا بات تصویر علامتی بورڈ ایتادہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اپنے ہاں بھی رسماً لگے نظر آتے ہیں۔

ایک ایسے ہی علامتی بورڈ پر دی گئی بات تصویر دو ہدایات پڑھ کر ہم ٹھٹھکنے سے زیادہ بھٹک سے گئے۔ پہلی ”Keep dogs on lead“ اور دوسری ”Scoop the poop“ کافی سوچ اور غور و فکر کے بعد ہمیں راستہ مل گیا کہ اپنے ”لاڈلے“ کو آگے اس لیے رکھو کہ اس کی ”حرکات و سکنات“ سے باخبر رہ سکو تاکہ ہنگامی حالات میں فوری طور پر حسب ضابطہ کارروائی کی جاسکے۔ عدم پیروی پر مقامی حکومت کم از کم ۱۰۰۰/۱ پونڈ (150,000/ پاکستانی روپیہ سے زائد) پینلٹی عائد کر دے گی۔ ایک بات تو ماننے کی ہے۔ انگریز اچھا کریں یا برا، کرتے سلیقے اور طریقے سے ہیں اور حیران کن بات یہ کہ اس طے شدہ طریقے پر پھر وہ پہرہ بھی دیتے ہیں۔ اس طرز فکر نے ان کی زندگی کو کافی حد تک منظم اور مضبوط کر رکھا ہے۔

پالتو جانور ہونے کے ناطے یہ اپنے مالک و دیگر افراد خانہ سے بہت جلد مانوس ہو کر خوب کھیلتا کودتا بھی ہے۔ اپنی رہائش گاہ کے قریب ہی واقع ایک سرسبز قطع زمین کے کنارے بچوں کے لیے بنائے گئے خوبصورت جھولا پارک میں اکثر جانا ہوتا تھا۔ وہاں ایک چوبی بیچ پر بیٹھ کر اخبار بینی و دھوپ سینکنے کے ساتھ ساتھ جھولا جھولتے اور کھیلنے کودتے بچوں کو دیکھا کرتے۔ ہر کوئی اپنے اپنے مشاغل میں مگن ہوتا، بچے بھی، بڑے بھی اور کتے بھی۔ ایک روز حسب معمول ہم وہاں بیٹھے ماحول کا مزالوث رہے تھے کہ ایک پستہ قد، خوبصورت، چمک دار آنکھوں اور کھڑے کانوں والا سفید براق ”انو کھالا ڈالا“ ہمارے نزدیک آ کر اچھل کود کرتے ہوئے بھونکنے لگا۔ ہم نے احتیاطاً اپنی ٹانگیں بیچ پر سمیٹ لیں لیکن اس نے ہم سے ایک فاصلہ پر رہ کر اپنی کارروائی جاری رکھی۔ ہم سوچ رہے تھے کہ کچھ دیر پہلے وہ ہری بھری گھاس پر ادھر ادھر دوڑ رہا تھا، اسے اچانک ہمارا خیال کیسے آیا؟ قدرے پریشان ہو کر دائیں بائیں

انگریز اچھا کریں یا برا، کرتے سلیقے اور طریقے سے ہیں
اور اس پر ”پہرہ“ بھی دیتے ہیں

دیکھا کہ اس کے ”اہل خانہ“ کا کوئی فرد اسے ہماری بے ادبی کرنے سے روکے لیکن کسی نے بھی توجہ نہ دی۔ معا ایک انگریز خاتون پاس آئیں اور لکڑی کی ایک چھوٹی سی ٹہنی ہمارے ہاتھ تھماتے ہوئے بتایا کہ دراصل ان کا سونو ہمارے ساتھ کھیلنا چاہتا ہے۔ اس ٹہنی کو دور پھینکا جائے۔ وہ دوڑ کر جائے گا اور ٹہنی واپس لا کر ہمیں دے گا۔ ہم نے میڈم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکڑی پوری طاقت کے ساتھ دور پھینک دی، ان کا ”برخوردار“ فوراً ہی تیزی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم نے سکھ کا سانس لیا کہ ایک تجس و ناپاک (مگر نہایت خوبصورت) جانور کی قربت سے جان چھوٹ گئی۔ اب اخبار کا مطالعہ کرنا شروع کیا کہ چند منٹوں بعد وہ اپنے منہ میں ٹہنی دا بے واپس آن دھمکا اور اسے ہمارے قدموں میں اگل کر پہلے کی طرح اپنی سریلی آواز نکالتے ہوئے پھدکنا شروع کر دیا۔ ہم نے سوچا کہ اب ٹہنی کو ہاتھ لگایا تو ناپاک ہو جائے گی، نہ لگایا تو چھوہندر کی اولاد اچھی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ اگر لکڑی کو ہاتھ میں لے کر دوبارہ پھینکا بھی تو یہ پھر واپس لے آئے گا۔ اسی وقت دماغ میں آمد ہوئی ”انگریز اور اس کے کتے کی ایسی کی تہی، ٹہنی کو ہاتھ میں لو (ہاتھ گندے و ناپاک ہوں گے تو عارضی طور پر اخبار سے صاف کر لیا جائے، واپس گھر جا کر دھو لیں گے) عقب میں اگی لمبی گھاس اور چوڑے پتے والی جھاڑیوں میں دور پھینک دو۔“ ایسا ہی کیا ”دلبر شیر“ نے اس بار تیز دوڑتے ہوئے ایک لمبی جست بھی لگائی اور ان جھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔ ایک بار پھر سکھ کا سانس لیتے ہوئے اخباری کاغذ سے اپنے ہاتھوں کو صاف کیا، جھولا لیتے اور کھیلتے ہوئے بچوں، بڑوں میں ہم اور وہ جھاڑیوں میں گم ہو گئے۔ ہمارے لیے اب سکون ہی سکون اور سورج چھپنے کو تھا وہاں موجود چھوٹے بڑے چھٹنے لگے۔ جھنڈ میں غائب ”ٹارزن“ کو ”ماما“ نے کافی بلند آواز سے بلانا شروع کر دیا (ہم سے نہیں

پوچھا) کافی دیر بعد ان کے ”چہیتے“ برآمد ہوئے لیکن خلیں اور زبان لٹکائے، ہانپتے کانپتے مگر مسلسل دم ہلاتے ہوئے اپنے پر پوار کے ہمراہ واپس اپنے گھر رواں دواں ہو گئے۔ دوران ان کے گلے کے پٹے میں ڈوری اڑادی گئی جس کا ان کی مٹی (مالکن) کے ہاتھ میں تھا۔ اس معصوم نے جلتے ہوئے مڑ کر ہماری طرف دیکھا اور جس قاتلانہ اور شکوہ بھری نظر سے دیکھا ہم واقعی بڑی دیر تک اس کی تاب نہ لا سکے۔ ہر ہے ایسا کرنا خلاف قانون نہیں تھا۔

دنیا بھر میں لوگ عام طور پر کتے کو بصد شوق اس لیے پالنا پسند کرتے ہیں کہ یہ وفاداری، فرماں برداری اور چوکیداری میں بے مثال ہے۔ ان کو دیکھ کر مسلم معاشروں میں بھی یہ رواج آرہا ہے اور گھر میں کسی اچھی نسل کے خوبصورت کتے کا وجود رونق کا باعث سمجھا جانے لگا ہے۔ حالانکہ ہمارے پاس کتے کو ناپاک اور تجس جانور سمجھا جاتا ہے بلکہ عربی الفاظ تجس العین کے ہیں جو کبھی پاک نہیں ہو سکتا۔ بزرگوں سے سنا ہے کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں نحوست پھیلتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کتے سے تشبیہ دیں تو وہ اس قدر بد کے گا کہ جان چھڑوانی مشکل ہو جائے گی۔ کتا خواہ کتنا ہی پیارا، وفادار ہو صرف کتا ہے جو ہمارے ہاں گھر کا فرد ہرگز نہیں بن سکتا۔ اگر اب بھی بات سمجھ نہیں آئی تو درج ذیل تین مشہور ضرب الامثال پر غور کر کے ایک کتے کی حقیقت جان لینے میں کیا حرج ہے؟ لوگ ایسے ہی تو نہیں کہتے

۱۔ ساس کے گھر جوانی کتا ۲۔ بہن کے گھر بھائی کتا اور ۳۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔

مزید یہ کہ ”جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں“ انگریزی زبان میں (Barking dogs seldom bite) ”بھونکنے والے کتے کبھی نہیں کاٹتے“ کہتے ہیں۔

کتے کے لیے عربی میں تجس العین کا لفظ مستعمل ہے
یعنی جو کبھی پاک نہیں ہو سکتا

الفاظ کی کرسی

الفاظ کی کرسی - و سدر السیاسی

حاضر ہے۔ علم و حکمت کی زبان الفاظ کی ایک مستقل دنیا ہے جن کے مابین منطقی ربط ایک فکری خیال کو جنم دیتا ہے۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ الفاظ مرتے بھی ہیں اور مرتے تب ہیں جب ان کا استعمال ترک ہو جاتا ہے۔

الفاظ ایک زندہ سلسلہ ہے، لفظوں میں، ماحول اور زمان و مکان کے ساتھ تبدیلیاں ظہور میں آتی رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی لفظ کے مختلف ادوار میں مختلف معنی نظر آتے ہیں۔ عربی کا لفظ عیش، ابتدا میں محض معنی زندگی استعمال ہوتا تھا۔ پھر جب عربوں پر خوش حالی کا دور آیا تو اس میں خوش حالی کا مفہوم شامل ہو گیا، یعنی عیش سے مراد خوش حالی کی زندگی ہوئی۔ رفتہ رفتہ خصوصاً فارسی، اردو تک پہنچتے پہنچتے لفظ عیش نہ صرف خوش حالی بلکہ پر تکلف زندگی اور شوق فصول کا مترادف ٹھہرا۔ اب عیش کے ساتھ عشرت کا لفظ ملا لیا جاتا ہے اور یہ بے لگام زندگی کا قائم مقام ہے۔

لفظ ”خان“ کو دیکھیے۔ اس کا عروج و زوال بذات خود عبرت کی کہانی ہے۔ خان کسی زمانے میں قبیلے کے رئیس اعظم یا سلطان وقت کا لقب ہوا کرتا تھا۔ چنگیز اپنے زمانے کا خان تھا۔ پھر اس کے شہزادوں نے یہ لقب اختیار کیا۔ اس کے بعد ایک زمانہ ایسا آیا جب بڑے بڑے عمائد و امرا کے لیے مخصوص ہوا۔ مگر بڑی سلطنتوں کے زوال کے ساتھ اس کا رتبہ گرا، اس کا اطلاق ہر سرکاری عہدے دار پر ہونے لگا اور اب آخر میں ایک خاص قبیلے کے ہر فرد کے نام کا لاحقہ ہے، بلا امتیاز۔ لفظوں کے بیمار اور مضمحل ہونے کا قصہ اور بھی دلچسپ ہے۔ یہ بیماری دراصل بچارے لفظوں کی نہیں، ان کے بولنے والوں کی ہے۔ جب معاشرہ بگڑ جاتا ہے تو اس میں شریف اور بااخلاق الفاظ، غلط یا بالکل اٹل معنوں میں استعمال ہونے

کیا ہیں؟ اشیاء، اسماء، حالتوں اور کیفیتوں کے آئینے ہیں۔ جب انسانی عمل ان میں ربط پیدا کرتا ہے تو یہ آئینے مل کر معانی کا ”چراغ“ بن جاتے ہیں۔ زیادہ علمی زبان میں انھیں معانی کی علامتیں کہا جا سکتا ہے۔ ان علامتوں کی مدد سے انسان اظہار و ابلاغ کرتا ہے۔ الفاظ کی کہانی انسانی ارتقا کی کہانی ہے۔ الفاظ کی تاریخ ہر ملک میں اپنے سماجی ماحول کے تابع رہی ہے، اس ماحول میں الفاظ نے جنم لیا، نشوونما پا کر جوان ہوئے، پھر پھلے پھولے اور حواث و واقعات کے تحت لیل و نہار کا شکار ہو کر کبھی مضحک و ہنسا ہو گئے، کبھی بالکل مر گئے۔ فقرے اور عبارتیں الفاظ کے طویل سلسلوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ عبارتوں میں الفاظ ہی جان ڈالتے ہیں اور مختلف قسم کے جذبات و خیالات کی تصویر بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے الفاظ کی قیمتیں کئی انواع میں بٹ جاتی ہیں۔ یہ قیمتیں جذبات و خیالات کے حوالے سے مقرر ہوتی ہیں اور اس بنیاد پر الفاظ کی کئی قسمیں بن جاتی ہیں۔ بعض الفاظ جذبات کی آئینہ داری کرتے ہیں، ان میں قلب انسانی کی مختلف حالتوں کا عکس ہوتا ہے۔ بعض الفاظ تصویر دار ہوتے ہیں، یعنی ان میں خارجی کائنات کی تصویریں ہوتی ہیں اور بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن کی قیمت ان کی آواز کی وجہ سے مقرر ہوتی ہے۔ یہ گاتے بجاتے الفاظ جب عبارتوں کی صورت اختیار کرتے ہیں تو اس سے موسیقی پیدا ہوتی ہے۔

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

میر تقی میر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ الفاظ چرب و شیریں کا بادشاہ تھا۔ چرب سے مراد وہ الفاظ ہیں جو جذباتی قیمت رکھتے ہیں اور شیریں سے مراد وہ الفاظ ہیں جو صوفی قیمت رکھتے ہیں۔ مجرد معانی کے لیے بھی الفاظ کی خدمت

العقل

105 | urdudigest.pk | 2013 - جنوری

درد و کرب ناگزیر مگر مصیبت زدہ ہونا اختیاری ہے

اچھے لوگوں کے ساتھ

بُرائے واقعات ضرور پیش آتے ہیں

زندگی کے اذیت دینے والے سبق تہمتی کیوں ہوتے ہیں؟

قابل قدر سبق ہے۔ فلسفی

ہزاروں سال سے اس موضوع پر

لکھتے چلے آئے ہیں کہ زندگی جیسی ہوتی ہے، وہ ویسی کیوں ہوتی ہے لیکن یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ زندگی کس طرح کام کرتی ہے۔ اگر وہ نہیں سمجھتے اور زندگی کو جیسی وہ ہے، ویسی ہی قبول کر لیتے ہیں تو پھر ہم کسی چیز کی خواہش کرتے رہیں گے لیکن اسے کبھی نہیں پاسکیں گے۔ ہم شکوے کرتے رہیں گے کہ معاملات کو یوں نہیں یوں ہونا چاہیے تھا لیکن معاملات کبھی ویسے نہیں ہوتے۔ یہ زندگی کا ایک سب سے زیادہ قابل قدر سبق ہے کیونکہ جب ہم یہ سمجھ جاتے ہیں کہ دنیا ہمیں خوش کرنے کے لیے خود کو وقف نہیں کرے گی تو ہم اپنی ذمہ داری قبول کرنے لگتے ہیں۔

کسی نے مجھ سے پوچھا، ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم زندگی پر منفی اثرات کو مضمون میں رکھنا چاہتے ہو“ میں تو انہیں منفی نہیں سمجھتا۔ کہ یہ بنیادی سچ ہیں۔ اس لیے آغاز میں رکھا گیا ہے کہ یہ بہت اہم ہیں۔ میں تو انہیں مکمل طور پر مثبت تصور کرتا ہوں۔ میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ میں نے یہ تحریر کمپیوٹر کی مدد سے لکھی ہے۔ اب میں کمپیوٹر

انجینئر قیصر جاوید

زندگی کا ایک سب سے قابل قدر سبق

زندگی ہمیشہ ویسی نہیں ہوتی جیسی ہم چاہتے ہیں۔ ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہماری زندگی آسان ہو، مستقل طور پر منصفانہ ہو اور زیادہ سے زیادہ راحت انگیز ہو، اس میں دکھ تکلیف اور رنج و الم نہ ہوں، ہمیں کام نہ کرنا پڑے۔ ہمیں موت نہ آئے، ہم ہر وقت خوش رہیں۔ بد قسمتی سے ہماری یہ خواہشیں پوری نہیں ہوتیں۔ حقیقت ان کے برعکس رہتی ہے۔ تاہم حقیقت ایک عظیم استاد بھی ہے۔ وہ ہمیں سکھنے میں مدد دیتی ہے، گو کہ اس کے سکھانے کا عمل بہت دھیرا اور درد و اذیت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ وہ ہمیں زندگی کے چند نہایت قابل قدر سبق سکھاتی ہے۔ ان میں سے ایک سبق یہ ہے، دنیا ہمیں خوش کرنے کے لیے خود کو بھی وقف نہیں کرے گی۔

ہم اسے پسند کریں یا نہیں، یہ ہماری زندگی کا ایک عظیم سبق ہے۔ حقیقت میں ہمارا پہلا اور سب سے زیادہ

لگتے ہیں۔ لفظوں میں منافقت پیدا ہو جاتی ہے وہ اظہار کا ذریعہ نہیں رہتے، اخفا کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ اثبات حقیقت نہیں کرتے، اخفائے حقیقت کرنے لگتے ہیں۔

اہل مغرب جس زبان کو ”ڈپلومیسی“ کی زبان کہتے ہیں، اس میں لفظوں کے دو دو معنی ہوتے ہیں، ان سے بہت بڑا کام لیا جاتا ہے۔ یہ وعدوں سے مکر جانے کی زبان ہے۔ مگر بعض اوقات لفظ بے چارے خود دھوکا کھا رہے ہوتے ہیں۔ بولنے والے شریف لفظ کو دھوکا دیتے ہیں، اچھے لفظ استعمال کرتے ہیں اور دل سے ان کو خود تسلیم نہیں کر رہے ہوتے۔ تہذیب، اخلاق، دین اور مذہب سے متعلق لفظوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان کا استعمال قلب کا ہم قدم نہیں ہو پاتا۔ بعض اوقات شریف لفظ کی شرافت ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ سچائی، وفاداری، حیا، تواضع، حقیقت جیسے لفظوں سے ان کا اصلی سرمایہ معنی ہی چھین لیا جاتا ہے۔ فرانس کے نیم رومانی، نیم مجہول ادب پر یہی گزر رہی ہے اور بعض اشتراکی معاشروں میں پرانی شریفانہ اقدار کو جاگیردارانہ اقدار کہہ کر ان سے متعلق لفظ کی حقیقت ہی سے انکار ہو رہا ہے۔ خیر اور شر، نیکی اور بدی، صلہ رحمی اور انسانی ہمدردی جیسے لفظوں کی کاپیا پلٹ ہو گئی ہے۔

سیاست اور اس کی امدادی سائنس نے جس طرح لفظوں کا خانہ خراب کیا ہے اس کا حال قابل گریہ ہے۔ اور اس کے رد عمل کے طور پر بیمار فلسفوں نے ہر شریف لفظ کو اتنے دھکے، کئے رسید کیے ہیں کہ اب یہ

ڈاکٹر سید عبداللہ (۱۹۰۶ء-۱۹۸۶ء)



ڈاکٹر سید عبداللہ ضلع ہزارہ (ایبٹ آباد) کے ایک گاؤں منگور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ عملی زندگی کا آغاز پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں قلمی کتابوں کی فہرست سازی سے کیا۔ بعد ازاں یونیورسٹی میں ہی فارسی کے ریسرچ سکالر ہو گئے۔ جس کے بعد یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ عربی و فارسی و اردو کے مہتمم مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۵ء میں ”ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ“ کے عنوان سے مقالہ لکھا۔ جس پر ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی کی جگہ اورینٹل کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے، بعد میں ریڈر پروفیسر اور پھر پرنسپل بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ”اردو دائرہ معارف اسلامیہ“ کے صدر نشین کی حیثیت سے آخر عمر تک مصروف کار رہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ادبی تحقیق و تنقید کے اسی سلسلے کی کڑی ہیں جس کا آغاز محمد حسین آزاد سے ہوا تھا اور جو حافظ محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا۔ وہ زندگی بھر علم و ادب سے وابستہ رہے۔ ان کی کتابوں میں ”تقدیر میر“، ”ولی سے اقبال تک“، ”وجہی سے عبدالحی تک“، ”مقامات اقبال“، ”مباحث“، ”اردو تذکرے“ اور ”تذکرہ نگاری“ وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے نزدیک زبان خیال کے ابلاغ اور ادراک کا ذریعہ ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ سادہ اور مناسب الفاظ میں اپنے مفہوم کو اس طرح بیان کریں کہ پڑھنے والا اس کو بخوبی سمجھ سکے، ادبی تنقید میں ان کے ہاں مغربی مطالعے اور حوالوں کے باوجود مشرقی نقطہ نظر غالب رہتا ہے۔ زیر نظر مضمون ”الفاظ کی کہانی“ ان کے طرز و تحریر اور فنی نقطہ نظر کی نمایاں مثال ہے۔

پہلے کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں چلا سکتا ہوں۔ جب کمپیوٹر نیا نیا آیا تھا تب میں اسے اتنے بہتر انداز میں نہیں چلا سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے یہ جاننے کے لیے وقت صرف کیا ہے کہ یہ کس طرح کام کرتا ہے۔ یہ عمل آسان نہیں تھا۔ (حالانکہ کمپیوٹر کے بارے میں باور کیا جاتا ہے کہ یہ ”یوزر فرینڈلی“ (User Friendly) ہے۔ زندگی کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ جب ہم سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کس طرح کام کرتی ہے تو ہم اس سے بہت کچھ حاصل کرنے لگتے ہیں۔ جیسے میں آج کل اپنے آئی پیڈ سے حاصل کر رہا ہوں۔

زندگی کٹھن ہے

کیا آپ نے کبھی کسی کار کے بمپر پر چسپاں وہ سٹکر دیکھا ہے، جس پر لکھا ہوتا ہے: ”زندگی کٹھن ہے۔۔۔ اور پھر تم مر جاتے ہو؟“ جب میں نے پہلی بار یہ پڑھا تو میں ہنسنے لگا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ میں کیوں ہنس رہا تھا۔ مجھے تو اس پر حیران ہونا چاہیے تھا۔ کسی کی کار کے پیچھے زندگی کا ایک عظیم سچ عین میرے سامنے تھا۔ یہ جملہ تو مجھے کسی قدیم فلسفی کی کتاب میں پڑھنے کو ملنا چاہیے تھا۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بات سب سے پہلے ایک قدیم ترین فلسفی نے کہی تھی۔ تقریباً ۲۵۰۰ سال پہلے گوتم بدھ نے ”چار سچائیاں“ بیان کی تھیں۔ پہلی سچائی یہ تھی کہ ”زندگی دکھ ہے“۔ ہو سکتا ہے یہ بات کہنے والا وہ پہلا شخص ہو، تاہم میرا خیال ہے کہ اس سے بہت پہلے بہت سے لوگوں نے اس حقیقت کو جان لیا ہوگا۔ میرے لیے یہ یقین کرنا دشوار ہے کہ دنیا کے اولین باشندوں کے لیے زندگی آسان ہوگی۔ زندگی کٹھن ہے۔

”زندگی مسلسل مسائل کا نام ہے۔ کیا ہم اسے گریہ و زاری کرنا چاہتے ہیں یا انہیں حل کرنا چاہتے ہیں؟“ (ایم سکاٹ پیک)

یہ ہمیشہ کٹھن رہے گی۔

نفسیات داں سکاٹ پیک (Scott Peck) مشہور کتاب The Road Less Travelled ابتدائی تین لفظ ہیں: ”زندگی مشکل ہے۔“ پیک ایک عظیم ترین سچ کہتا ہے کیونکہ جب ہم اسے جان لیں اور اسے قبول کر لیتے ہیں تو ہم زیادہ موثر انداز میں جی سکتے ہیں۔ ہم اپنے مسائل پر گریہ و زاری کرنے بجائے ان کے حل تلاش کر سکتے ہیں۔ جو لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور جو لوگ ناکام ہوتے ہیں، ان میں سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی مشکلات سے حوالے سے کیسی سوچ رکھتے ہیں۔ ناکامیاب لوگ اپنے مسائل کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کامیاب لوگ اپنے مسائل کو قبول کرتے ہیں اور ان کے ذریعے عمل کرتے ہیں، خواہ اس کے دوران انہیں دکھ ہی کیوں نہ سہنا پڑے۔ مسائل سے نبرد آزما ہونے اور ان کے حل ڈھونڈنے سے زندگی کو معانی ملتے ہیں۔

عمر سے قطع نظر پیش تر لوگوں کا مسئلہ یہ ہے کہ یا تو اس حقیقت کو سمجھتے نہیں یا اسے قبول نہیں کرتے کہ زندگی میں خاص حد تک مشکلات ضرور ہوتی ہیں۔ وہ مشکلات برداشت کرنے کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ وہ اپنے مسائل کے زیادہ ہونے کا شکوہ خود سے دوسروں سے کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس طرح بات کرتے ہیں جیسے ان کی مشکلات منفرد نوعیت کی ہوں۔ ایسا لگتا ہے

میں انہیں اپنے سوا باقی ہر کسی کی زندگی آسان دکھائی دیتی ہے۔ قہرے شکایتوں سے مسائل ختم نہیں ہوتے۔ شکوے سے مسائل بد سے بدتر اور بدتر سے بدترین ہو جاتے ہیں۔ اپنے مسائل کا شکوہ کرنا انہیں دوسروں پر دبا کر رکھتا ہے، یہ انہیں زندگی کی ایک نئی شکل کی حیثیت سے قبول نہ کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔

تھوڑا عرصہ پہلے کی بات ہے میرا ایک شاگرد مجھے ملا۔ اس وقت اس کی عمر تقریباً بیس سال تھی۔ مجھے یہ بتانے کے بعد کہ سوری عرب میں وہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے کہا، ”مجھے خوشی ہے کہ مجھے آپ جیسا استاد ملا تھا۔“ فطری بات ہے، یہ سچ کر مجھے خوشی ہوئی، تاہم مجھ میں تجسس بھی ابھرا۔

میں ہمیشہ سوچتا ہوں کہ کیا میرے شاگرد چند سال بعد میری کلاسوں میں گزرے ایام یاد کرتے ہوں گے کہ میں؟ چنانچہ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس بات پر کیوں خوش ہے کہ اسے میرے جیسا استاد ملا تھا؟ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، ”اس وجہ سے کہ زندگی مشکل ہے۔“ اس نے کہا کہ صرف اس سادہ سے سچ نے ہائی سکول سے فارغ ہونے کے بعد اسے زندگی کے چند نہایت ناہموار مرحلوں سے نبرد آزما ہونے میں بہت مدد دی۔ تب اس نے وہ وقت یاد کیا جب اس نے پہلی بار یہ بات سنی تھی۔

۱۶ سال پہلے کی بات ہے وہ میری کلاس میں نیا نیا داخل ہوا تھا۔ میں نے ایک خاص طور پر چیلنجنگ (Challenging) مشق اپنے شاگردوں کے ذمہ لگائی۔ میں نے انہیں پیشگی بتا دیا تھا کہ میں ان سے دو ایسے کام کرانا چاہتا ہوں، جو دوسرے اساتذہ اپنے شاگردوں سے نہیں کراتے۔ وہ دو کام یہ تھے: سوچنا اور عمل

کرنا۔ ابتدا میں میرے شاگردوں نے اس پر تھوڑا سا اچنبھا ظاہر کیا اور پھر وہ اپنے ذمے لگائی ہوئی مشق کرنے میں مصروف ہو گئے۔ تقریباً آدھی مشق کے بعد ایک طالب علم نے کہا، ”یہ مشکل ہے۔“

میں نے اسی انداز میں جواب دیا کہ جس انداز میں میں ہمیشہ بات کرتا تھا: ”زندگی مشکل ہے۔“

اس کے بعد ہم نے فلسفہ، زندگی، عمل، اذیت، خوشی اور کامیابی کے حوالہ سے ایک شان دار مباحثہ کیا۔ ۱۶ سال بعد وہ طالب علم شاید یہ تو نہیں جانتا ہو گا کہ ملائیشیا کے دارالحکومت کا نام کیا ہے، تاہم وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ زندگی مشکل ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اس نے اس صداقت کو قبول کر لیا تھا۔

جب ہم اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ زندگی مشکل ہے تو ہم ترقی کرنے لگتے ہیں۔ جب ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہر مسئلہ ایک موقع بھی ہوتا ہے تب ہم اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ ہم زندگی کے چیلنجوں کو قبول کرنے لگتے ہیں۔ ہم مشکلات سے شکست کھانے کے بجائے ان کا اپنے کردار کی آزمائش کی حیثیت سے استقبال کرتے ہیں۔ ہم انہیں اپنی موجودہ حالت سے آگے بڑھنے کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہمارے لیے یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ معاشرہ ہم پر بالکل مختلف پیغامات کی روزانہ بمباری کرتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ ٹیکنالوجی نے ہمیں ”پش بٹن“ (Push Button) زندگی مہیا کر دی ہے۔ ہم صرف بٹن دبا کر اپنے گیراج کا دروازہ کھول سکتے ہیں، ڈنر تیار کر سکتے ہیں مزید یہ کہ ہمیں بار بار بتایا جاتا ہے کہ

”جب ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہر مسئلہ ایک موقع بھی ہوتا ہے

تب ہم اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں“

”زندگی کا عظیم ترین سچ۔ زندگی مشکل ہے

جب ہم اس کو مان لیتے ہیں اور جان لیتے ہیں تو یہ آسان ہو جاتی ہے

ہر کام کو فوراً اور آسانی سے کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ میں نے گذشتہ چند دنوں میں پڑھا اور سنا ہے کہ آپ سو پونڈ وزن کم کر سکتے ہو۔ غیر ملکی زبان روانی سے بولنا سیکھ سکتے ہو، ٹی وی کے مشہور سٹار بن سکتے ہو، کنٹرکٹر کا لائسنس حاصل کر سکتے ہو اور جائیداد کے کاروبار میں ایک کروڑ روپے کما سکتے ہو۔ آپ یہ سارے کام چند دنوں کے اندر اندر کر سکتے ہو، اور وہ بھی کسی کوشش کے بغیر۔ اگر یہ سب ممکن ہے تو پھر اونٹ بھی اڑ سکتے ہیں!!

اس قسم کے اشتہارات کی بھرمار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایڈورٹائزمنٹ (Advertisement) اور مارکیٹنگ (Marketing) کے شعبوں میں کام کر نیوالے لوگ انسانی رویہ کو بہت اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ بیش تر لوگ اس حقیقت کو قبول نہیں کرتے کہ زندگی مشکل ہے۔ اس کے بجائے وہ ”فوری اور آسان“ طریقے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ میں نے پچھلے سبق میں کہا تھا کہ کامیاب لوگ زندگی کو ویسا ہی قبول کرتے ہیں، جیسی وہ ہوتی ہے۔ اس باب میں، میں اس حقیقت پر مستزاد یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں کہ جو چیزیں حاصل کیے جانے کے لائق ہوتی ہیں، وہ کبھی فوراً اور آسانی سے حاصل نہیں ہوتیں۔ ان کے حصول کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ وقت صرف کر کے، سخت جدوجہد اور کوششیں کر کے، قربانیاں دے کر اور درد و کرب سہہ کر حاصل ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی مشکل ہے!

زندگی ہمیشہ منصفانہ نہیں ہوتی

۱۹۸۱ء کا واقعہ ہے۔ ہیرالڈ کشر نے، جو کہ خود کو ”زندگی کا ستایا ہوا“ (Hurt by Life) قرار دیتے

ہیں، ایسے لوگوں کے لیے کتاب لکھی، جو کہ زندگی ستائے ہوئے ہیں اور بہتر چیز کے حق دار سمجھے۔ کتاب کا عنوان Bad Things Happen to Good People ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۰ء کی نوے دہائی (۱۹۸۰'s) کے دوران چھپنے سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں سے ایک گئی۔ یقینی امکان ہے کہ یہ ایک کلاسیک (Classic) جائے گی کیونکہ اس میں ہمارے ایک قدیم قرآنی آفاقی سوال کو موضوع بنایا گیا ہے، اور وہ سوال ”کیوں“ یا اس سے بہتر ”میں ہی کیوں؟“ ہے۔ پاس اس سوال کے پوچھنے کی تمام وجوہات تھیں۔ ۱۳ برس کا بیٹا ایرون پروگریا (Progeria) یعنی عمر سے بڑھنے کی بیماری کا شکار ہو گیا۔ ایرون نے جس تکلیف سہی اور اس کے گھرانہ نے جذباتی، اور وہ سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ وہ اور اس کا گھرانہ وہ ہی اس سے بہتر کے حق دار تھے۔

بد قسمتی سے زندگی ہمیشہ منصفانہ نہیں ہوتی۔ شاید سب سے زیادہ اذیت دہ سچ ہے، یہ ایسا اذیت دہ ہے جسے قبول کرنا بہت مشکل ہے۔ اچھے لوگوں کے ساتھ برے واقعات ضرور پیش آتے ہیں۔ اوقات دوسروں کے ساتھ بعض اوقات ہمارے ہمارے ہمیشہ ایسا لگتا ہے کہ یہ واقعات تب پیش آتے ہیں جب ہم ان کے بہت کم مستحق ہوتے ہیں۔ مزید برآں دیکھتے ہیں کہ اچھے واقعات ایسے لوگوں کے ساتھ آتے ہیں، جو کہ ان کے مستحق نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ سورج برے لوگوں کے لیے بھی ویسے ہی ظہور

ہوتا ہے جیسے اچھے لوگوں کے لیے۔ بارش دیانت داروں اور خبیثات کرنے والوں پر یکساں طور پر برسی ہے۔ اس میں کوئی حیرت نہیں کہ ہم خود کو یہ کہتے سنیں: ”یہ نا انصافی نہیں ہے۔“

میں نے بھر کے لیے بھی یہ کہنا نہیں چاہتا کہ جب کوئی اچھا آدمی ہو تو ہم کہیں، ”خوب، اس طرح ہوتا ہے،“ اور پھر خوشی خوشی زندگی بسر کرتے چلے جائیں۔ ہم میں سے کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ دوسری انتہا پر ہم درد و کرب کی خواہش بھی نہیں کر سکتے۔ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہم اس سے زیادہ موثر انداز میں نبٹنا سیکھیں۔ تم

ہینسل نے اپنی حیران کن کتاب You Gotta Keep Your Guts میں لکھا ہے: ”درد و کرب ناگزیر ہے لیکن مصیبت زدہ ہونا اختیاری ہے۔“

ہم تعمیری انداز میں درد و کرب کا مقابلہ کر کے مصیبت زدگی سے بچ سکتے ہیں۔ ہم یہ عہد کر سکتے ہیں کہ ہم اسے خود کو تباہ نہیں کرنے دیں گے، یہ کہ ہم اسے زندگی کی ایک حقیقت کے طور قبول کریں گے اور اس کے ذریعہ اپنی صورت حال کو مزید بہتر بنائیں گے۔

پینا من فرینکلن نے لکھا ہے، ”جو معاملات صدمہ پہنچاتے ہیں، وہ سبق سکھاتے ہیں۔“ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ زندگی کے بعض انتہائی اذیت دہ سبق نہایت قیمتی بھی ہوتے ہیں۔ جب کوئی بات ہمیں صدمہ پہنچا رہی ہو۔۔۔ خواہ وہ صدمہ جسمانی ہو یا جذباتی۔۔۔۔۔

سب سے اہم کام یہ ہے کہ ہم اس میں کوئی معنی تلاش کریں۔ اذیت یقیناً ہمیں کچھ نہ کچھ سکھا سکتی ہے۔ لیکن

ہمیں اس سے سیکھنے کے لیے آمادہ ہونا پڑے گا۔ جب ہم اذیت سے سبق سیکھتے ہیں تو ہم زیادہ سمجھ دار اور زیادہ مضبوط بن جاتے ہیں۔ زندگی میں ہماری حقیقی کامیابی کا بڑی حد تک تعین اس سے ہوتا ہے کہ ہم مخالف حالات سے کس طرح نبرد آزما ہوتے ہیں: ہم مخالف حالات سے فرار ہو جاتے ہیں یا ان کا سامنا کرتے ہیں، ہم سکڑ سمٹ جاتے ہیں یا اس کے ذریعہ ترقی پاتے ہیں، ہم اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں یا اس پر فتح پاتے ہیں۔

ہم ایک ادھوری دنیا میں ادھورے لوگوں کے ساتھ جی رہے ہیں۔ کوئی شخص، کوئی مذہب، کوئی پیغمبر بھی ہم سے یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ ہماری زندگیاں اذیت اور مایوسی سے آزاد ہوں گی۔ اسی طرح کوئی شخص ہم سے یہ وعدہ نہیں کر سکتا کہ ہماری زندگیاں مکمل طور پر محفوظ اور ہمارے قابو میں ہوں گی۔ ہم اس صورت حال میں اکیلے نہیں ہیں۔ ہر زندہ انسان اسی صورت حال سے دوچار ہے۔ خدا نے یہ زندگی بنائی ہی اس ڈیزائن کے ساتھ ہے۔ یہاں مال، دولت، سکے رشتے آزمائش کا باعث بن جاتے ہیں۔ ہر زندہ شخص نا انصافی سے دوچار ہوتا ہے اور صدمہ سہتا ہے اور کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی نقصان اٹھاتا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ ایسا ”کیوں“ ہوتا ہے، سوال یہ ہے کہ وہ اس سے ”کس طرح“ نبرد آزما ہوتے ہیں۔

جو لوگ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں، وہ نا انصافی کے مقابلہ سے فرار نہیں ہوتے۔ وہ فقط اسے قبول کرنا

جو لوگ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں، وہ نا انصافی کے مقابلہ سے فرار نہیں ہوتے وہ فقط اسے قبول کرنا سیکھتے ہیں اور اس سے زیادہ تعمیری انداز میں فائدہ اٹھاتے ہیں



براہ کرم پاکستان ریلوے سے متعلق اعلیٰ وادنی حکام اور مسافر اس تحریر کو نہ پڑھیں، دل پر بوجھ پڑے گا اور دکھ کا احساس بڑھے گا

یہ ہیں دنیا کے 10

حیران کن ریلوے فیکٹس

حیرت میں مبتلا کرنے والے 10 عوامی منصوبوں کا تذکرہ جنہوں نے کروڑوں لوگوں کی زندگی سہولت اور آرام سے بھر دی

تحقیق و جتو ہسپتال

جرات ہر شے سے بڑھ کر ایک فیصلہ ہوتی ہے۔ گہرائی تک کھوجنے اور اپنے کردار کی جتنی کرسکتا ہے، جب زندگی ہمیں اضطراب کا شکار کیے دست تب مضبوطی کا سرچشمہ ڈھونڈنے کا فیصلہ!! اگر ہم انسان بننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں فیصلہ کرنا ہوگا۔

عظیم الہیات داں اور (The Courage to Be) مصنف پال ٹیلچ (Paul Tillich) سے اس کے مرتبہ تھوڑا عرصہ پہلے پوچھا گیا کہ اس کی کتاب کا مرکزی خیال کیا ہے اور روزمرہ کی جرات سے اس کی کیا مراد ہے۔ پال ٹیلچ نے کہا کہ حقیقی جرات زندگی کی تمام تر مشکلات اذیتوں کے باوجود اسے ”ہاں“ کہنا ہے۔ مشکلات اذیت تو انسانی ہستی کا حصہ ہیں۔ اس نے کہا کہ زندگی ہمارے اپنے حوالے سے روزانہ کی بنیاد پر مثبت اور با چیزوں کو ڈھونڈنا جرات کا متقاضی ہوتا ہے۔ جب ہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں، تب ہم نہ صرف زندگی کو طور پر قبول کرتے ہیں بلکہ اسے مکمل طور پر جینا بھی کرتے ہیں۔ ”زندہ رہنے کی جرات کی سب سے صورت زندگی سے محبت کرنا ہے۔“

زندگی مشکل ہے..... اور یہ ہمیشہ منصفانہ نہیں ہوتی۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ اچھی، شرم آور مسرت بخش نہیں ہو سکتی۔ جس خدا نے اپنی مہربانی سے اسے بنایا اور سجایا ہے۔ اس نے ہر مسئلے کا حل بھی رکھا ہے اور انعام بھی۔ کہیں صبر سے اس کا مقابلہ سکھایا ہے تو کہیں آگے بڑھ کر تدبیر اور تدبیر سے اس پر جھپٹنا سکھایا ہے۔ پوری نسل انسانی میں کامیابی اور خوشی انہی لوگوں کو ملی جو مشکلوں اور نا کامیوں پر رونے نہیں بیٹھ گئے بلکہ عزم اور زیادہ ہمت کے ساتھ اگلے معرکے کی تیاری کرتے جت گئے۔ وہ چاہے تیمور ہو، بابر ہو، محمود غزنوی ہو یا مسلمان اور محقق ہو۔ (ہال اربن کے خیالات سے ماخوذ)

سکھتے ہیں اور اس سے زیادہ تعمیری انداز میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔

ہو سکتا ہے ”خدا نے مجھے عطا کی ہے۔۔۔۔۔“

ان چیزوں کو قبول کرنے کی ہمت، جنہیں میں تبدیل نہیں کر سکتا۔

ان چیزوں کو تبدیل کرنے کی جرات، جنہیں میں تبدیل کر سکتا ہوں۔“

روزمرہ کی جرات

ہم جو کچھ بنتے ہیں اس کا انحصار حالات پر نہیں بلکہ فیصلوں پر ہوتا ہے۔ بعض لوگ جب حالات اچھے ہوتے ہیں تو وہ چوٹی پر ہوتے ہیں اور جب حالات برے ہوتے ہیں تو وہ لڑکھڑا جاتے ہیں، شکستہ دیواروں جیسے ہو جاتے ہیں، برباد ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی اپنے قابو سے باہر چیزوں، ستاروں، قسمت، ہواؤں اور جنات وغیرہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ یہ نہیں سمجھتے، کہ جب ہم کسی مشکل صورت حال سے دو چار ہوتے ہیں تو ایک فیصلہ بھی ہمارے سامنے ہوتا ہے۔ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ مشکل صورت حال کے سامنے ہتھیار ڈال دینے ہیں یا اس کا مقابلہ کرنا ہے۔

زندگی کی درست حقیقتوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لیے جرات درکار ہوتی ہے۔ ٹنسن چرچل جرات کو ایک نکتہ آغاز تصور کرتا تھا۔ اس نے کہا تھا، ”جرات انسانی اوصاف میں سب سے پہلا وصف ہے کیونکہ یہ باقی سب کی ضامن ہے۔“ وہ ویسی جرات کی بات نہیں کر رہا جس کا مظاہرہ مشہور لوگ بڑے واقعات کے دوران کرتے ہیں، وہ تو ”روزمرہ کی جرات“ کی بات کر رہا ہے۔ نہ تو کوئی شخص اس کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے لیے غیر معمولی خصوصیات درکار ہوتی ہیں۔

جو معاملات صدمہ پہنچاتے ہیں، وہ سبق بھی سکھاتے ہیں

۲۰۰۳ء میں تجرباتی سفر ۳۶۱ کلومیٹر (۵۸۰.۸۵ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کیا۔

فرانس۔ دنیا کی دوسری تیز

ترین ٹرین کا اعزاز

تیز رفتار ترین نیٹ ورکس کے حوالے سے، فرانس کا شمار یورپ میں پہلی پوزیشن پر ہوتا ہے جہاں پہلی ٹی جی وی ٹرین کا آغاز ۱۹۸۱ء میں کیا گیا جس کی توسیع کا کام جاری ہے۔ مذکورہ نیٹ ورک فی الوقت نہ صرف فرانس کے ۱۵۰ بڑے اسٹیشنوں تک پھیلا ہوا ہے بلکہ فرانس کی تیز رفتار ترین ٹی جی وی ۱۵۰ پر ڈی ممالک تک خدمات فراہم کر رہی ہے۔ اس کی عمومی رفتار ۲۰۰ میل (۳۲۱.۸۰ کلومیٹر) فی گھنٹہ ہے۔ تاہم، ۲۰۰۷ء میں اس



جے آر میگلو ایم ایل ایکس ۱

جاپان۔ تیز ترین ریلوے کا بانی

تیز رفتار ٹرینوں کے حوالے سے جاپان کا نام عالمی سطح پر سر فہرست ہے، جس نے دنیا کے پہلے جدید ہائی اسپید ریلوے نیٹ ورک کا آغاز، یکم اکتوبر ۱۹۶۴ء ہی کو کر دیا تھا۔ جاپانیوں نے اس شعبے میں پہلا سنگ میل اس وقت طے کیا جب انہوں نے ”توکانڈشکائن“ بلیٹ

ترین متعارف کرائی جس کی زیادہ سے زیادہ حد رفتار ۷۰۰ میل (۲۷۰ کلومیٹر) فی گھنٹہ تھی۔ ابتدا میں چلنے والی بلیٹ ٹرینوں نے صرف تین برسوں میں ۱۰ کروڑ سے زائد مسافروں کو ان کی منزلوں تک پہنچایا جب کہ موجودہ دور کی تیز رفتار ٹرینیں، یومیہ ۳۷۸۰۰۰ مسافروں کو ان کی منزلوں تک پہنچا رہی ہیں۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی



ٹی جی وی ۱۵۰

نے تجرباتی طور پر ۳۵۷ میل (۵۷۴ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کیا، جس کے بعد اسے دنیا کی دوسری تیز ترین رفتار ٹرین سروس ہونے کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ ٹی جی وی کی ہائی اسپید ٹیکنالوجی، مختلف یورپی ممالک بشمول برطانیہ، بیجیم، نیدرلینڈ اور جرمنی کی نیشنل ٹرینوں میں استعمال ہو رہی ہے۔

چین

چین کے پاس دنیا کا سب سے طویل ترین ہائی اسپید ریل نیٹ ورک ہے، جو ۶۰۰ میل سے زائد طویل

میں جاپانی انجینئرز نے میگلو ٹرینیں (Maglev Trains) بھی متعارف کرائیں۔ اس منصوبے پر ۱۱۲.۴ ارب ڈالر کی لاگت آئی۔ اس کے تحت ٹوکیو، ناگویا اور اوسا کا کے درمیان جدید ترین ریلوے لائن ۲۰۲۷ء تک مکمل کر لی۔ ٹوکیو اور اوسا کا کے درمیان توکانڈشکائن کے ذریعے ۲ گھنٹے ۱۸ منٹ کا سفر، اس ہائی اسپید ٹرین کے ذریعے صرف آدھے گھنٹے میں طے کیا جاتا ہے۔ فی الوقت تجرباتی طور پر چلائی جانے والی جے آر میگلو ایم ایل ایکس ۱، دنیا کی سب سے تیز رفتار ٹرین تصور کی جا رہی ہے، جس نے

ٹرانس ریپڈ سسٹم ہائی اسپید موٹو ٹرینیں تیار کیں۔ جو میگنیٹک لیوٹیشن (میگلو) ٹیکنالوجی پر چل رہی ہیں۔ یہ ٹرینیں ۳۱۱ میل (۵۰۰ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر سکتی ہیں۔ ۲۰۰۴ء میں چین کے شہر شنگھائی میں میگلو ٹرین پہلی کمرشل ٹرانس ریپڈ ٹرین



سی آر ایچ ۳۸۰ ایل

روس پر محیط ہے اور جس کا بیجنگ شنگھائی لائن پر گزشتہ ماہ سروس کا آغاز ہوا۔ ۸۱۹ میل طویل روٹ کی تعمیر پر ۶۰ بلین کیوبک میٹر کنکریٹ استعمال کیا گیا ہے۔ اس پر استعمال ہونے والے کنکریٹ کی مقدار، تین بڑے ڈیمز کی تیاری میں استعمال ہونے والے کنکریٹ سے بھی ڈگنی ہے۔ اس روٹ پر سی آر ایچ ۳۸۰ ایل ٹرینیں ۱۸۶ میل (۲۹۹.۲ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی عمومی رفتار سے

چل رہی ہیں۔ تاہم انہیں تجرباتی طور پر ۳۲۰ میل (۵۱۴.۹ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے بھی چلایا جا چکا ہے۔ چین کی پہلی ہائی اسپید لائن کا آغاز ۲۰۰۷ء میں ہوا تھا، اس کے ذریعے صرف پہلے دو برسوں کے دوران ۴۰.۶ بلین مسافروں نے سفر کیا۔

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حکومت چین ۲۰۱۵ء کے اختتام تک ہائی اسپید نیٹ ورک کو توسیع دے کر ۲۸۰۰۰۰ میل تک پھیلانے کے منصوبے پر کام کر رہی ہے۔

جرمنی۔ ہائی اسپید ٹرینوں کا اصل مرکز

بنیادی طور پر ہائی اسپید ٹرینوں کی ٹیکنالوجی کا مرکز جرمنی ہے۔ ہائی اسپید ٹرینیں تیار کرنے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی سیمنز کا تعلق بھی اسی ملک سے ہے۔ جرمن کمپنیوں سیمنز اور تھیسین گروپ نے مشترکہ طور پر



ٹرانس ریپڈ ٹی آر ۷۰

سے جرمنی میں انٹرنیٹ ایکسپریس آئی سی ای سسٹم اختیار کیا گیا۔ یہ ہائی اسپید ٹرینیں ۱۹۹ میل (۳۲۰ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہیں۔ یہ ٹرینیں، جرمنی کے شہروں کو سوئٹزرلینڈ، آسٹریا، ہالینڈ اور نیدرلینڈ کے شہروں سے ملاتی ہیں۔

اسپین۔ یہاں کمرشل ٹرینوں کی رفتار

۳۰۰ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے

اسپین کے پاس یورپ کا سب سے طویل ہائی اسپید

ایکس۔ اے کے نام سے معروف ہے، جو روزانہ اپنی دو لاکھوں پر ۱۰۰۰۰۰ سے زائد مسافروں کو ان کی منزل مقصود تک پہنچاتی ہے۔ اپریل ۲۰۱۰ء میں، ۱۷۸۵۸۳ مسافروں کی ریکارڈ تعداد نے ملک کی ہائی اسپید لائن سے سفر کیا، جس کا آغاز ۲۰۰۳ء میں ہوا۔ اس ہائی اسپید ٹرین نے دارالحکومت سیول سے ساحلی شہر بوسان



یورو اسٹار ۱۳/۳۳۱۳

تک کا سفر ۲ گھنٹے اور ۴۰ منٹ میں طے کر لیا، جو ماضی کے مقابلے میں نصف تھا۔ دونوں شہروں کے درمیان سفر کا دورانیہ اس وقت مزید ۲۲ منٹ کم ہو گیا جب دوسری لائن کا افتتاح کیا گیا۔ ہائی اسپید ریل کے اثرات مقامی ائر لائن انڈسٹری پر مرتب ہوئے جس کی گنجائش ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۷ء کے درمیان ۳۰ فیصد سے بھی کم ہو گئی، حالانکہ کم کرایوں والی ائر لائن متعارف



کے ٹی ایکس۔ اے

یورو اسٹار نے مغربی یورپی سفر کا انداز ہی تبدیل کر دیا ہے۔ ۱۹۹۳ء میں، اس کے افتتاح کے بعد سے لندن ہائی اسپید ریل نیٹ ورک، انگلینڈ کو فرانس اور بیلجیئم کے شہروں سے انکس چینل میں زیر زمین سرنگ کے ذریعے ملاتا ہے۔ اس نیٹ ورک پر چلنے والی ۲۷ ٹرینیں یورپ کے ۱۰۰ سے زائد شہروں کو باہم ملاتی ہیں۔ اس نیٹ ورک پر ۱۰ کروڑ ویں مسافر نے اگست ۲۰۰۹ء میں سفر کیا۔ مسافروں کے ہمراہ یہ

ٹرینیں ۱۸۶ میل (۳۰۰ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔ یورو اسٹار ۱۳/۳۳۱۳ نے ۱۹۷۹ء میں قائم ہونے والا برطانوی ریل ریکارڈ ۲۰۰۳ء میں ۲۰۸ میل (۳۳۴.۶۷ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر کے قول دیا۔ برٹش ٹرین نیٹ ورک یورو اسٹار کو حال ہی میں فرانسیسی ٹرین

ساز ادارے الشام نے قانونی طور پر چیلنج کر دیا۔ الشام کو اعتراض ہے کہ یورو اسٹار نے ۱۰ نئی ٹرینوں کے لیے ۶۰۰ ملین ڈالر کا ٹھیکہ جرمنی کی ٹرین ساز کمپنی سیمر کو کیوں دیا تاہم برطانوی عدالت نے کنٹریکٹ معطل کرنے کے لیے فرانسیسی ٹرین ساز ادارہ کی درخواست مسترد کر دی۔ الشام دنیا کی دوسری سب سے بڑی ٹرین ساز کمپنی ہے جو موجودہ یورو اسٹار ٹرینوں کی سب سے بڑی سپلائر بھی ہے۔

جنوبی کوریا۔ روزانہ ایک لاکھ سے زائد مسافر جنوبی کوریا کا ہائی اسپید نیٹ ورک، ایکسپریس کے ٹی

شامل ہے جس کی پہلی ہائی اسپید لائن ۱۹۷۷ء میں اس وقت عالمی فسادات ابلاغ کی شہ سرخیوں کی زینت تھی جب اس لائن کے تقریباً نصف فاصلے کے لیے روم سے سیٹاڈیلا ہو تک، پہلے ۸۶ میل کے لیے سروس کا آغاز کیا گیا۔ اس ٹریک پر ٹرین کی رفتار ۱۶۰ میل (۲۵۷ کلومیٹر) فی گھنٹہ



اے وی ای کلاس ۱۰۳

تھی۔ اسی وقت سے اٹلی میں ہائی اسپید ریل نیٹ ورکس کو مسلسل توسیع دی جا رہی ہے۔ اب ہائی اسپید لائن نے شمال میں ٹورینو جب کہ وینس فلیپس جیسے دور دراز شہروں کو باہم ملا دیا ہے۔ اطالوی ساختہ ۵۰۰ فریسیاروسا ۲۲۵ میل (۳۶۰ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اطالوی حکومت کو ملک کے شمال میں وادی سوسا میں ایک ریلوے سرنگ کی تعمیر پر مقامی افراد کی مزاحمت کا



ای ٹی اے فریسیاروسا

سامنا ہے۔ حال ہی میں اس کی تعمیر کے خلاف ریلی نکالنے والے ۲۰۰ افراد پولیس سے تصادم کے باعث افراتفری ہو گئے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ۳۶ میل طویل سرنگ کی تعمیر سے پیرس اور میلان کے درمیان سفر کا موجودہ دورانیہ ۷ گھنٹوں سے کم ہو کر ۳ گھنٹوں تک رہ جائے گا۔ محققین کا کہنا ہے کہ ریلوے لائن کی تعمیر سے علاقہ تباہ ہو جائے گا اور زہریلے کیمیکلز خارج ہوں گے جو مختلف بیماریوں کا موجب بنیں گے۔

یورو اسٹار۔ اس نے یورپی سفر کا انداز ہی بدل ڈالا

ریل نیٹ ورک ہے جو ۳۳۳ میل لمبے ٹریکس پر مشتمل ہے۔ اس نیٹ ورک پر ۶ ہائی اسپید ٹرین لائنیں چل رہی ہیں جب کہ ابھی مزید کئی زیر تعمیر ہیں۔ ہسپانوی حکومت کی خواہش ہے کہ اس کی ۹۰ فی صد آبادی کے لیے ۲۰۲۰ء تک ہر ۳۱ میل کے فاصلے پر ہائی اسپید اسٹیشن دستیاب ہو۔ ملک کی تیز رفتار ٹرینیں، اے وی ای سیریز کی ہیں جو ٹرینیں بنانے والی مختلف کمپنیوں، بشمول سیمر، الشام اور بمبارڈیئر کی بنائی ہوئی ہیں۔ سیمر ساختہ اے وی ای کلاس

۱۰۳ ٹرین نے کمرشل سروس کا آغاز ۲۰۰۷ء میں کیا۔ اس ٹرین نے میڈرڈ اور زراگوزہ کے درمیان تجرباتی طور پر ۲۵۱ میل (۴۰۴ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کیا۔ اسپین میں کمرشل ٹرینوں کے لیے زیادہ سے زیادہ حد رفتار ۱۸۶ میل (۳۰۰ کلومیٹر) فی گھنٹہ ہے۔ یورو زون قرضہ بحران اور پرتگال

کے اسٹریٹجی پلان کے باعث نیٹ ورک کے اہم توسیعی منصوبے پر عمل درآمد روک دیا گیا ہے جس کے تحت ہائی اسپید ٹرین سروس کے ذریعے ہسپانوی دارالحکومت میڈرڈ کو پرتگال میں لزبن سے ملایا جانا تھا۔ اس ہائی اسپید ٹرین کے ذریعے دونوں شہروں کے درمیان موجودہ ۹ گھنٹے طویل سفر کو ۲ گھنٹے ۴۵ منٹ تک محدود کرنے کا منصوبہ تھا۔

اٹلی۔

یورپین ہائی اسپید ریل ٹیکنالوجی باتیوں میں اٹلی بھی

لیجیے کئی حیرتیں آپ کی منتظر ہیں

عبدالہادی احمد

دماغ کے 17 راز جو آپ نہیں جانتے

تحقیق ہمیشہ ان گوشوں کو سامنے لاتی ہے جو معلوم نہیں ہوتے
اور اب کے یہ تحقیق خود اسی تحقیق کرنے والے دماغ کے بارے میں ہے

کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔ تاہم، ۲۰۰۹ء میں آزمائشی سفر کے دوران حد رفتار ۱۷۵ میل (۲۸۱.۵۷ کلومیٹر) فی گھنٹہ ریکارڈ کی گئی۔ فیفا ورلڈ کپ ۲۰۱۸ء کی میزبانی سے قبل روس، اپنے ہائی اسپید نیٹ ورک میں توسیع کے لیے پرمیٹ ہے۔

وطن عزیز کا ڈوبتا ڈمگاتا ریلوے سسٹم پاکستان میں ریل کے تیز رفتار سفر کے متعدد دعووں کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تیز رفتار



سینٹر ویلر و آریو ایس

ٹرینوں کے سفر کا تصور ہی ناپید ہے۔ پاکستان ریلویز تیز رفتاری کے لیے اقدامات تو کجا، اپنی بقا کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے۔ گزشتہ دو عشروں کے دوران ٹرین نیٹ ورک مسلسل سکڑتا رہا ہے۔ ۶۰ میل (۹۶.۵۴ کلومیٹر) فی گھنٹہ کی رفتار سے چلنے والی ٹرینیں ہی اس ملک میں تیز رفتاری کے زمرے میں آتی ہیں۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ نقل و حمل کی تیز رفتار سہولتیں کسی بھی ملک کی معاشی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ ترقی یافتہ ملک کی حیثیت رکھنے والی اقوام کے درمیان ہائی اسپید ٹرینوں میں سرفہرست رہنے کے لیے دوڑ لگی ہوئی ہے، تو دوسری جانب پاکستان میں ٹرینوں کا موجودہ نیٹ ورک آخری سانسیں گن رہا ہے۔



ٹی ایچ ایس آر ۷۰۰ رٹی

سے کم ہو کر ۹۰ منٹ رہ گیا۔ تائیوان نے اپنی ہائی اسپید ٹرینوں کو ۲۰۰۷ء میں شنگھائی بلیٹ ٹرین ماڈل کی بنیاد پر ڈیولپ کیا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں ریکارڈ ۳۶۹.۹۹ ملین مسافروں نے ان ٹرینوں سے سفر کیا، جو گزشتہ برس کے مقابلے میں ۱۲ فی صد زائد ہیں۔

ملک کا ہائی اسپید ریل سسٹم حال ہی میں اس وقت عالمی خبروں کی زینت بن گیا جب حکومت نے اعلان کیا کہ ٹرین سروس ۱۰ سال سے زیادہ جاری نہیں رہ سکے گی کیونکہ پانی کے زائد استعمال کے باعث زمین ڈوب رہی ہے۔ حکومت نے گزشتہ ماہ کہا کہ وہ زمینی پانی کے گہرے کنوؤں کو بند کر رہی ہے تاکہ یہ مسئلہ حل ہو سکے جو ہائی اسپید سسٹم کے ڈھانچے کی بنیاد کے لیے خطرہ بن گیا ہے۔

روس۔ ۸ گھنٹے کا سفر ۳ گھنٹے میں

روس کی تیز رفتار ہائی اسپید ٹرین ماسکو سے سینٹ پیٹرز برگ لائن پر چلتی ہے، جس کا افتتاح ۲۰۰۹ء میں ہوا۔ جرمن ساختہ ویلر و آریو ایس ٹرینیں ملک میں ساپان کے نام سے مشہور ہیں۔ ان ٹرینوں کے متعارف کرائے جانے کی وجہ سے ۸ گھنٹوں پر محیط ۴۰۱ میل کا فاصلہ اب کم ہو کر صرف ۳ گھنٹے اور ۳۵ منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ ان ۸ ہائی اسپید ٹرینوں پر تقریباً ایک ارب ڈالر خرچ کیے گئے ہیں۔ ۱۰ مسافر کار ٹرینوں پر مشتمل ہائی اسپید ٹرین عمومی طور پر ۱۵۵ میل (۲۴۹.۳۹

گزشتہ

برس سائنسدان انسانی جسم کے کئی عجائبات جان چکے لیکن وہ دماغ کے اسرار سے واقف نہیں ہو سکے۔ تاہم سائنسی تحقیق کے باعث رفتہ رفتہ نئے راز افشا ہو رہے ہیں۔ انہی میں سے حیرت انگیز انکشاف پیش خدمت ہیں۔

(۱) ۱۰۰ ارب عصبی خلیے

انسان جب کوئی بات یاد کرنے کی کوشش کرے تو کچھ دیر لگتی ہے۔ ایسی حالت میں بعض لوگ اپنی یادداشت کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ حالانکہ اس میں بچارے دماغ کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ دراصل ہمارا دماغ ۱۰۰ ارب عصبی خلیوں کا مجموعہ ہے۔ جب ہم کوئی بات یاد کرنے کی سعی کریں تو ہمارے احکامات دماغ میں فی سیکنڈ ۵۰ تا ۱۲۰ میٹر کی شرح سے دوڑتے ہیں۔ چنانچہ احکامات بجالانے میں کچھ دیر لگ جاتی ہے۔ ایک اور دلچسپ بات: انسانی دماغ کا وزن صرف ۱.۳ پاؤنڈ ہے لیکن وہ اپنی سرگرمیاں انجام دیتے ہوئے جسمانی توانائی کا ۲۰ فیصد استعمال کرتا ہے۔

(۲) گوگل دماغ کو کمزور بنا رہا ہے

۲۰۱۱ء میں کولمبیا یونیورسٹی امریکا کے محققوں نے بعد از تحقیق دریافت کیا ہے کہ انسان جب انٹرنیٹ استعمال کرے تو سوچ بچار پر کم اور یادداشت پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ لیکن یہ امر دماغ کو کمزور کرتا ہے اور وہ کئی باتیں بھولنے لگتا ہے۔ لہذا ہمیں چاہیے کہ غور و فکر پر زیادہ دھیان دیں۔

(۳) ردی (Junk)

غذائیں اور منشیات

چند ماہ قبل ولندیزی ماہرین نے ایک انوکھا تجربہ کیا۔ انھوں نے پانچ

لوگوں کے سامنے برگر، چرغ، چیس وغیرہ کے نام بولے تب ان کے دماغ میں وہی جیسے متحرک ہو گئے جو منشیات استعمال کرنے والوں کے دماغوں میں بھی تحریک پیدا کرتے ہیں۔ ماہرین کی رو سے یہ تحریک ہم میں جوش و جذبہ لذت پیدا کرنے والے ہارمون، ڈوپامائن سے جنم لیتا ہے۔

(۴) موسیقی اور بقی یادیں

انسان کی یادداشت میں بچپن کے سنے گانے محفوظ رہتے ہیں۔ ۲۰۱۰ء میں ایک تجربے سے انکشاف ہوا کہ آواز جب بچپن میں سنا کوئی گانا سنے، تو اُسے بہت سی خوشی یادیں یاد آ جاتی ہیں۔ اس کا موڈ بھی بہتر ہو جاتا ہے۔

(۵) پیشین گوئی کرنے کی صلاحیت

جدید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دماغ کا سب سے اگلا حصہ، فرنٹ پورل کارٹیکس (Frontal Cortex) ماضی کے تجربات سے نتائج اخذ کر کے مستقبل کی پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ وہ ذہنی طور پر فوق البشر طاقت (سپر پاور) نہیں رکھتا تاہم تجربوں کے بل پر مختصر مدتی پیشین گوئیاں کرنے کے قابل ہے۔

(۶) دماغی کمپیوٹر کھیل مفید نہیں

ایک تجربے میں ماہرین نے ۲۰ بچوں کو ۳ ماہ تک کمپیوٹر میں کھیلے جانے والے دماغی کھیل (Computer Games) کھلائے۔ اس دوران بچے بعض



سرگرمیاں بہتر انجام دینے لگے۔ مگر ماہرین نے یہی نتیجہ نکالا کہ دماغی کھیل کام یا یادداشت اور سیکھنے کی صلاحیتوں پر مثبت اثرات نہیں ڈالتے۔ اس کے بجائے موسیقی سننا یادداشت تیز کرتا ہے۔ امریکی یونیورسٹی، سٹانفورڈ نے بعد از تحقیق جانا ہے کہ موسیقی سننے والا اپنے کام منظم طریقے سے کرتا، توجہ دیتا، پیشین گوئیاں کرتا اور اپنی یادداشت اپ ڈیٹ کرتا رہتا ہے۔

(۷) مرد اور خواتین کا دماغ

وزن کے لحاظ سے مردوں کا دماغ خواتین کی نسبت ۱۰ فیصد زیادہ بھاری ہوتا ہے۔ لیکن مرد کیسیس نہ نکالیں، بڑے دماغ کے باعث وہ زیادہ ذہین نہیں ہوتے، بس اس قابل ہو جاتے ہیں کہ جسمانی کام بہتر طور پر کر سکیں۔

(۸) دماغ کا شباب

انسان جب ۲۰ سے ۲۵ سال کے درمیان عمر رکھے، تو اس کی دماغی صلاحیتیں عروج پر ہوتی ہیں۔ گویا تب دماغ اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ ۲۵ سال کے بعد یادداشت کمزور ہونے لگتی ہے۔ اگرچہ دماغی صلاحیتیں خاصی حد تک برقرار رہتی ہیں۔ ۴۵ سال کے بعد انھیں زوال آنے لگتا ہے۔ ماہرین مشورہ دیتے ہیں کہ دماغ اور ذہنی صلاحیتوں کو توانا رکھنے کے لیے مخصوص غذائیں مثلاً نیلی بیریاں (Blueberries)، اخروٹ وغیرہ کھائیے۔ یہ یادداشت

کھونے کے مرض زلیان اور الزائمر سے انسان کو محفوظ رکھتیں اور اسیٹیل کلویٹین (Acetylcholine) کی شرح بڑھاتی ہیں۔ یہ ہارمونی مادہ یادداشت بہتر بناتا ہے۔

(۹) موبائل فون دور رکھیے

جدید تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ روزانہ موبائل کا حد سے زیادہ استعمال دماغ کے لیے مضر ہے۔ بلکہ وہ دماغی کینسر بھی پیدا کر سکتا ہے۔ مزید برآں انسان میں نیند اور گھبراہٹ کے مسائل پیدا کرتا ہے۔ لہذا موبائل زیادہ استعمال نہ کیجیے یا پھر

ہیڈ سیٹ یا ایرپس سے مدد لیں۔

(۱۰) سدا

جاگتے دماغی

حصے

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ رات کو اچھی نیند لے کیونکہ یوں یادیں مستحکم ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ سوتے ہوئے بعض دماغی حصے بدستور بیدار رہتے ہیں۔ دراصل وہ یادوں کو پرویس کرتے اور غیر اہم یادوں کو مٹا ڈالتے ہیں۔

(۱۱) خوش رہیے، عمر بڑھائیے

تحقیق سے ثابت ہو چکا کہ امید پرست افراد مایوس لوگوں سے زیادہ جیتے ہیں۔ لیکن باعث مسرت بات یہ ہے کہ جینور زندگی کا نقطہ نظر بنانے میں صرف ۳۰، ۴۰ فیصد کردار ہی ادا کرتے ہیں۔ چنانچہ کوئی مایوس امید بھرا نقطہ نظر اپنانا چاہے تو وہ بتدریج اپنے خیالات بدل کر مثبت زندگی گزار سکتا ہے۔

(۱۲) مراقبہ اور ذہنی صحت

ماہرین کا کہنا ہے کہ جو انسان آٹھ ہفتوں تک روزانہ ۳۰ منٹ مراقبہ کرے، اس سے ان دماغی علاقوں کو تقویت پہنچتی ہے جو یادداشت، احساسِ خودی، ہمدردی اور ذہنی دباؤ (سٹرلٹس) سے متعلق ہیں۔

مراقبہ کا بہترین طریقہ کار یہ ہے کہ کوئی سکون بخش لفظ دل ہی دل میں دہراتے رہے تاکہ انتشار پھیلانے والے خیالات دماغ پر حملہ آور نہ ہوں۔ یا پھر نظامِ تنفس پر توجہ مرکوز کیجیے تاکہ خیالات بھی مرکوز رہیں۔

(۱۳) مصروفیت کا مطلب تندرست ہونا نہیں

کئی مردوزن دفتر یا گھر میں مصروف رہ کر سمجھتے ہیں کہ اپنی سرگرمیوں کی بدولت وہ تندرست (فٹ) رہیں گے۔ لیکن دفتری یا گھریلو مصروفیت ورزش کا نعم البدل نہیں ہو سکتی جو دماغ کے لیے بہت مفید ہے۔

ورزش کے ذریعے دماغ خود کو تازہ دم کرتا اور کئی بیماریوں مثلاً الزائمر سے بچاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ روزانہ کم از کم ۳۰ منٹ کی ورزش کیجیے۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ اپنی گاڑی ذرا دور کھڑی کریں تاکہ چلنے کا موقع ملے، سیرھیاں چڑھیے اور اپنے دیگر کام کیجیے جن میں بدن حرکت کرے۔

(۱۴) دماغ کے لیے مفید غذائی عناصر

ان عناصر میں اومیگا۔تھری تیزاب، کولائن، پیچیدہ (Complex) نشاستے اور مانعِ تکسیدی (Antioxidants) مادے شامل ہیں۔ اومیگا۔تھری تیزاب دماغ کی دانشورانہ صلاحیتیں بڑھاتے ہیں۔ کولائن (Choline) وٹامن بی کی ایک قسم ہے۔ یہ جراثیم انڈوں اور دیگر غذاؤں میں ملتا ہے۔ یہ جسمانی چھٹکن کم کر کے دماغی چستی میں اضافہ کرتا ہے۔ نیز یادداشت بڑھاتا اور ذہنی دباؤ دور کرتا ہے۔ پیچیدہ نشاستے اور مانعِ تکسید مادے بھی دماغی کارکردگی بہتر کرتے ہیں۔

(۱۵) ہنسی واقعی بہترین دوا ہے

تجربات سے ثابت ہو چکا کہ جب انسان قہقہہ سنے، تو دماغ کے دو حصوں، ایپی گنڈالا (Amygdala) ہپوکیپس (Hippocampus) پر خوشگوار اثرات پڑتے ہیں۔ دونوں حصے انسان میں ڈیپریشن پیدا کرتے ہیں۔ ایک اور علاقہ، نیوکس اکومبسن (Accumbens) بھی متحرک ہے۔ یہ انسان میں مسرت بخش جذبات جنم دیتا ہے۔ ہنسنے سے انسان میں سٹرلٹس پیدا کرنے والے ہارمونز (ہارٹ اٹیک) اور فالج کے حملے سے انسان کو نجات ملتی ہے۔ چند ماہ قبل واشنگٹن یونیورسٹی میں ایک تجربے سے انکشاف ہوا کہ آدمی جب بچوں کی ہنسی اور کلاکریاں سنے اس میں ہارمون آکسی ٹوسین کی مقدار بڑھتی ہے۔ یہ ہارمون ہمارے اندر خوشی کا احساس بڑھاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے انٹرنیٹ میں ہنسنے والے بچوں کی ویڈیو بہت مقبول ہیں۔

(۱۶) بلند فشارِ خون پر نگاہ رکھیے

بلند فشارِ خون یا ہائپرٹینشن دورِ جدید کا ایسا خطرناک مرض ہے جسے کئی لوگ سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ حالانکہ یہ مرض دماغ اور دل پر بے پناہ دباؤ ڈالتا اور انھیں کمزور دیتا ہے۔ اس لیے بلند فشارِ خون (بلڈ پریشر) کا علاج لے اور خصوصاً اسے قابو سے باہر نہ ہونے دیں۔

(۱۷) ذیابیطس سے بھی بچے

نیویارک یونیورسٹی کے ماہرین گذشتہ ۹ برس سے یہ تحقیق کر رہے تھے کہ ذیابیطس کے جو مریض اپنے خون کی شکر قابو میں نہیں رکھتے، ان پر کیسے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جون ۲۰۱۳ء میں تحقیق کے جو نتائج شائع ہوئے۔ ان سے ایک بڑا انکشاف یہ ہوا کہ ذیابیطس رفتہ رفتہ دماغ کو کمزور کر دیتا ہے۔ لہذا اگر آپ ذیابیطس کے مریض ہیں تو اس مرض پر قابو پائیں اور خون میں شکر کی سطح اعتدال پر رکھیں۔

کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟

انسانی بدن سے 10 تا 100 ملی واٹ بجلی پیدا کرنے کی کوشش کیا رنگ لائے گی؟

انسانی جسم
سے جنم لینے والی

سائنسدان آرام دہ مگر بجلی پیدا کرنے والا لباس بنانے کے لیے کس قدر بے آرام ہیں؟

سعید انصاری

اگر

بجلی نہ ہوتی تو آپ یہ مضمون نہیں پڑھ رہے ہوتے۔ یوں نہیں کہ بجلی جانے سے اندھیرا ہو چکا بلکہ اس لیے کہ بجلی کے بغیر ہمارا دماغ کام نہیں کر سکتا۔ دراصل ہمارے بدن میں دوڑتے پھرتے برقی سگنل ہی ہمیں اس قابل بناتے ہیں کہ ہم کام کر سکیں۔ گو انسانی جسم میں بجلی کی زیادہ مقدار پیدا نہیں ہوتی تاہم سائنس دانوں کو یقین ہے کہ اس سے فائدہ اٹھا کر زندگی بدل دینے والے آلات تیار کرنا ممکن ہے۔ مثال کے طور پر ایسے میٹرل سے ملبوسات تیار کرنا جو انسانی جسم کی حرارت یا حرکت سے بجلی پیدا کر سکیں۔ برطانیہ کی ساؤتھ ہیمپٹن یونیورسٹی سے وابستہ موجد پروفیسر سٹیو پی ایسا ہی لباس ایجاد کرنے کے لیے کوشاں ہے۔

پروفیسر سٹیو ایسا کوٹ بنانا چاہتا ہے جو انسانی جسم پہ لگے طبی نمیشینی آلات (Medical Sensors) کو بجلی فراہم کر سکے۔ یوں آلات کے لیے آسان ہو جائے گا کہ وہ روزانہ مخصوص اوقات میں مریض کا بلڈ پریشر، شکر کی سطح، دل کی دھڑکن وغیرہ چیک کر سکیں۔ وہ آلات پھر نتائج بے تار (وائرلیس) طریقے سے ڈاکٹر یا ہسپتال بھجوا دیں گے۔ یوں مریض کو بار بار ہسپتال یا ڈاکٹر کے پاس جانے سے نجات ملے گی اور وہ وقت، توانائی اور پیسا بچا پائے گا۔

اس سلسلے میں پروفیسر سٹیو کہتا ہے ”ہم ایسا لباس ایجاد کرنا چاہتے ہیں جو روزمرہ کام انجام دیتے ہوئے بجلی بنائے۔ جب وہ وافر بجلی بنا لے تو اسے استعمال کر لیا جائے۔ جب کام ختم ہو تو آلات دوبارہ ”خاموش“ ہو جائیں۔ جب کہ لباس نئے سرے سے بجلی بنانے لگے۔“

تاہم ایسا لباس تیار کرنا سائنس دانوں کے لیے کٹھن چیلنج ہے۔ وجہ یہ ہے کہ بجلی ہمیشہ ایٹموں کی رگڑ سے جنم لیتی ہے۔ جب کہ لباس یوں ڈیزائن ہوتا ہے کہ وہ انسان کو

آرام حرکت کرنے کا موقع دے۔ اسی لیے ماہرین بنانا چاہتے ہیں جو آرام دہ ہونے کے ساتھ ساتھ بجلی سے بجلی بھی پیدا کرے۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے بجلی پیدا کرنے کا نظام جوتے یا موزوں میں فٹ کیا جہاں چلتے ہوئے فطری قوتیں مسلسل حرکت میں رہتی ہیں۔

دل دھڑکنے کی طاقت

انسان کے نظام خون یا اندرونی اعضا کی حرکت سے بھی بجلی پیدا کرنا ممکن ہے۔ ساؤتھ ہیمپٹن یونیورسٹی ہسپتال کے ماہر امراض قلب، ڈاکٹر پال نے تو ایسا پیس میکر ایجاد کر لیا ہے جو دل کی دھڑکن سے بجلی حاصل کرتا ہے۔

ڈاکٹر رابرٹس کہتا ہے ”جب کبھی اتفاقاً ہم دل پہ رکھیں تو اس کے دھڑکنے کی شدت ہمیں حیران کر دیتی ہے۔ حتیٰ کہ عموماً ہم زیادہ دیر اپنے قلب پر ہاتھ نہیں پاتے حالانکہ تب دل حالت آرام میں ہوتا ہے۔ اگر دل چلے پھرے، بھاگے دوڑے اور کام کرے تو حرکت قلب مزید تیز ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہ انسانی عضو توانائی کا خزانہ ہے جس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہے۔“

اس نمیشینی پیس میکر کا غبارہ دل کے دونوں جھوٹوں (چیمبروں) کے درمیان رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ جب دل دھڑکے تو وہ غبارہ بھینچ دیتے ہیں۔ اس غبارے کے ساتھ بذریعہ تار ایک مقناطیس نصب ہے۔ جب بھی غبارہ بھینچے، وہ مقناطیس بجلی پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر رابرٹس اور ان کی ٹیم اس طریقے کے ذریعے پیس میکر کو مطلوب ۵۰ فیصد بجلی پیدا کر چکی۔

فی الوقت ایسے پیس میکر دستیاب ہیں جن کی بیڑیاں ۶، ۷ سال بعد ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ بذریعہ آپریشن نئی بیڑیاں ڈالنی پڑتی ہیں۔ ظاہر ہے اگر مریض کے اپنے

بجلی ہی سے چلے زندگی کی گاڑی

طبیعیات بتاتی ہے کہ ایٹم ذیلی ایٹمی ذرات، نیوٹران، پروٹون اور الیکٹرون سے بنے ہیں۔ نیوٹرون غیر جانب دار (نیوٹرل) بار یا چارج نہیں رکھتا اور الیکٹرون منفی بار رکھتے ہیں۔ جب کسی باعث یہ توازن بگڑ جائے اور منفی بار والے الیکٹرون ایک سے زیادہ ایٹم میں دوڑنے لگیں، تو اسی عمل کو ہم بجلی کہتے ہیں۔

ہمارے جسم میں کیمیائی مادوں کے باعث مخصوص خلیے بجلی پیدا کرتے ہیں۔ خاص طور پر ہمارا اعصابی نظام اسی بجلی کے ذریعے کام کرتا اور دماغ تک مختلف پیغامات یا اشارے بھجواتا ہے۔ مثلاً برقی پیغام کے ذریعے ہی ہاتھ تک یہ حکم پہنچاتا ہے کہ دروازہ کھولا جائے۔

ایک نمیشینی یا برقی سرکٹ میں تاروں کے ذریعے بجلی یا الیکٹرون ایک سے دوسرے جگہ جاتے ہیں۔ ہمارے جسم میں برقی پیغام ایک سے دوسرے خلیے پر سے چھلانگ لگاتا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے۔

روزمرہ کام انجام میں یہ بجلی ہمارے بہت کام آتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو ہمارے لیے کام کرنا بڑا کٹھن مرحلہ بن جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اسی بجلی کے باعث ہمارے جسم میں نظام پیغام رسانی بہت تیز رفتار ہے۔ اس کے ذریعے دماغ سینکڑوں سے بھی کم عرصہ میں اپنے احکامات مختلف اعضاء تک پہنچا دیتا ہے۔

اگر ہمارا جسمانی نظام پیغام رسانی کے لیے صرف کیمیائی مادوں اور ہارمونوں یہ انحصار کرتا تو نوع انسانی بہت پہلے کرہ ارض سے معدوم ہو چکی ہوتی۔ مثلاً کوئی جانور ہمارا پیچھا کرتا اور ہم بھاگتے تو دماغ دل کو تیز دھڑکنے کا پیغام بھجواتا۔ اگر بجلی نہ ہوتی تو یہ پیغام دیر سے دل تک پہنچتا۔ اس دوران وہ کام کرنا چھوڑ دیتا اور موت انسان کا مقدر بنتی۔

بعض لوگ شاید انسانی بدن کو بجلی گھر سمجھیں کیونکہ روزمرہ سرکریموں کا دار و مدار بجلی پر ہی ہے۔ لیکن انسانی جسم ایک وقت میں صرف ۱۰ تا ۱۰۰ ملی وولٹ بجلی پیدا کرتا ہے۔ جب کہ ایل (Eel) مچھلی ۶۰۰ وولٹ تک بجلی پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح کیتھوڈ رے ٹیوب کو جب ۲۵ ہزار وولٹ بجلی ملے تب ہی وہ ٹیلی ویژن پر تصویر لاتی ہے۔

اٹھائے پھرتے ہیں۔ وہ کبھی آلات بیڑیوں سے چلتے ہیں۔ سائنس دان چاہتے ہیں کہ یہ آلات جسمانی بجلی سے کام کریں، یوں بیڑیوں کی ضرورت نہیں رہے گی اور فوجی کو کم وزن اٹھانا پڑے گا۔

بجلی پیدا کرنے والے بعض آلات جوتوں یا فوجیوں کے پشتاروں (بیک پیک) پر لگیں گے۔ چونکہ دونوں مقام عموماً حرکت میں رہتے ہیں لہذا یہاں زیادہ بجلی جنم لے گی۔ کارن فیلڈ یونیورسٹی کے تحقیق رچرڈ ڈیمینیل کا کہنا ہے کہ اگر فوجی کا اپنا بدن بجلی پیدا کرنے لگے تو وہ بیڑیوں کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے گا تب وہ اپنے فرائض زیادہ بہتر انداز میں انجام دے سکتا ہے۔ شروع میں بجلی پیدا کرنے والے آلات پر خاصی لاگت آئے گی، لیکن طویل المیعاد طور پر ان کے فوائد زیادہ ہیں۔

فوجیوں کے لیے اختراعات

ادھر امریکا کی کارن فیلڈ یونیورسٹی میں ایسے آلات کی تیاری جاری ہے جنہیں فوجی پہن کر بجلی پیدا کر سکیں۔ مثلاً غلوں پہ پھنی جانے والی بریکس تا کہ فوجی مارچ کرنا یا بھاگنا، توان میں نصب آلات بجلی بنانے لگیں۔ دراصل آج کل کے فوجی ہر قسم کے برقی آلات

انسانی دل توانائی کا خزانہ ہے جس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو رہا ہے

معاشرے میں تضحیک کے طور پر استعمال ہونے والا لفظ

اوئے سنگھاڑے.....

ابن قادر

سنگھاڑا بڑھاپے میں یادداشت کی کمی کا عنصر کم کرتا ہے

سنگھاڑے ہمارے معاشرے میں مذاق اور تضحیک کے طور پر استعمال ہونے والا یہ لفظ جو ہم اکثر ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے بولتے ہیں پانی میں کچھڑ کے نیچے اگنے والا مخروطی شکل کا پھل ہے اور اپنی اس شکل کی وجہ سے ناپسندیدہ لفظ کے طور پر بولا جاتا ہے۔ اس پھل کو اردو میں سنگھاڑا اور انگریزی میں Water chestnut کہتے ہیں۔ سردیاں شروع ہوتے ہی منڈیوں اور بازار میں دکانوں پر گاہکوں کی نظر میں آنا شروع ہو جاتا ہے۔

ہیں۔ کچا سنگھاڑا ہلکا میٹھا اور خستہ ہوتا ہے جب کہ سنگھاڑا اور بھی زیادہ مزیدار اور ذائقہ دار ہوتا ہے۔ سنگھاڑے کا ذائقہ بالکل منفرد ہوتا ہے اور اس کے کھانے بھوک میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ کچھ ممالک میں سنگھاڑے سلاد کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ سنگھاڑے موجود کیلوریز دوسری سبزیوں والی سبزیوں کی نسبت کم ہیں تاہم اس میں موجود آئرن، پوٹاشیم، کیلشیم، زنک اور دیگر مقدار اس کے استعمال میں اضافہ کا باعث بنتی ہے۔ سنگھاڑے کے استعمال سے تھکاوٹ دور ہوتی اور جسم میں کی ترسیل بہتر ہوتی ہے۔ زچگی کے بعد عورت کے سنگھاڑے کے آٹے کا استعمال مفید ثابت ہوتا ہے۔ سنگھاڑے کے آٹے کو گوندھ کر جسم کی سوچھی ہوئی جگہ پر کرنے سے تکلیف رفع ہوتی ہے۔ سنگھاڑے کے پانی سے بنایا ہوا سفوف کھانسی سے نجات دلاتا ہے۔ پانی میں کر پینے سے قبض کی شکایت دور ہوتی ہے۔ معدے، انتڑیوں کے زخم کے لیے مقوی ہے۔ سنگھاڑے کے سبز سے بڑھاپے میں یادداشت کم ہونے کے امکانات گھٹ جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی چیز کا حد سے



سنگھاڑا پودے کی جڑوں میں اگتا ہے (آلو کی فصل کی طرح) اس کی سبز رنگ کی ٹہنیوں پر پتے نہیں اگتے اور یہ ٹہنیاں ۵۰-۶۰ سینٹی میٹر اونچائی تک جاتی ہیں۔ اس کے اندر کا گودا سفید رنگ کا ہوتا ہے جسے عام طور پر کچا یا ابال کر کھایا جاتا ہے اور پیس کر آٹا بنا کر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چائیز کھانوں میں سنگھاڑا کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں کاربوہائیڈریٹس بہت زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں، پروٹین، وٹامن بی، پوٹاشیم اور کاپر بھی کافی مقدار میں ہوتے

استعمال مضر صحت ہوتا ہے اس لیے سنگھاڑے کا بھی مناسب استعمال کیا جانا چاہیے۔ سنگھاڑے کے زیادہ استعمال سے گردے اور پتے میں پتھری بننے کے خدشات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کمزور مردوں کو سنگھاڑے کھانے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور یہ خواتین کے ماہانہ نظام کے لیے بھی مفید ہے۔ سنگھاڑے کے سفوف میں دودھ یا دہی ملا کر استعمال کرنے سے چیپش سے آرام آتا ہے۔ ان کے استعمال سے دانت چمکدار اور مسوڑھے صحت مند ہوتے ہیں۔

سنگھاڑا

انسانی نروس سسٹم کو برباد کرنے والے

کیمیائی ہتھیار

تکلیف دہ، بھیانک اور عبرت ناک موت سے دوچار کرنے والے انسانیت سوز ہتھیار

دو

جدید میں ایسے ایسے بھیانک کیمیائی ہتھیار تخلیق کیے جا چکے ہیں جن کا استعمال کسی بھی جنگ، فوجی آپریشن یا دہشت گردوں کے خاتمہ کے لیے کی جانے والی کسی بھی کارروائی کا نہ صرف پانسہ پلٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ دشمن کو انتہائی تکلیف دہ اور بھیانک، عبرت ناک موت سے بھی دوچار کرتے ہیں۔ کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کو جواز بنا کر کئی ممالک کے خلاف نہ صرف جنگی کارروائی کی گئی بلکہ اب بھی کچھ ممالک پر بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے کیمیائی ہتھیاروں کا ذخیرہ رکھنے کا الزام لگا کر امن کے نام نہاد ٹھیکیداران ممالک جارحیت کے لیے برتول رہے ہیں۔ یعنی کیمیائی و حیاتیاتی ہتھیاروں کو عملی جنگ و جنگی آپریشن میں استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ پروپیگنڈا کے طور پر بھی بطور ایک انتہائی مؤثر ہتھیار بخوبی استعمال کیا گیا

ہے۔ پاکستان آرمی پر بھی اکبر نئی کی ہلاکت کے دوران ہونے والے آپریشن میں کیمیائی ہتھیار استعمال کرنے کا الزام تو اتر سے لگایا گیا۔ جس کی تردید پاکستان کی مسلح افواج نے ہمیشہ کی۔ کیمیائی ہتھیاروں کا عملی استعمال بھی ہوا۔ اسے مختلف ممالک اور ان کی افواج کو بدنام کرنے کے لیے اور اُن کے خلاف جنگ و پابندیاں لگانے کے لیے ایک جواز پیدا کرنے کے لیے بھی اکثر استعمال کیا گیا۔ چند بڑے بڑے اور بدنام زمانہ کیمیائی ہتھیاروں کا ذکر کیا جائے تو سب سے پہلے انسانی دماغ پر اثر کرنے والے کیمیائی ہتھیاروں کا ذکر اہمیت کا حامل ہے۔ انسانی دماغ کی پورے جسم میں ایک خاص اہمیت ہے۔ دوران جنگ انسان کے سوچنے، سمجھنے، فیصلہ کرنے اور کوئی بھی عمل کرنے کی صلاحیت کا دار و مدار اُس کے دماغ پر ہوتا ہے۔ سیرین، سومان، سائیکلو سیرین اور تابون یہ ایسے کیمیائی ہتھیار ہیں جو انسان کے ”نروس سسٹم“ کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔

دس کم آمیز، بیش آموز مختصر تحریریں

جن کے لکھنے والوں کے نام معلوم نہیں

انتخاب: شبیر اظہر

کوزے میں - ریا

مکافات

ایک لڑکا اپنے باپ کے ہمراہ پہاڑوں کے درمیان ٹھہرا ہوا تھا۔ اچانک وہ لڑکا اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ اسے چوٹ لگی تو بے ساختہ اُس کے حلق سے چیخ نکلی۔ ”آہ..... آہ..... آہ!“



پہاڑوں کے درمیان کسی جگہ یہی آواز دوبارہ سنائی دی۔ ”آہ..... آہ..... آہ!“

تجسس سے وہ چیخ پڑا ”تم کون ہو؟“

اسے جواب میں وہی آواز سنائی دی ”تم کون ہو؟“

اس جواب پر اُسے غصہ آگیا اور وہ چیختے ہوئے بولا، ”بزدل!“

اُسے جواب ملا ”بزدل!“

جب لڑکے نے اپنے باپ کی طرف دیکھا اور پوچھا

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“

میں نے اپنے نانا سے کیا سیکھا

کراچی سے پروفیسر محمد ظریف کی زندگی کی آخری

اپنے دادا کو میں نے کیا اُن کے اپنے بچنے سے نہیں دیکھا تھا۔ میرے دادا کا انتقال صرف ۳۹ سال میں ہوا۔ ان کی رحلت کے ۶ ماہ بعد میرے والد صاحب خان کی ولادت ہوئی۔ گویا ابا جی پیدا ہونے سے پہلے ہی ہاں!..... مرحوم نانا کو خوب خوب دیکھا جنھوں نے ۱۹۷۶ء کو پورے ایک سو برس کی عمر پا کر انتقال کیا۔ ہماری ملاقات ۱۴/۲ برس بعد ۲۰۱۵ء میں کے لیے پاتی کیوں کہ وہ کوہاٹ (صوبہ خیبر پختونخواہ) میں رہتے تھے اور ہم کراچی میں۔ قیام پاکستان کے بعد میرے نانا جان پر پیغمبری وقت آن پڑا۔ ان کی جملہ جائیداد اور سرمایہ ایک کاروباری شریک کی بددیانتی کی نذر ہو گیا مگر نانا نے کمال ضبط اور صبر و قناعت سے کام لیا اور فٹ پاتھ پر بیٹھ کر سرمہ فروشی کرنے لگے لیکن کسی پر اپنے ”پیٹ کے راز“ اور ”اوپر شیر وانی“ اندر پریشانی کا اظہار نہ کیا۔ میں نے بھی صبر و برداشت اپنے نانا سے ہی سیکھا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں وہ مستقل طور پر کراچی آ گئے لیکن اُس وقت وہ ۹۵ سالہ ضعیف و نابینا شخص تھے البتہ ان کی حس مزاج قائم تھی۔ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران کراچی کے کچھ علاقوں میں بھی بھارتی سوراوؤں کے جنگی جہازوں نے بمباری کی۔ دھماکوں کی آوازیں کرنا نا مرحوم آواز لگاتے۔

اے اللہ.....! ہم تو تیرے ہیں۔ مرنے کو اور بہترے ہیں۔“ وہ کہا کرتے تھے کہ اولاد کی اولاد اور نواسوں پوتوں کی اولادوں کو پروان چڑھتا دیکھ کر مجھے زندگی سے مزید پیار ہو گیا ہے۔ زندگی سے پیار بھی میں نے انھیں سے سیکھا ہے۔ اب میں نانا بھی ہوں اور دادا بھی۔ میری ایک نواسی اور ایک پوتی ہے۔ میرا پروردگار مجھے صحت و توانائی کے ساتھ کم از کم اتنی عمر تو عطا فرما دے کہ میں اپنے گلشن کو پھلتا پھولتا دیکھ سکوں۔ آمین

دوسرے نمبر پر جلد کو جلا دینے والے کیمیائی ہتھیار ہیں۔ ”بلسٹرنگ ایجنٹ (Blustering Agent)“ نامی یہ کیمیائی ہتھیار جن میں ”مسٹر ڈگیس“ شامل ہے۔ مخالف افواج کو جلا کر جسم کر دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسرائیل نے مصری افواج کے خلاف ہونے والی دونوں بڑی جنگوں میں ان بھیا تک کیمیائی ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا۔ کیمیائی ہتھیاروں کی ایک اور بھیا تک قسم سانس روک کر انتہائی دردناک موت سے دوچار کرنے والے کیمیکلز کلورین اور فاسجین وغیرہ شامل ہیں۔ ان کیمیائی ہتھیاروں کا شکار بننے والے کی سانس کی نالی بند ہو جاتی ہے اور دم گھٹنے سے وہ انتہائی بھیا تک موت کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے کیمیائی ہتھیار بھی ہیں جن کے شکار افراد پر ایسے اثرات مرتب ہوتے ہیں جیسے لقوے/ فالج کا شکار ہو گئے ہوں۔ اچھا خاصا تندرست انسان ان ہتھیاروں کے اثر کی وجہ سے کوئی بھی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسے کیمیائی ہتھیاروں کو دہشت گردوں پر قابو پانے کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ایک کیمیائی ہتھیار ایسا بھی ہے جس کا شکار انسان اُلٹیاں (Vomiting) کر کے نڈھال، بے حال اور اگر طبی امداد نہ ملے تو موت سے بھی دوچار ہو سکتا ہے۔

آخر میں ذکر ہو جائے ایسے کیمیائی ہتھیار کا جس کا استعمال اکثر و بیشتر احتجاجی جلسوں کو منتشر کرنے کے لیے اپنے ہی عوام اور ہم وطنوں کے خلاف کیا جاتا ہے۔ وہ کیمیائی ہتھیار ہے ”آنسو گیس“۔ اس کے استعمال سے متاثرہ شخص اور جلسوں جو قابو سے باہر ہو گیا ہو قابو میں کیا جاتا ہے۔

جیسے جیسے کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ سائنسدان اُن کا توڑ نکالنے کے ساتھ ساتھ پہلے سے زیادہ بھیا تک اور موثر کیمیائی ہتھیار بنانے میں دن رات مصروف و مگن ہیں۔ اب روایتی جنگ میں کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال ایک ایسا موثر ہتھیار ہے جو مخالف / دشمن کو سنبھلنے کا کوئی موقع نہیں دیتا۔ ایسے ایسے جدید کیمیائی ہتھیار تیار کیے جا چکے ہیں جن کا استعمال انسانیت کے لیے بہت ہی تکلیف دہ اور بھیا تک موت کی صورت میں ہی نکلتا ہے۔

کوہ پیما
ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے والی پہلی شخصیت
سرایڈ منڈ بلیری کی تھی۔ ۲۹۰۰۰ فٹ کی یہ بلند ترین
پہاڑی چوٹی انھوں نے ۲۹ مئی ۱۹۵۳ء کو سر کی تھی۔ اس
کارنامے پر انھیں ”سر“ کا خطاب دیا گیا تھا اور اسی کی

کہا ”کیا تمہیں ہماری آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں؟“

تب اُس مینڈک نے بتایا کہ وہ بہرا ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ وہ سب کے سب اس دوران میں اُس کی ہمت افزائی کر رہے تھے تاکہ وہ زندہ باہر نکل آئے۔

دعا

سمندر میں طوفان کے دوران ایک بحری جہاز تباہ ہو گیا اور صرف ۲ افراد ڈوبنے سے بچ رہے، جو تیرتے ہوئے ایک چھوٹے سے صحرائی جزیرے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ زندہ بچ جانے والے دونوں افراد سوچ



مینڈک

مینڈکوں کا ایک غول جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ اُن میں سے ۲ مینڈک ایک گہرے گڑھے میں گر گئے۔ باقی تمام مینڈک گڑھے کے اطراف میں جمع ہو گئے۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ گڑھا بے حد گہرا ہے تو گڑھے میں گرے دونوں مینڈکوں سے کہا کہ وہ اب خود کو مردہ سمجھیں اور زندہ رہنے کی کوئی امید نہ رکھیں۔ دونوں مینڈکوں نے اُن کی یہ نصیحت نظر انداز کر دی اور گڑھے سے نکلنے کے لیے چھلانگیں مارنی شروع کر دیں۔ باقی تمام مینڈک اُنھیں مسلسل یہی کہتے رہے کہ وہ اپنی توانائی ضائع نہ کریں اور خود کو مردہ سمجھ لیں۔

بالآخر ۲ میں سے ایک مینڈک نے بقیہ مینڈکوں کی بات پر دھیان دیتے ہوئے اپنی کوشش ترک کر دی اور ہمت ہار بیٹھا۔ پھر وہ نیچے گر پڑا اور مر گیا۔

دوسرے مینڈک نے اپنی چھلانگیں جاری رکھیں۔ وہ جتنا ممکن ہو سکتا تھا، اونچی چھلانگ لگا رہا تھا۔ مینڈکوں کے غول نے ایک بار پھر چیخ کے اُس سے کہا کہ وہ یہ تکلیف برداشت نہ کرے اور چپ چاپ مر جائے۔ لیکن دوسرے مینڈک نے مزید شدت سے چھلانگیں لگانی شروع کر دیں اور بالآخر وہ گڑھے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب وہ باہر آ گیا تو دوسرے مینڈکوں نے اُس سے

عقاب

ایک مرتبہ ایک کسان کو ایک عقاب کا دیرینہ دشمن دیکھائی دیا جس میں ایک انڈا موجود تھا جو تازہ لگتا کیونکہ وہ ہنوز گرم محسوس ہو رہا تھا۔

کسان انڈا نکال کر اپنے فارم پر لے آیا اور اپنی مرغیوں میں سے ایک کے ڈربے میں رکھ دیا۔ اُس انڈے کو سینے لگی۔ چند روز بعد مرغی کے پیٹ کے ساتھ اُس انڈے میں سے عقاب کا بچہ بھی نکل



وہ بھی چوزوں کے ساتھ پروان چڑھنے لگا۔ دن بھر وہ چوزوں کے ہمراہ صحن میں دوڑتا پھرتا اور دانہ دنگا پھرتا رہتا تھا۔

اُس کی تمام زندگی اُسی صحن میں گزر گئی اور وہ شاذ و نادر ہی منہ اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھتا تھا۔

جب وہ بے حد بوڑھا ہو گیا تو ایک دن اُس نے اپنا سراو پر کی جانب اٹھالیا، تب اُسے ایک حیرت انگیز منظر دیکھنے کو ملا۔ اوپر بلند آسمان پر ایک عقاب موپرواز تھا۔

اُس عقاب کو شان بے نیازی سے پرواز کرتے دیکھ کر اُس بوڑھے عقاب نے حسرت سے ایک آہ بھری اور خود سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”کاش میں بھی ایک عقاب پیدا ہوا ہوتا!“



بدولت اُنھوں نے امریکن ایکسپریس کارڈ کے اشتہارات میں کام کیا تھا۔

اپنی اس کامیابی کے حوالے سے اُنھوں نے اپنی کتاب ”ہائی ایڈونچر“ میں ایک واقعہ تحریر کیا ہے۔

۱۹۵۲ء میں اُنھوں نے بلند ترین چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن ناکام رہے تھے۔ اُس کے چند ہفتوں بعد انگلینڈ کے ایک گروپ نے اُنھیں اپنے ارکان سے خطاب کرنے کی دعوت دی۔

بھرپور تالیوں کی گونج میں ایڈمنڈ ہلیری سٹیج پر پہنچے۔ تماشاویوں کی نگاہ میں اُن کی یہ کوشش ایک عظیم کارنامہ تھی اور وہ اُس کی داد دے رہے تھے، لیکن ایڈمنڈ ہلیری خود کو ایک ناکام مہم جو سمجھ رہے تھے۔

سٹیج پر پہنچ کر وہ مائیکروفون پر جانے کے بجائے سیدھے پلیٹ فارم کے گوشے میں چلے گئے جہاں ماؤنٹ ایورسٹ کی ایک بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے اپنی مٹھیاں بھیجتے ہوئے تصویر کی طرف دیکھا اور اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز سے مخاطب ہوئے ”ماؤنٹ ایورسٹ! تم نے پہلی مرتبہ میں مجھے شکست دے دی ہے لیکن اگلی بار میں تمہیں ہرا دوں گا کیونکہ تمہیں جتنا بڑھنا تھا، تم بڑھ چکے ہو..... لیکن میں اب بھی بڑھ رہا ہوں۔“

کرتے اکتا گیا تو اُس نے ایک بیوی کے لیے دعا مانگنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے روز جزیرے پر اُس کے حصے والے ساحل پر ایک عورت پانی پر تیرتی ہوئی آگئی۔ جزیرے کے دوسرے حصے میں اُسی طرح ویرانی رہی۔

جلد ہی پہلے شخص نے مکان، لباس اور مزید غذا کی دعائیں مانگیں۔ اُس کی دعائیں اگلے ہی دن قبول ہو گئیں اور جادوئی اثر کے مانند اُس کی مرادیں برآئیں۔ دوسرا شخص ان تمام نعمتوں سے محروم رہا۔ اُس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔

آخر کار پہلے شخص نے ایک بحری جہاز کے لیے دعا مانگی تاکہ وہ اور اُس کی بیوی جزیرے سے روانہ ہو سکیں۔ اگلے روز صبح اُس نے اپنے حصے کے ساحل پر ایک بحری جہاز لنگر انداز پایا۔ پہلا شخص اپنی بیوی کے ہمراہ بحری جہاز میں سوار ہو گیا اور اُس نے دوسرے شخص کو جزیرے پر چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس کے خیال کے مطابق دوسرا شخص خدا کی نعمتوں سے محروم رہا تھا جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ خدا کی کرم نوازی کا اہل قرار نہیں پایا تھا۔ اس لیے کہ اُس کی کوئی بھی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔

جب جہاز روانگی کے لیے تیار ہو گیا تو پہلے شخص کو غیب سے ایک آواز سنائی دی۔ ”تم اپنے ساتھی کو جزیرے پر کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو؟“

”یہ تمام نعمتیں میری اور تنہا میری ہیں، اس لیے کہ یہ میں ہوں جس کی تمام دعائیں قبول ہوئی ہیں، جن کی بدولت مجھے یہ سب کچھ عطا ہوا ہے۔“ پہلے شخص نے جواب دیا۔ ”اُس شخص کی دعائیں قبول نہیں ہوئیں، اس لیے یہ ان میں سے کسی بھی نعمت کا حق دار نہیں ہے۔“

”تم غلطی پر ہو!“ غیبی آواز میں تنبیہ تھی۔ ”اُس نے صرف ایک دعا مانگی تھی جسے قبولیت کا شرف عطا ہو گیا تھا۔ اگر وہ دعا قبول نہ ہوتی تو تمہیں کوئی ایک نعمت بھی میسر نہ آتی۔“

”کیا مجھے معلوم ہو سکتا ہے کہ اُس نے کیا دعا مانگی“

تھی جس کی وجہ سے میں ان تمام نعمتوں کے لیے اسے مرہون منت ہو گیا ہوں؟“

”اُس نے دعا مانگی تھی کہ تمہاری تمام دعائیں قبول ہو جائیں۔“

ایک چھوٹا سا لڑکا غصے کا بہت تیز تھا۔ اُس کے باپ نے ایک دن اُسے میخوں کا ڈبا اور ہتھوڑی دیتے ہوئے کہا کہ جب بھی اُسے غصہ آئے تو وہ اس ڈبے میں سے ایک میخ نکال کر عقبی احاطے کی لکڑی سے بنی دیوار میں



گاڑ دے۔

پہلے دن لڑکے نے دیوار میں ۳۷ میخیں گاڑ دیں۔ پھر دھیرے دھیرے اُن کی تعداد گھٹنے لگی۔ اُسے احساس ہوا کہ ان میخوں کو دیوار میں ٹھونکنے کے مقابلے میں اپنے غصے پر قابو پانا زیادہ آسان ہے۔

بالآخر وہ دن بھی آگیا جب لڑکے کو قطعی غصہ نہ آیا۔ اُس نے اس بارے میں اپنے باپ کو آگاہ کیا۔ تب اُس کے باپ نے اُس سے کہا کہ اب وہ روزانہ احاطے کی دیوار میں سے ایک کیل اُس وقت نکال لیا کرے جب اُسے پورے دن قطعی غصہ نہ آئے اور وہ اپنے غصے پر قابو پائے رہے۔

دن گزرتے رہے اور آخر کار وہ لڑکا اپنے باپ کو یہ بتانے کے قابل ہو گیا کہ وہ تمام کیلیں نکال چکا ہے۔

باپ نے اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑا اور اُسے احاطے کے پاس لے گیا۔ پھر لکڑی کی دیوار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا ”تم نے بہت عمدگی کا مظاہرہ کیا ہے، مگر بیٹے! لیکن اس دیوار کے سوراخ پر غور سے دیکھو۔ اب یہ دیوار پہلے جیسی نہیں ہو سکتی۔ جب تم غصے میں کوئی بات کہتے ہو تو وہ اس طرح کا زخم چھوڑ دیتی ہے۔ تم کسی آدمی کو چاقو گھونب کر باہر کھینچ سکتے ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کتنی بار یہ کہتے ہو ”مجھے انہوں سے۔“ اس لیے کہ معذرت کرنے کے باوجود زخم تو اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ زبان کا گھاؤ اتنا ہی برا ہوتا ہے جتنا جسمانی گھاؤ!“

احساس
یہ اس دور کی بات ہے جب نیپولین نے روس پر حملہ کیا تھا۔ اُس کے فوجی دستے ایک اور چھوٹے سے قصبے



میں جنگ میں مصروف تھے۔ اتفاق سے نیپولین اپنے آدمیوں سے بچھڑ گیا۔

کاسک فوج کے ایک دستے نے نیپولین کو پہچان لیا اور شہر کی پُرتیج گلیوں میں اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ نیپولین اپنی جان بچانے کے لیے دوڑتا ہوا ایک بغلی گلی میں واقع ایک سمور فروش کی دکان میں جا گھسا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ دکان میں داخل ہونے کے بعد جوں ہی اُس کی نگاہ سمور فروش پر پڑی وہ بے چارگی سے کراہتے

ہوئے بولا ”مجھے بچالو! مجھے بچالو! مجھے کہیں چھپا دو۔“ سمور فروش بولا ”جلدی کرو! اُس گوشے میں سمور کے ڈھیر کے اندر چھپ جاؤ!“

پھر اُس نے نیپولین کے اوپر اور بہت سے سمور ڈال دیے۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کاسک فوجی دستہ دندناتا ہوا اُس کی دکان میں آگھسا اور فوجی چیخنے لگے

”وہ کہاں ہے؟“

”ہم نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھا ہے؟“

سمور فروش کے احتجاج کے باوجود اُن فوجیوں نے سمور فروش کی دکان الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ نیپولین کی تلاش میں اُنھوں نے دکان کا چپا چپا چھان مارا۔ وہ اپنی تلواروں کی نوکیں سمور کے ڈھیر میں گھساتے رہے لیکن نیپولین کو تلاش نہ کر پائے۔ بالآخر اُنھوں نے اپنی کوشش ترک کر دی اور واپس چلے گئے۔

کچھ دیر بعد جب سکون ہو گیا تو نیپولین سمور کے ڈھیر میں سے ریگتا ہوا باہر نکل آیا۔ اُسے کسی قسم کا کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔ عین اُسی لمحے نیپولین کے ذاتی محافظ بھی اُسے تلاش کرتے ہوئے وہاں آن پہنچے اور دکان میں داخل ہو گئے۔

سمور فروش کو جب اندازہ ہو گیا کہ اُس نے کس عظیم شخصیت کو پناہ دی تھی تو وہ نیپولین کی جانب گھوم گیا اور شرمیلے لہجے میں گویا ہوا ”میں اتنے عظیم آدمی سے یہ سوال پوچھنے پر معذرت چاہوں گا! لیکن سمور کے اس ڈھیر کے نیچے جب آپ کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگلا لمحہ یقینی طور پر آپ کی زندگی کا آخری لمحہ بھی ہو سکتا تھا تو آپ کو کیا محسوس ہوا تھا؟“

نیپولین جواب پوری آن بان کے ساتھ تن کر کھڑا ہو چکا تھا، سمور فروش کے اس سوال پر غصے میں آگیا اور برہمی سے بولا ”تمہیں مجھ سے، بادشاہ نیپولین سے، یہ سوال کرنے کی ہمت کیوں کر ہوئی؟“ پھر وہ اپنے محافظوں سے مخاطب ہوا ”محافظو! اس گستاخ شخص کو باہر

لے جاؤ۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو اور اسے گولی مار دو! میں بذاتِ خود اس پر فائر کھولنے کا حکم دوں گا۔“

محافظوں نے اُس بے چارے سمور فروش کو دبوچ لیا اور اُسے گھسیٹے ہوئے باہر لے گئے۔ پھر اُسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔

سمور فروش کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، البتہ اُس کے کانوں میں محافظوں کے حرکت کرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں جو دھیرے دھیرے ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنی رائفلیں تیار کر رہے تھے۔ ساتھ ہی اُسے سرد ہوا کے جھونکوں اور کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

ہوا کے تھپڑے اُس کے لباس سے ٹکرا رہے تھے اور اُس کے گال بچ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور وہ اُن پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

تب اُس کے کانوں میں نیولین کی آواز سنائی دی جس نے کھنکراتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور آہستگی سے بولا ”ہوشیار..... بشت باندھ لو۔“

اُس لمحے میں یہ جانتے ہوئے کہ اُس کے تمام احساسات و جذبات اُس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہیں، سمور فروش کے اندر ایک ایسا احساس نمود پزیر ہونے لگا، جسے بیان کرنے سے وہ قاصر تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔

اُسے قدموں کی چاپ سنائی دی جو اُس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب وہ آواز اُس کے عین نزدیک آگئی تو کسی نے ایک جھٹکے سے اُس کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھول دی۔

اچانک روشنی ہونے سے سمور فروش کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں، تب اُس نے نیولین کو دیکھا جو اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُس کے مقابل کھڑا تھا۔

اُس نے نیولین کے لب واہوتے دیکھے۔ وہ نرم لہجے میں بول رہا تھا ”اب تمہیں پتا چل گیا؟“

معذوری

چند سال قبل سیتل اسپتال اولپکس کے موقع پر... اور اُس کی دوڑ کے لیے مقابلے میں حصہ لینے والے ۹ کھلاڑی خط آغاز پر کھڑے تھے۔ وہ سب کے سب ذہنی یا جسمانی طور پر معذور تھے۔

فائر ہوتے ہی وہ سب کے سب حرکت کرنے لگے۔ وہ حقیقت میں دوڑ نہیں رہے تھے، البتہ دوڑنے کی پوری



سعی کر رہے تھے تاکہ خط اختتام تک پہنچ کر جیت جائیں۔ اُن میں ایک چھوٹا لڑکا بھی تھا جو چند قدم دوڑنے کے بعد لڑکھڑا گیا، پھر سنبھل کر کھڑا ہوا اور مزید چند قدم اٹھانے کے بعد گر پڑا، پھر اُس نے رونا شروع کر دیا۔

باقی آٹھ حصہ لینے والے، جو اُس لڑکے سے آگے نکل چکے تھے۔ اُس کے رونے کی آواز سن کر رک گئے اور پلٹ کر دیکھنے لگے۔ پھر وہ سب کے سب واپس آگئے اور اُس لڑکے کی جانب چل دیے۔

وہ تمام کے تمام اُس کے قریب پہنچ گئے۔ اُن میں سے ایک لڑکی، جو ”ڈاؤن سنڈروم“ کے مرض میں مبتلا تھی، اُس لڑکے پر جھکی اور اُسے پیار کرتے ہوئے بولی ”کوئی بات نہیں، تم اچھے ہو جاؤ گے۔“

پھر اُن تمام ۹ حصہ لینے والوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے اور ایک ساتھ چلتے ہوئے خط اختتام

تک پہنچ گئے۔ سب اسٹیڈیم میں موجود ہر فرد اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور پورا مجمع کئی منٹ تک تالیاں بجاتا رہا۔

نہ جانے کیوں لوگ انہیں ”ذہنی طور پر معذور“ کہتے تھے۔

یقین

ایک بیمار شخص اپنا معائنہ کرانے کے لیے اپنے ڈاکٹر کے پاس گیا۔ رخصت ہوتے وقت وہ ڈاکٹر کی جانب پلٹا اور بولا ”ڈاکٹر! مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا ہے، مجھے



بتائیں کہ دوسری جانب کیا ہے؟“

ڈاکٹر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا ”مجھے معلوم نہیں۔“

”آپ کو معلوم نہیں؟ آپ ایک دین دار آدمی ہیں۔ اور آپ کو معلوم نہیں کہ دوسری جانب کیا ہے؟“

ڈاکٹر یہ سن کر اپنی کرسی پر سے اٹھا اور اپنے کمرے کے عقبی بند دروازے کا ہینڈل تھام کر کھڑا ہو گیا۔ اُس دروازے کے پیچھے سے بیخبر مارنے اور غرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جوں ہی ڈاکٹر نے ہینڈل گھماتے ہوئے دروازہ کھولا، ایک کتا اچھل کر کمرے کے اندر آ گیا اور ڈاکٹر کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ وہ خوشی کا بحر پورا اظہار کر رہا تھا۔

ڈاکٹر مریض کی جانب گھوما اور بولا ”تم نے اس کتے کو غور سے دیکھا؟ یہ اس سے پہلے اس کمرے میں کبھی نہیں آیا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کمرے کے اندر کیا ہے۔ اسے اس کے علاوہ اور کچھ پتا نہیں تھا کہ اُس کا آقا یہاں موجود ہے۔ جب کمرے کا دروازہ کھلا تو اس نے بلا خوف و خطر اندر چھلانگ لگا دی۔

مجھے اس بارے میں بہت ہی کم علم ہے کہ موت کے دوسری جانب کیا ہے، لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ وہاں میرا آقا موجود ہے۔ اور میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ جب دروازہ کھلے گا تو میں بلا خوف و خطر خوشی اُس میں سے گزر جاؤں گا۔

ناکام سروے

حال ہی میں ایک عالمی سروے کیا گیا۔ پوچھا جانے والا واحد سوال یہ تھا ”کیا براہ مہربانی آپ بانی دنیا میں غذا کی قلت کے حل سے متعلق اپنی ایمان دارانہ رائے عنایت کرنا پسند فرمائیں گے؟“

سروے متوقع طور پر بری طرح ناکام رہا۔

کیوں کہ

افریقائیوں کو معلوم نہیں تھا کہ ”غذا“ سے کیا مراد ہے۔

مشرقی یورپ والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ”ایمان داری“ سے کیا مراد ہے۔

مغربی یورپ والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ”قلت“ سے کیا مراد ہے۔

چینیوں کو معلوم نہیں تھا کہ ”رائے“ سے کیا مراد ہے۔

مشرقی وسطی والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ”حل“ سے کیا مراد ہے۔

جنوبی امریکا والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ”براہ مہربانی“ سے کیا مراد ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ”باقی دنیا“ سے کیا مراد ہے۔

شہروں کے نام کیسے پڑے

اپنے وطن سے محبت ہو تو اس کے شہروں سے محبت ہونا فطری بات ہے۔ پاکستان کے سارے شہر ہمارے لیے اتنے ہی پیارے اور محترم ہیں جتنا کہ ہمیں اپنا شہر۔ ان شہروں کے نام کیسے رکھے گئے۔ اس حوالے سے رانا محمد شاہد کا معلوماتی مضمون پیش خدمت ہے۔



اسلام آباد

۱۹۵۹ء میں مرکزی دارالحکومت کا علاقہ قرار پایا۔ اس کا نام مسلمانان پاکستان کے مذہب اسلام کے نام پر اسلام آباد رکھا گیا۔



راولپنڈی

یہ شہر راول قوم کا گھر تھا۔ چودھری جھنڈے خان راول نے پندرہویں صدی میں باقاعدہ اس کی بنیاد رکھی۔



کراچی

تقریباً ۲۲۰ سال پہلے یہ ماہی گیروں کی بستی تھی۔ کلاچو نامی بلوچ کے نام پر اس کا نام کلاچی پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ کراچی بن گیا۔ ۱۹۲۵ء میں اسے شہر حیثیت دی گئی۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۹ء تک یہ پاکستان دارالحکومت رہا۔



حیدر آباد

اس کا پرانا نام نیرون کوٹ تھا۔ کلہوڑوں نے اسے حضرت علیؑ کے نام سے منسوب کر کے اس کا نام حیدر آباد رکھ دیا۔ اس کی بنیاد غلام کلہوڑا نے ۱۷۶۸ء میں رکھی۔ ۱۸۴۳ء میں انگریزوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اسے ۱۹۳۵ء میں ضلع کا درجہ ملا۔



بہاولپور

نواب بہاول خان کا آباد کردہ شہر جو انہی کے نام پر بہاولپور کہلایا۔ مدت تک یہ ریاست بہاولپور کا صدر مقام رہا۔ پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے والی یہ پہلی رہاست تھی۔ ون یونٹ کے قیام تک یہاں عباسی خاندان کی حکومت تھی۔



ملتان

کہا جاتا ہے کہ اس شہر کی تاریخ ۴ ہزار سال قدیم ہے۔ البیرونی کے مطابق اسے ہزاروں سال پہلے آخری کرت سگیا کے زمانے میں آباد کیا گیا۔ اس کا ابتدائی نام ”کیسا پور“ بتایا جاتا ہے۔



فیصل آباد

اسے ایک انگریز سرجمو لائل (گورنر پنجاب) نے آباد کیا۔ اُس کے نام پر اس شہر کا نام لائل پور تھا۔



پشاور

پشاور لوگوں کی نسبت سے اس کا نام پشاور پڑ گیا۔ ایک اور روایت کے مطابق محمود غزنوی نے اسے یہ نام دیا۔



کوئٹہ

لفظ کوئٹہ، کوٹا سے بنا ہے۔ جس کے معنی قلعے کے ہیں۔ بگڑتے بگڑتے یہ کوٹا سے کوئٹہ بن گیا۔



سرگودھا

یہ سر اور گودھا سے مل کر بنا ہے۔ ہندی میں سر، تالاب کو کہتے ہیں، گودھا ایک فقیر کا نام تھا جو تالاب کے کنارے رہتا تھا۔ اسی لیے اس کا نام گودھے والا سر بن گیا۔ بعد میں سرگودھا کہلایا۔ ۱۹۰۳ء میں باقاعدہ آباد ہوا۔

بعد ازاں عظیم سعودی فرماں روا شاہ فیصل شہید کے نام سے موسوم کر دیا گیا۔



رحیم یار خاں

بہاولپور کے عباسیہ خاندان کے ایک فرد نواب رحیم یار خاں عباسی کے نام پر یہ شہر آباد کیا گیا۔



ساہیوال

یہ شہر ساسی قوم کا مسکن تھا۔ اسی لیے ساہی وال کہلایا۔ انگریز دور میں پنجاب کے انگریز گورنر منٹگمری کے نام پر ”منٹگمری“ کہلایا۔ نومبر ۱۹۶۶ء صدر ایوب خاں نے عوام کے مطالبے پر اس شہر کا پرانا نام یعنی ساہیوال بحال کر دیا۔



سیالکوٹ

۲۵ ہزار قبل مسیح میں راجہ سکوت نے اس شہر کی بنیاد

رکھی۔ برطانوی عہد میں اس کا نام سیالکوٹ رکھا گیا۔



گوجرانوالہ

ایک جاٹ سانہی خاں نے اسے ۱۳۶۵ء میں آباد اور اس کا نام ”خان پور“ رکھا۔ بعد ازاں امرتسر سے آ کر یہاں آباد ہونے والے گوجروں نے اس کا نام بدل کر گوجرانوالہ رکھ دیا۔



شیخوپورہ

مغل حکمران نور الدین سلیم جہانگیر کے حوالے سے آباد کیا جانے والا شہر۔ اکبر اپنے چہیتے بیٹے کو پیار سے ”شیخو“ کہہ کر پکارتا تھا اور اسی کے نام سے شیخوپورہ کہلایا۔



ہٹہ

یہ دنیا کے قدیم ترین شہر کا اعزاز رکھنے والا شہر ہے۔ ہٹہ، ساہیوال سے ۱۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

موجودہ روز کا ہم عصر شہر ہے۔ جو ۵ ہزار سال پہلے آباد تھا۔ رگ وید کے قدیم متروں میں اس کا نام ”ہٹہ“ لکھا گیا ہے۔ زمانے کے چال نے اس کو ہٹہ بنا دیا۔



ٹیکسلا

”تھارہ تہذیب کا مرکز۔ اس کا شمار بھی دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ یہ راولپنڈی سے ۲۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۳۲۶ قبل مسیح میں یہاں سکندر اعظم کا قبضہ ہوا تھا۔



بہاول نگر

ماضی میں ریاست بہاولپور کا ایک ضلع تھا۔ نواب سر صادق محمد خاں عباسی خامس پنجم کے مورث اعلیٰ کے نام پر بہاول نگر نام رکھا گیا۔



منظفر گڑھ

وائس ملتان نواب مظفر خاں کا آباد کردہ شہر۔ ۱۸۸۰ء

تک اس کا نام ”خان گڑھ“ رہا۔ انگریز حکومت نے اسے مظفر گڑھ کا نام دیا۔



میانوالی

ایک صوفی بزرگ میاں علی کے نام سے موسوم شہر ”میانوالی“ سولہویں صدی میں آباد کیا گیا تھا۔



ڈیرہ غازی خان

پاکستان کا یہ شہر اس حوالے سے خصوصیت کا حامل ہے کہ اس کی سرحدیں چاروں صوبوں سے ملتی ہیں۔



جھنگ

یہ شہر کبھی چند جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ اس شہر کی ابتدا صدیوں پہلے راجا سر جاسیال نے رکھی تھی اور یوں یہ علاقہ ”جھنگی سیال“ کہلایا۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جھنگ سیال بن گیا اور پھر صرف جھنگ رہ گیا۔

کر رہا تھا۔ ان افراد کے دماغوں کی اسکیننگ کرتے ہوئے اس پر انکشاف ہوا کہ دو اندھے ایسے ہیں جو آوازیں سنیں تو ان کے دماغ میں ”بصری قشر“ (Visual Cortex) بھی سرگرمی دکھاتا ہے۔ یاد رہے، ہم جو کچھ دیکھتے ہیں، اسے ہمارے دماغوں میں بصری قشر کا علاقہ ہی پروسیس کرتا ہے۔ جب گوڈیل نے دونوں نابینا حضرات سے پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ وہ کام کاج کرتے ہوئے ایکولوشن سے مدد لیتے ہیں۔ گویا ثابت ہوا کہ وہ اندھے اپنے کانوں کے ذریعے ”دیکھ“ رہے تھے۔

سائنس کافی دان عرصہ پہلے ایکولوشن کے اصول جان چکے تھے۔ اسی لیے اسی فطری طریق کار کی بنیاد پر کام کرنے والے سونار (Sonar) آلات ایجاد ہوئے۔ سونار پہلے پانی کے اندر زور دار آواز پیدا کرتا ہے۔ پھر اشیاء سے ٹکرا کر واپس آنے والی صوتی لہریں ریکارڈ کی جاتی ہیں۔ ایک شیشے سے ٹکرا کر صدائے باگشت جتنی دیر میں واپس آئے، وہ سونار سے اتنی ہی دور ہوگی۔ تاہم بیشتر نابینا انسان آواز یا ایکولوشن کو بغیر چھڑی یا کتے کے بطور مددگار استعمال کرتے ہیں۔

ماہرین کے مطابق نابینا افراد فطری طور پر ایکولوشن کو استعمال نہیں کر سکتے، یہ طریق عمل انھیں بذریعہ مشق سیکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے استعمال کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں۔ تاہم ترقی یافتہ ممالک میں اسے اختیار کرنے والے نابینا مرد و زن کی تعداد بڑھنے لگی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں بھی اسے متعارف کرایا جائے۔ یوں غریب نابینا خواتین و حضرات کے لیے آسان ہو جائے گا کہ وہ روزمرہ سرگرمیاں زیادہ بہتر طور پر انجام دے سکیں۔

یوروفسکی جب بھی اپنے فارم کے ارد گرد سڑکوں پر سائیکل چلائے تو ماحول پر بھرپور توجہ دیتا ہے تب اس کا سر مسلسل آگے پیچھے ہلتا ہے۔

گھریلو باڑوں اور سڑک کنارے

بعض اوقات حادثات کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک بار وہ سڑک سے اتر کر شیب میں دو ایک درخت سے ٹکراتے ہوئے بجا ورنہ ٹھیک رہتا۔ تاہم برائن چھوٹی موٹی چوٹوں کی پروا نہیں کرتا، آخر وہ ایک سخت جان دیہاتی ہے اور.....

یوروفسکی دراصل ایک فطری طریقہ کار ”ایکولوشن“ (Echolocation) کا ماہر ہے۔ اس طریقے کے ذریعے بھاری آواز نکال کر اس کی صدائے بازگشت سے کسی شے کے مقام یا فاصلے کا تعین کرتے ہیں۔ چنانچہ سائیکل پر بڑے یوروفسکی مسلسل اپنی زبان کے ذریعے چھوٹی چھوٹی آوازیں نکالتا ہے۔ جب آوازوں کی بازگشت واپس آتی ہے تو وہ اس کی مدد سے اپنے دماغ میں ارد گرد کی تصویر بناتا ہے۔ چمگادڑ اور اندھی ڈولفن بھی اسی ایکولوشن کی مدد سے روزمرہ کام انجام دیتی ہیں۔

یوروفسکی کینیڈا کے شہر کیلی گرا کا باسی ہے۔ آج کل کی تحقیق کا حصہ ہے جس کے ذریعے انسانی ایکولوشن مطالعہ جاری ہے۔ اس تحقیقی منصوبے کا سربراہ گوڈیل ہے۔ گوڈیل نے یہ منصوبہ ۲۰۰۹ء میں شروع کیا۔ اسے انسانی ایکولوشن میں دلچسپی محسوس ہوئی۔

۲۰۰۹ء میں گوڈیل نابینا مرد و زن کی حسیات پر تحقیق

ترقی یافتہ ممالک میں ”ایکولوشن“ سکھائی جا رہی ہے

انسانی چمگادڑ

کیا نابینا افراد اپنے کانوں کے ذریعے ”دیکھتے“ ہیں؟

ایک سخت جان دیہاتی کی سچی لگن کا ماجرا

وہ اپنے سائیکل پر ”ایکولوشن“ (بازگشت سے جگہ کی تلاش کے قانون) کو مددگار بنائے سڑکوں پر کامیابی سے سائیکل چلاتا پھرتا ہے

چمگادڑ اور اندھی ڈولفن بھی اسی ”ایکولوشن“

کی مدد سے روزمرہ کام کرتی ہے



اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کے بجائے اپنے پر اٹھی انگلیوں سے جنگ کرنے والوں کا دیکھو

ہم سب؟

بدترین معاشرہ اور بدترین قوم بننے میں کس قدر کمی باقی ہے؟
ایک اہم سوال جو اپنے اندر سوالوں کا جہاں لیے ہے

جاوید چوہدری

کمر پر بلا تخصیص برساتا تھا، اس کا ایک مکالمہ ہمیں مشہور تھا، وہ یہ مکالمہ ہر ۵۰ منٹ بعد دہراتا تھا۔ وچ ماراں دا (کمر پر ڈنڈا ماروں گا)۔ استاد کے مطلب تھا اگر شاگرد اچھے نکل آئیں تو یہ استاد کی شہرت کا باعث بن جاتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں استاد اچھا ہے اس لیے یہ بھی اچھے نکل آئے یا اگر وہ تھے تو اس کے استاد کتنے اچھے ہوں گے اور اگر شاگرد نکل آئیں تو لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر ان کے استاد کو بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ استاد کا کہنا تھا

استاد کو بھول گیا ہوں، استاد کی پڑھائی ہوئی باتیں، ان کا یاد کرایا ہوا سبق اور کلاس میں بیٹھنے والے ساتھی بھی بھول گیا ہوں لیکن مجھے استاد کی ایک بات ابھی تک یاد ہے اور یہ شاید آخری سانس تک یاد رہے گی۔ استاد نے ایک بار کہا تھا ”استادوں کی اچھائی، بُرائی، لائق، نالائق اور عزت اور بدنامی کا فیصلہ شاگرد کرتے ہیں۔“ وہ تیسری جماعت کا دیہاتی استاد تھا، وہ دھوئی باندھ کر سکول آتا تھا، آگ کی چھڑی منگواتا تھا اور پوری کلاس کی

میں

منہ لاتی ہوں، منہ لاتی ہوں یا ایماندار ہوں اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے گا، آپ اچھے نکل آئے تو لوگ مجھے ایماندار کہیں گے اور اگر آپ لوگ بُرے نکل آئے تو لوگ مجھے منہ لاتی کہیں گے۔ استاد کی یہ بات ملیریے کے مریض کے لیے کوئین کی گولی ثابت ہوئی۔ یہ آج تک میرے ذہن میں نقش ہے۔ میں جب بھی غیر مسلموں سے ملتا ہوں، میں ان سے باہر جاتا ہوں یا کسی اوپن سوسائٹی میں اوپن لوگوں سے ملتا ہوں تو میں اپنا ملٹی کی حد تک اچھا ہونے کی اداکاری شروع کر دیتا ہوں، میں حد سے زیادہ عاجز ہو جاتا ہوں، یہ معمولی حد تک اپنے اوپر انکساری طاری کر لیتا ہوں، یہ ایمانداری کو ایک ایک پتلی تک لے آتا ہوں، کسی کو گھور کر نہیں دیکھتا اور تمام قانون اور قاعدے کو ”فالو“ کرتا ہوں، کیوں؟ صرف یہ سوچ کر کہ میں اگر اس غیر مسلم معاشرے میں تہذیب اور شائستگی کے خلاف کوئی حرکت کروں گا اور لوگوں کو جب یہ معلوم ہوگا میں مسلمان اور پاکستانی ہوں تو لوگوں کے ذہنوں میں اسلام اور پاکستان کی غلط تصویر بنے گی اور اس سے ہمارے ان استادوں کا امیج خراب ہوگا جنہوں نے اسلام اور پاکستان کی بنیاد رکھی تھی، میں محسوس کرتا ہوں میں نے اگر کسی گورے کے ساتھ غلط سلوک کیا، میں اس سے غیر شائستگی، بے ایمانی اور بدتہذیبی کے ساتھ پیش آیا، میں نے شراب پی، جو اکھیلا، میں کسی کلب میں چلا گیا یا میں کسی بداخلاقی میں مبتلا ہو گیا تو اس سے میرے وہ استاد بدنام ہوں گے جن پر اس وقت پوری دنیا نظریں گاڑ کر بیٹھی ہے چنانچہ میں ہمیشہ غیر مسلموں کے درمیان اچھا مسلمان بننے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں یہ کوشش اپنے ملک میں بھی کرتا ہوں، میں اپنے ارد گرد صفائی رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، منہ پر ٹشور رکھ کر چیخ مارتا ہوں، ناک صاف کرنے کے لیے ہاتھ روٹھ میں جاتا ہوں، استعمال کے بعد اپنا ٹوائلٹ صاف کرتا ہوں، گرمی ہو یا سردی ہو روز نہاتا ہوں، خوشبو لگاتا ہوں، دن میں دو بار کپڑے تبدیل کرتا ہوں، دو دو بار ٹوائلٹ بدلتا ہوں، دن میں تین بار دانت صاف کرتا

ہوں، جوتے پالش کر کے پہنتا ہوں، ۱۵ اردن بعد بال کٹواتا ہوں اور گھر سے وضو کر کے مسجد جاتا ہوں تاکہ میرے وضو کے چھینٹوں سے دوسروں کے کپڑے اور مسجد کا فرش خراب نہ ہو، کیوں؟ کیونکہ ہمارے رسول ﷺ نے صفائی کو نصف ایمان قرار دیا تھا لہذا میں صفائی کو اپنی ذمہ داری، اپنا فرض سمجھتا ہوں اگر میں گندا ہوں گا میں لوگوں کے سامنے ناک صاف کروں گا، منہ کھول کر جمائی لوں گا، دوسروں کے منہ پر چیخ ماروں گا یا اگر مجھ سے بو آئے گی تو اس سے اسلام کے استاد یعنی نبی اکرم ﷺ کے امیج کو زک پہنچے گی اور صاف ستھرا، مہذب اور شائستہ ہوں تو غیر مسلم کہیں گے اگر امتی اتنا اچھا ہے، یہ اتنا صاف ستھرا ہے تو ان کا رسول ﷺ کتنا شاندار ہوگا۔ میں ہمیشہ اپنے دوستوں سے بھی ایمانداری، درود، صبر، محنت، برداشت، حلیمی، درگزر، شائستگی اور خوش دلی کی درخواست کرتا ہوں۔ یہ جب اس کی وجہ پوچھتے ہیں تو میں ان سے عرض کرتا ہوں اس سے غیر مسلم ہمارے رسول ﷺ کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، یہ لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے اگر یہ لوگ اتنے اچھے ہیں تو ان کے رسول ﷺ، ان کے استاد کتنے اچھے ہوں گے اور یوں اسلام کی خوشبو پوری دنیا میں پھیلنے لگے گی۔

میں اس زاویے سے جب خود کو اور پھر اپنے معاشرے کو دیکھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے ہم میں سے اکثر اچھے شاگرد ثابت نہیں ہو رہے، ہمارے رسول ﷺ نے آہستہ بولنے، نظریں جھکا کر چلنے اور چال میں میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ آپ نے بازار میں کھڑے ہو کر کھانے، گالی دینے، لڑائی جھگڑا کرنے، دوسروں کی مذہبی روایات کا مذاق اڑانے، خواتین کو گھور کر دیکھنے، دوسروں کے بارے میں بغض اور حسد پالنے، دوسروں کے خلاف سازش کرنے اور دوسروں کو دھوکا دینے سے بھی منع فرمایا تھا لیکن سب روزانہ رسول ﷺ کے ان احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں دنیا میں سب سے زیادہ گالیاں دی جاتی ہیں، پنجابی زبان دنیا کی ایسی



اچھے رشتے صرف اچھے دوستوں کو بانٹنے کے لیے نہیں ہوتے

مثالی تعلقات کو زندہ رکھنے کے یہ ہیں 75 طریقے

صرف ان کے لیے جو اپنی زندگی کو مکمل اور خوب صورت بنانے کے خواہش مند ہیں

عصارہ چودھری

تعلقات کو زندہ رکھنے کے ۷۵ حوالے ہیں جو چیزوں کو تناظر میں رکھنے اور اپنے رشتوں کو مثبت سمت میں منتقل کرنے میں آپ کی مدد کریں گے:

۱۔ زندگی میں آپ محسوس کریں گے کہ جو لوگ آپ

سے ملتے ہیں ان کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ کچھ آپ کو آزمائیں گے کچھ آپ کو استعمال کریں گے اور کچھ آپ کو سبق دیں گے۔ لیکن سب سے اہم یہ ہے کہ کچھ لوگ آپ میں موجود بہترین انسان کو واضح کریں گے۔

۲۔ زندگی میں ان لوگوں کو شامل کریں جو آپ سے

145 | urdudigest.pk | 2013 - جنوری

خریدتے ہیں تو اس میں ملاوٹ بھی ہوتی ہے مقدار اور وزن بھی کم ہوتا ہے اور ایک بار قیمت کے بعد یہ چیز واپس بھی نہیں ہو سکتی ہم ایک بھکاری ہو چکے ہیں، ہمارے صدر اور وزیراعظم ہیں۔ جھوٹ اور وعدہ خلافی ہماری پوری قوم کی عادت چکی ہے۔ اکبری منڈی سے لے کر ایوان صدر تک وعدہ خلافی بھی کرتے ہیں، جھوٹ بھی بولتے ہیں دوسروں کو دھوکا بھی دیتے ہیں۔

میں بات کو زیادہ پھیلاتا نہیں چاہتا، آپ احادیث سیرت کی کوئی کتاب اٹھائیں، نبی اکرم ﷺ کے پرہیز اور اس کے بعد اپنے ضمیر سے سوال کریں کیا نبی اکرم ﷺ کے اقوال پر عمل کر رہے ہیں، کیا ہم ان احکامات مان رہے ہیں، کیا ہماری ذات میں کثرت نہیں، کیا ہم دنیا کی بدترین قوم اور بدترین معاشرہ نہیں ہو رہے، کیا ہم انسانیت کے شرف سے کئی منزل نیچے زندگی نہیں گزار رہے؟ اگر اس کا جواب ہاں ہے آپ اپنے آپ سے یہ دوسرا سوال بھی پوچھیے، ہمارے اس طرز عمل سے غیر مسلم ہمارے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے؟ کیا ہماری حرکتوں سے ہمارے رسول ﷺ کے امیج کو زک نہیں پہنچ رہی، کیا لوگ یہ نہیں سوچتے ہوں گے اگر مسلمان ایسے ہیں تو اسلام کیسا ہوا کیا غیر مسلم یہ نہیں کہتے ہوں گے اگر اسلام ان لوگوں کی زندگیوں میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکا تو ہم نام، ڈک، ہیری اسے کیوں مانیں۔ آپ ایک لمحے کے لیے سوچیں ہم اپنے نبی ﷺ کے احکامات کی خلاف ورزی کر رہے تو ہیں اور گستاخی کے مرتکب نہیں ہو رہے! کیا ہم پاکستانی مسلمان گستاخ نہیں ہیں کیونکہ لوگ اب ہماری وجہ سے ہمارے رسول ﷺ کی طرف انگلیاں اٹھا رہے ہیں اور ہم اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کے بجائے ان انگلیوں سے جنگ کر رہے ہیں۔ (انتخاب: مہرین شکت)

پانچویں زبان ہے جس میں ہزاروں کی تعداد میں گالیاں موجود ہیں اور اگر انھیں جمع کیا جائے تو یہ بڑی کتاب بن جائے۔ ہم میں سے ہر شخص حلق پھاڑ کر بولتا ہے، دنیا میں سب سے زیادہ ہارن اسی ملک میں بجائے جاتے ہیں، دنیا میں سب سے زیادہ جھگڑے اس ملک میں ہوتے ہیں، ہمارے ننانوے فیصد گھرانوں میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں، یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس میں ہمسایہ ہمسایے کا دشمن ہے اور دونوں مسلمان بھی ہیں۔ جس میں مسلمان، مسلمان سے مسجد کا قبضہ لینے کے لیے رائفلیں اور ڈنڈے لے کر مسجد پہنچ جاتا ہے، جس میں ہر شخص بھاگتا، دوڑتا دکھائی دیتا ہے، جس میں خواتین پر سر عام فقرے کسے جاتے ہیں اور جس میں ہر شخص دل میں دوسرے شخص کے بارے میں نفرت کا تنور جلا کر پھر رہا ہے ہمارے رسول ﷺ نے شراب، بدکاری، سود، خواتین اور بچوں پر تشدد سے منع فرمایا تھا لیکن پاکستان دنیا کے ان پانچ ممالک میں شمار ہوتا ہے جن میں بچوں پر تشدد اور خواتین کو اذیت دینے کے ہزاروں لاکھوں واقعات رپورٹ ہوتے ہیں، جس کی ساری معیشت سود پر استوار ہے، جس میں بدکاری پیشے کی شکل اختیار کر چکی ہے اور جس میں پابندی کے باوجود حکومتی اور سیاسی اداروں میں عام شراب پی جاتی ہے۔ ہمارے رسول ﷺ نے کم تولنے، کم ماپنے، ملاوٹ کرنے، بھیک مانگنے، جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی سے منع فرمایا تھا لیکن ہمارے اسلامی ملک میں کم ماپنا اور کم تولنا تجارت کا حصہ بن چکا ہے، پاکستان دنیا کے ان چند ممالک میں شمار ہوتا ہے جن میں دوائیں، دودھ اور خوراک تک میں ملاوٹ ہوتی ہے، حد تو یہ ہے اس ملک کے علمائے کرام بھی یورپ اور امریکا سے دوائیں منگوا کر کھاتے ہیں کیونکہ انھیں اپنے مسلمان بھائیوں کی دواؤں پر یقین نہیں ہوتا۔ ہم یہودی، عیسائی اور ہندو کی دکان سے چیز خریدتے ہیں تو اس کی کوالٹی اور مقدار بھی پوری ہوتی ہے، اس کی قیمت بھی کم ہوتی ہے اور آفٹر سیل گارنٹی بھی دی جاتی ہے جبکہ ہم جب مسلمان بھائیوں سے چیز

144 | urdudigest.pk | 2013 - جنوری

جی محبت کرتے ہیں، آپ کو ترغیب دیتے ہیں، آپ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، آپ کی دلکشی بڑھاتے ہیں اور آپ کو خوش کرتے ہیں۔ اگر آپ ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو ان میں سے کچھ بھی نہیں کرتے تو انہیں چھوڑ دیں۔

۳۔ محبت، جنسی کشش، خیالی ملاقاتوں پر جانے یا نمائش کا نام نہیں ہے۔ یہ کسی انسان کے ساتھ کا نام ہے جو آپ کو اس انداز میں خوش رکھتا ہے جیسے کوئی دوسرا نہیں رکھ سکتا۔

۴۔ بسا اوقات ہم مشعل ہونے، ایک مسکراہٹ، ایک شفیق لفظ، ایک سننے والے کان، ایک جی داد یا خیال کرنے کے نہایت چھوٹے سے فعل کی طاقت کو حقیر جانتے ہیں حالانکہ یہ سب زندگی کا رخ موڑنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

۵۔ سب سے خوبصورت بات یہ کہ آپ ایک انسان کو مسکراتا دیکھیں جس کی مسکراہٹ سے آپ کو محبت ہے اور اس سے کہیں زیادہ خوبصورت یہ جاننا ہے کہ اس کے پیچھے وجہ آپ ہیں۔

۶۔ اپنے رشتہ کا انتخاب عقلمندی سے کریں۔ بُری صحبت میں رہنے سے بہتر تنہا رہنا ہے۔

۷۔ تنہا ہونے کا مطلب یہ نہیں جہاں کوئی نہ ہو اور کسی کے نہ ہونے کا مطلب بھی تنہا ہونا نہیں ہے۔

۸۔ محبت کریں جب آپ تیار ہوں نہ کہ تنہا ہوں۔

۹۔ محبت کا مطلب کسی کو حق یہ دینا ہے کہ وہ آپ کو تکلیف پہنچائے، اُس پر اعتماد کرتے ہوئے کہ وہ نہیں پہنچائے گا۔

۱۰۔ جب آپ خود کو کسی ایک ہی شخص سے بار بار محبت میں گرفتار پاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو جی محبت مل چکی ہے۔

۱۱۔ کسی درست انسان کے اپنی زندگی میں آنے کا انتظار مت کریں بلکہ کسی کی زندگی میں آنے کے لیے درست انسان بنیں۔

۱۲۔ کوئی جو واقعی آپ سے مطلب رکھتا ہے وہ آپ کی بہتری کے لیے حوصلہ افزائی کرتا ہے لیکن پھر بھی وہ آپ کی شکست پر بھی قبول اور آپ سے محبت کرتا ہے۔

۱۳۔ جب آپ اپنے لیے کسی کو حق انتخاب کی اجازت دے رہے ہوں تو اُس کو اپنی اولین ترجیح نہ بنائیں۔

۱۴۔ کچھ رشتے شیشے کی طرح ہوتے ہیں۔ جیسے کہ اسے ٹوٹا چھوڑ دیا جائے اُس کو دوبارہ جوڑنے کے لیے کوشش میں خود کو مزید تکلیف نہ دی جائے۔

۱۵۔ صرف اس لیے کہ ایک انسان کو آپ کا خیال نہیں، اس کا یہ مطلب نہیں آپ باقی سب بھول جائیں کرتے ہیں۔

۱۶۔ خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کسی دوسرے کا غلط نہ ٹھہرائیں۔

۱۷۔ ناراض ہونا جائز ہے۔ سنگدل ہونا بالکل جائز نہیں۔

۱۸۔ کبھی بھی کچھ مستقل طور پر احمقانہ نہ کریں صرف اس لیے کہ آپ عارضی طور پر پریشان ہیں۔

۱۹۔ ہمیں ہمیشہ اصلاح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات ہمیں صرف تھامنے کے لیے ایک ہاتھ، سننے کے لیے کوئی کان اور سمجھنے کے لیے کسی دل کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۰۔ خاموشی اکثر بلند ترین پکار ہوتی ہے۔ اُن پر توجہ دیں جن کی آپ فکر کرتے ہیں۔

۲۱۔ یہ اہمیت نہیں رکھتا کہ آپ بہت کچھ بولیں۔ بعض اوقات محبت کے دو لفظ ہی کافی ہوتے ہیں۔

۲۲۔ خاموشی سے گلے لگانے کا مطلب کسی ناٹھ دل کے لیے ہزاروں الفاظ جیسا ہے۔

۲۳۔ کسی کے جذبات کو محض اس لیے نہیں نہ پہنچائیں کہ آپ کو اپنے جذبات غیر یقینی لگتے ہیں۔

۲۴۔ اصل خوشی خود سے ملتی ہے کسی دوسرے سے

ناراض ہونا جائز ہے۔ سنگدل ہونا بالکل جائز نہیں

خود کو خوشی دینے کے لیے کسی دوسرے کی آمد کے لیے کسی کو غصہ نہ کریں۔

۲۵۔ اُس کا انتخاب نہ کریں جو دنیا کے لیے ضرورت ہو بلکہ اُس کا انتخاب کریں جو آپ کی دنیا کو بہتر بنا دے۔

۲۶۔ اگر آپ اپنی کشتی کو ڈوبتا محسوس کر رہے ہیں تو یہ اچھا وقت ہے اُس مواد کو باہر پھینکنے کا جو اسے بھاری بنا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو جانے دیں جو زیر کرتے ہیں اور ایسے لوگوں میں گھرے رہیں جو آپ میں بہتری لاتے ہیں۔

۲۷۔ محض اس لیے کہ یہ وقت ہمیشہ باقی نہیں رہا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس وقت کا کوئی مول نہیں تھا۔

۲۸۔ کہیں جو آپ کہنا چاہتے ہیں اور جو آپ کہنا چاہتے ہیں وہ کریں۔ دوسروں سے اپنا ذہن پڑھنے کی توقع نہ رکھیں اور ان کے دماغوں اور دلوں سے کھیل مت کھیلیں۔ آدھا جج مت بولیں اور دوسروں سے امید نہ کریں کہ جب پورا جج سامنے آئے تو وہ آپ پر یقین کریں۔ آدھا جج جھوٹ سے بہتر نہیں ہے اور کسی ایسے انسان کو نظر انداز نہ کریں جس کی آپ فکر کرتے ہیں کیونکہ تعلق میں فقدان ناراضگی میں بولے الفاظ سے زیادہ اذیت دیتا ہے۔

۲۹۔ طویل مدت کے لیے جھوٹ کسی کی مدد نہیں کرتا لہذا ا۔ ”مجھے آپ سے محبت ہے“ مت بولیں اگر آپ کو نہیں ہے۔

ب۔ ”میں سمجھتا/سمجھتی ہوں“ مت بولیں اگر آپ کو معلومات ہی نہیں ہیں۔

ج۔ ”مجھے معاف کر دیں“ مت بولیں اگر آپ نہیں چاہتے کہ آپ کو معاف کیا جائے۔

اُس کا انتخاب نہ کریں جو دنیا کے لیے خوبصورت ہو

بلکہ اُس کا انتخاب کریں جو آپ کی دنیا خوبصورت بنا دے

د۔ خود سے اور اپنے پیاروں سے مخلص بنیں۔

۳۰۔ سچ بولیں ورنہ بالآخر کوئی اور آپ کی جگہ بول دے گا۔

۳۱۔ اچھے رشتے یوں ہی نہیں بن جاتے، وقت لگتا ہے، صبر درکار ہوتا ہے اور دو لوگ جو ساتھ رہنا چاہیں اُن کے ساتھ تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔

۳۲۔ محبت میں گرفتار ہونا کوئی انتخاب نہیں ہے لیکن محبت پر قائم رہنا اچھا انتخاب ہے۔

۳۳۔ محبت اذیت نہیں دیتی، جھوٹ، فریب اور لوگوں کے جذبات و احساسات کے ساتھ ہیرا پھیری کرنا اذیت دیتا ہے۔

۳۴۔ رشتوں کی بات ہو تو وفادار رہنا کوئی انتخاب نہیں بلکہ اولین ترجیح ہے۔ وفاداری ہی سب کچھ ہے۔

۳۵۔ ایک عظیم رشتے کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ پہلی یہ کہ مماثلت کی حوصلہ افزائی کی جائے اور دوسری یہ کہ اختلافات کی بھی قدر کی جائے۔

۳۶۔ حسد اپنی بجائے دوسروں کی خوش قسمتی جاننے کا فن ہے۔ حسد میں اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ محض خود سے جنگ کر رہے ہیں آپ۔

۳۷۔ ملکیت نہ سمجھیں۔ ایک رشتے کا مقصد، جوڑے کی صورت میں ایک دوسرے کو مکمل کرنا، ساتھ بڑھنا اور اپنے مشترک مقاصد پورے کرنا ہے۔ دوران اوقات، انسان ہونے کے ناطے دونوں اپنی الگ پہچان ضرور برقرار رکھیں۔

۳۸۔ محض دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے خود کو مت بدلیں۔ اس لیے بدلیں کہ آپ ایک بہتر انسان بنیں گے

۳۹۔ عنایت کریں لیکن دوسروں کو خود کو استعمال نہ کرنے دیں۔ دوسروں کو سنیں لیکن اپنی صداقت گنوائیں۔
۴۰۔ کسی ایسے کی تلاش نہ کریں جو آپ کی تمام الجھنیں سلجھا دے بلکہ کسی ایسے کی تلاش کریں جو آپ کے ساتھ مل کر ان مشکلات کا سامنا کرے۔

۴۱۔ خود کو مکمل کرنے کے لیے آپ کو واقعی کسی کی ضرورت نہیں۔ آپ کو صرف ضرورت ہے ایسے کسی کی جو آپ کو مکمل طور پر اپنالے۔

۴۲۔ جب آپ غصے میں ہوں تو مت بولیں ورنہ آپ ایک ایسی بہترین تقریر کریں گے جس پر ہمیشہ چبھتا رہے۔
۴۳۔ بغض رکھنا تمام خوشیوں کو ضائع کر دیتا ہے۔ اس سے بچیں۔

۴۴۔ جیسے جیسے ہم بڑے ہوتے ہیں ہمیں احساس ہوتا ہے کہ بہت زیادہ دوست بنانا فضول ہے اور اہم ہے مثالی دوست بنانا۔

۴۵۔ جب آپ بیمار ہوں گے تو آپ کی نوکری آپ کی فکر نہیں کرے گی بلکہ آپ کے دوست کریں گے، اس لیے رابطے میں رہیں۔

۴۶۔ عزت کمائی جاتی ہے، ایمانداری کی داد دی جاتی ہے، اعتماد حاصل کیا جاتا ہے اور وفاداری لوٹائی جاتی ہے۔

۴۷۔ کوئی لمحہ ضائع نہ کریں۔ ہو سکتا ہے یہ آپ کا آپ کے کسی پیارے کے ساتھ آخری لمحہ ہو۔

۴۸۔ اگر آپ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اُسے بتائیں۔ احمق لگنے کے خوف کو بھلا لیں۔ احمقانہ تو یہ ہے کہ آپ کسی کو بتانے کا موقع گنوا دیں کہ آپ کا دل اُس پر آچکا ہے۔

۴۹۔ کسی کی بھی زندگی، کسی پیارے، کسی ایسے جس کی

اُس کو ضرورت ہو یا کچھ ایسا جو وہ حاصل کرنا چاہتا ہو، محرومیوں سے خالی نہیں گزرتی۔ لیکن یہ محرومی ہمیں منظم بناتی ہے اور بہتر مستقبل کے مواقع فراہم کرتی ہے۔
۵۰۔ دوسروں کے لیے چھوٹے چھوٹے قصے کی مت چھوڑیں۔ بعض اوقات یہی چھوٹی چیزیں اُن کے دلوں میں بڑا گھر کر لیتی ہیں۔

۵۱۔ آپ کی زندگی کا بہترین حصہ جو کسی خاص انسان کے ساتھ بے مقصد پل گزارنے میں گزرا، مختصر ہوگا۔
۵۲۔ کوئی حقیقی شخص مکمل نہیں ہوتا اور کوئی مکمل شخص حقیقی نہیں ہوتا۔

۵۳۔ دنیا کے لیے آپ کوئی ایک لیکن کسی ایک کے لیے پوری دنیا ہیں۔

۵۴۔ محض اس لیے کہ آپ کا ماضی کسی کے ساتھ ہوا تھا اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کو مستقبل بھی اسی کے ساتھ گزارنا ہے۔

۵۵۔ کوئی بھی تعلق وقت ضائع نہیں کرتا۔ غلط انسان آپ کو ایسا سبق دے جاتا ہے جو آپ کو صحیح انسان بننے کے لیے تیار کرتا ہے۔

۵۶۔ معافی مانگنے میں پہل کرنا بہادری، معاف کرنے میں پہل کرنا پختگی اور آگے بڑھنے میں پہل کرنا مسرت ہے۔

۵۷۔ ایسا رشتہ نہیں بنانا چاہیے جس کو راز کی طرح رکھنا پڑے۔

۵۸۔ لوگوں کی کردار کشی اُن کے اعمال سے کریں تو آپ اُن کے الفاظ کے جال میں نہیں پھنسیں گے۔

۵۹۔ جب قطع تعلقی کی تکلیف سے برداشت کرنا زیادہ بدترین ہو جائے تو یہ وقت قطع تعلقی کرنے کا ہے۔

۶۰۔ اگر کوئی دوست مصیبت میں ہو تو اُسے یہ پوچھ

انسانی رشتوں میں فاصلہ میلوں سے نہیں الفت سے ناپا جاتا ہے

۶۱۔ انسانیت میں نے یہ جاننا ہے کہ کچھ بہترین نظموں میں قافیے نہیں ہوتے اور بہت سی عظیم/شاندار کہانیوں کی کوئی واضح شروعات، درمیان یا اختتام نہیں ہوتا۔ زندگی نہ جانے، تبدیلی کو قبول کرنے اور کوئی لمحہ لے کر اُسے یہ جانے بنا کہ آگے کیا ہوگا، کا نام ہے۔

۶۲۔ انسانی رشتوں میں فاصلہ میلوں سے نہیں الفت سے ناپا جاتا ہے۔ دو لوگ میلوں دور ہو کے بھی ایک دوسرے کے سامنے ہو سکتے ہیں۔ لہذا اُن لوگوں سے رابطے میں رہیں جو واقعی آپ کے لیے خاص ہیں۔ اس لیے نہیں کیونکہ یہ مناسب ہے بلکہ اس لیے کیونکہ یہ لوگ زیادہ کوششوں کے اہل ہیں۔

۶۳۔ ایسے لوگوں کو نظر انداز نہ کریں جو انتہائی اہم ہیں محض یہ سوچ کر کہ وہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے کیونکہ شاید ایک صبح آپ انھیں تو آپ کو احساس ہو کہ آپ نے تارے گننے میں چاند گنوا دیا۔

۶۴۔ سچی محبت ناقابلِ علیحدگی کے متعلق نہیں ہے۔ یہ دو لوگوں کے ایک دوسرے سے سچ بولنے کے متعلق ہے حتیٰ کہ وہ علیحدہ بھی ہو جائیں۔

۶۵۔ سچی دوستی اور سچی محبت میں فاصلوں اور وقت کی آزمائشوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

۶۶۔ جب کوئی آپ کو اپنا وقت دیتا ہے تو وہ آپ کو اپنی زندگی کا وہ حصہ دے رہا ہوتا ہے جو اُسے کبھی واپس نہیں ملے گا۔ یہ سب سے انمول تحفہ ہے جو آپ حاصل کرتے ہیں۔ اسے ضائع مت کریں۔

۶۷۔ اچھے رشتے محض اچھے وقتوں کو بانٹنے کے متعلق نہیں ہیں۔ وہ رکاوٹیں جن کا آپ اکٹھے سامنا کرتے ہیں اور وہ حقیقت جس میں اخیر پر آپ ”مجھے آپ سے محبت ہے“ کہتے ہیں، یہ اُن کے متعلق ہے۔

۶۸۔ کچھ کر سکتا/سکتی

۶۹۔ بعض اوقات مہربان ہونا راست باز ہونے سے بہتر ہوتا ہے۔ ہمیں ہمیشہ بولنے والے ذہن کی نہیں بلکہ محض کسی صابر دل کی ضرورت ہوتی ہے جو ہمیں سنے۔
۷۰۔ ویسے دوست بنائیں جیسے آپ دوسروں کو

چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے وقت آتے ہیں جب اپنے اہمان اور انجان اپنوں کی طرح لگتے ہیں۔ دونوں گزر جاتے ہیں، لوگ انمول ہوتے ہیں۔

۷۱۔ چاہنے والوں سے اختلافات کے دوران صرف موجودہ صورت حال سے نمٹیں، ماضی کو بچ میں نہ لائیں۔

۷۲۔ لوگوں کو ان کے ماضی سے جانچنے کے بجائے اُن کا مستقبل بہتر بنانے میں اُن کی مدد کریں۔

۷۳۔ ہر کسی کے لیے سب کچھ بننے کی کوشش نہ کریں۔ کسی ایک کے لیے سب کچھ بنیں۔

۷۴۔ یاد رکھیں ہم کسی کو محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے، ہم کسی سے رکنے کی بھیک نہیں مانگ سکتے جب کوئی ہمیں چھوڑ کر کسی اور کے ساتھ رہنا چاہے۔ یہی سب محبت ہے۔ تاہم، محبت اختتام زندگی نہیں ہوتا، یہ ایک شروعات ہوتی چاہیے یہ سمجھنے کی کہ محبت کس وجہ کے لیے چھوڑ گئی لیکن کسی سبق کے بنا نہیں چھوڑا۔

۷۵۔ جب چیزیں دور دور ہونے لگیں، اس بات کا امکان فرض کریں کہ زندگی نے یہ کسی مقصد کے لیے کیا۔ آپ کی ضد میں نہیں۔ آپ کو سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ آپ کو تجویز دینے کے لیے کہ کچھ بہتر تعمیر کریں جو آپ کی شخصیت اور مقصد کو بھائے۔

۷۶۔ ہر کوئی ایک مکمل اختتام چاہتا ہے۔ لیکن وقت

سچ بولیں ورنہ بالآخر کوئی اور آپ کی جگہ بول دے گا

المیر



سانس ہے تو آس باقی

تصویر

جس نے اوباما کی زندگی بدل ڈالی



انہوں نے طویل قید تنہائی کے دوران اپنے سیل میں یہ تصویر لٹکائے رکھی اور اسے دیکھ دیکھ کر اپنا حوصلہ بندھاتے رہے۔



اس تصویر نے سب سے پہلے پکاسو کو متاثر کیا

تخلیقی شہ پارہ اپنے اندر یہ قوت و سحر رکھتا ہے کہ انسان کی زندگی کا رخ موڑ دے۔ ۱۹۹۰ء میں جیمز وائس کی ایک تصویر ”امید“ نے شکاگو کے ایک نوجوان، باراک اوباما پر کچھ ایسا ہی اثر مرتب کیا۔

یونانی دیوالا میں امید ایک ایسی لڑکی ہے جسے پروتھس نے ”پینڈورا کے پٹارے“ میں بند کر دیا تھا۔ جب پٹارا کھلا اور تمام برائیاں فرار ہو گئیں، تب بھی امید اسی میں موجود رہی۔ گو امید ایک کردار سے زیادہ نظریہ ہے تاہم وائس سمیت کئی مصوروں نے اسے بحیثیت انسان پیش کیا ہے۔

وائس کی تصویر میں ایک لڑکی دنیا پر براجمان ہے۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں اور وہ اپنے انداز سے بے یار و مددگار نظر آتی ہے۔ اس نے برہم تھام رکھا ہے جس کے ایک کے سوا سارے تار ٹوٹ چکے ہیں۔ پھر بھی وہ برہم بجانے میں محو ہے۔ حقیقتاً ”امید“ اس بندھانے کے بجائے ناظر کو غم و افسوس میں گرفتار کر دیتی ہے۔ تاہم وائس اسی تصویر کے ذریعے یہ پیغام دینا چاہتا تھا کہ ”کبھی پریشان مت ہوں“ اور ”سانس ہے تو اس باقی“۔ وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا اور وکٹوریہ عہد کے لوگ اس کا مطلب سمجھ گئے۔ اس تصویر کو بڑی مقبولیت ملی۔ آخر کار ”امید“ ہی وائس کی شاہکار تصویر قرار پائی۔

اس تصویر نے سب سے پہلے پکاسو کو متاثر کیا۔ ”امید“ کو دیکھ کر پکاسو کے اندر جولیف جذبات ابھرے، وہ اس کی مشہور تصویر ”بلیو گٹار“ کی صورت ظاہر ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں لندن کی میٹ گیلری نے ”امید“ کو

ایک خصوصی کمرے میں لٹکائے رکھا۔ دراصل اس لمحہ میں ضرورت تھی کہ لوگوں کا حوصلہ اور عزم جوان کر جائے۔..... ”امید“ نے یہ کام بخوبی انجام دیا۔ ۱۹۹۰ء میں باراک اوباما ایک دن شکاگو ٹریڈیو یونائیٹڈ چرچ آف کرائسٹ گئے تو وہاں یادداشت جرمیاہ رائٹ نے ”امید“ کو خطاب کا موضوع بنایا۔ انھوں نے حاضرین کو بتایا ”ذرا تصویر دیکھیے، برہم نواز مجسموں میں ملبوس ہے۔ وہ اپنے حلیے سے ہیر و شیماء کی متاثر ہے۔ پھر بھی لڑکی نے بے باکی (Audacity) سے ”امید“ کا دامن تھام رکھا ہے۔“

یہ جملہ اوباما کے ذہن میں نقش ہو گیا۔ تب عقیدے، رنگ اور نسل وغیرہ کے متعلق نفسیاتی کشمکش کا شکار تھا۔ ”امید“ سے وابستہ رہنے کے خیال نے ان میں نئی توانائی بھر دی اور انھیں زندگی گزارنے کا مقصد مل گیا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ یاد رہے، اوباما کی ایک کتاب کا نام بھی ”دی اوڈیسی آف ہاپ“ (The Audacity of Hope) ہے۔

اوباما نے اپنی آپ بیتی ”ڈریمز فرام مائی فادر“ میں ”امید“ کا ذکر کچھ یوں کیا ہے۔ ”اس کے جذبات مجروح ہیں اور جسم زخم زخم، کپڑے پھٹ چکے ہیں اور برہم کا بھی ایک تار باقی ہے لیکن تصویر کو مرکز نگاہ بنائیے۔ وہ ”امید“ کی دولت سے مالا مال ہے۔ برہم نواز اوپر دیکھ رہی ہے اور چند سر آسمان کی سمت محو پرواز ہیں۔ اس حالت میں بھی لڑکی نے ”امید“ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اس میں اتنی بے باکی ہے کہ محض ایک تار سے سُر نکال کر خدا کی تعریف و توصیف کر سکے۔“



یہ جملہ اوباما کے ذہن میں نقش ہو گیا۔ تب وہ عقیدے، رنگ

اور نسل وغیرہ کے متعلق نفسیاتی کشمکش کا شکار تھا



غلام سجاد

آپ اس ہوں تو سوچ کیوں مرجھا جاتی ہے

ندری سے دوسرے کنارے کی گھاس

ناکامیوں کے دکھا اٹھانے اور کامیابی سے دور رہنے والوں کا ماجرا انہیں ندی کے دوسرے کنارے کی گھاس ہمیشہ ہری لگتی ہے

جب تک آپ کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کرتے، اپنی خوبیوں کا صحیح اور مناسب استعمال نہیں کرتے اور اپنی منزل اپنے ویژن (Vision) کا تعین نہیں کرتے تو میری نظر میں قسمت بھی آپ کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتی۔

جب کبھی زندگی میں ہمیں تلخیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یعنی کسی بھی کام میں ناکامی ہمارے سامنے آتی ہے تو چونکہ ہم کام چور ہوتے ہیں، محنت کرنے کو دل نہیں کرتا تو فوراً اپنی قسمت کو کوسنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی بد قسمتی کو لعن طعن کرتے ہوئے اپنے دکھ، غم اور پریشانیوں و ناکامیوں کی ہمہ وقت ایسی گردان الاپتے رہتے ہیں کہ جس بیچارے کو بھی ہم اپنی دکھی پیتا سناتے ہیں وہ بھی ہمارے رنگ میں رنگتا چلا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم

میں ایک کہاوت ہے ”ندی کے دوسرے کنارے گھاس ہمیشہ سرسبز دکھائی دیتی ہے۔“ یہ کہاوت طنزیہ طور پر ان لوگوں کی اندرونی کیفیت سے متعلق بتاتی ہے جو ہمیشہ اسی سوچ میں زندہ ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ ہماری نسبت خوشگوار زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے پاس تمام ضروریات زندگی موجود ہیں اور ہماری حالت دن بہ دن ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ حقیقت میں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ انسان کی زندگی میں اگرچہ مقدر یا قسمت کا کردار ضرور ہوتا ہے لیکن اس میں بھی انسان کی اپنی محنت و مشقت کا اثر ہی پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ انسان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور ترقی کی منزلوں میں آسمان کی بلندیوں کو چھوتا چلا جائے۔

انگریزی

اپنی ناکامی سے سبق حاصل کریں اور دوبارہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ انرجی کا استعمال کرتے ہوئے ایک تعمیری سوچ کے ساتھ زندگی کی پیچیدگیوں کے خاتمے کے لیے پہلو تہی کریں، ہم زندگی سے منہ موڑ لیتے ہیں اور نتیجتاً ہم ناکامی کی دہلیز پر جا مٹھائے جاتے ہیں۔

ایسی سوچ بہت بُری ہوتی ہے۔ اگر تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کی جائے تو سیکڑوں ایسے لوگ ملیں گے جنہوں نے ایک چھوٹے سے نقطے سے زندگی کا آغاز کیا اور اپنی محنت سے ترقی کی بلندیوں کو چھوا اور پھر ان کی آپ بیتیوں سے تاریخ کے ابواب رقم ہوئے۔ ایک شخص اپنے خواب کی تعمیر کی خاطر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو اکٹھا کر لیتا ہے اور دوسرا ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے ۱۷۷۱ء کا کام حملے کرتا ہے مگر حوصلہ نہیں چھوڑتا۔

ان میں اور ہم میں فرق صرف اتنا ہے کہ وہ کبھی زندگی سے ہارنے کا سوچتے نہیں تھے، ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے بیٹھتے نہیں تھے، وقت کی تیز رفتاری سے خوفزدہ نہیں ہوتے تھے، زمانے کی تلخیوں اور چیلنجوں کو انہوں نے قبول کیا اور محرم ظلمات میں گھوڑے دوڑا کے ثابت کیا کہ ان لوگوں کے ہاتھ میں وقت کی لگام ہے۔ اگر وقت انسان کے ہاتھ میں لگام بن جائے تو انسان زمانے کا شہنشاہ عظیم بن جاتا ہے اور اگر انسان کے منہ کی وقت لگام بن جائے تو پھر زمانہ انسان کو بگٹ بھگائے جاتا ہے اور پھر انسان کو دو وقت کی روٹی کا چکر ہی اپنے دھارے سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔

لوگوں میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنی ناکامی کا سہرا دوسروں کے سر باندھتے اور انہیں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ دوسروں کو بُرا بھلا کہنے اور مورد الزام ٹھہرانے سے آپ کی غربت بھی دور نہیں ہوگی۔ بعض اوقات کچھ لوگ آپ کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنے ہوتے ہیں، لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ آپ ناامیدی کا پلو پکڑ کر ایک کونے میں بیٹھ جائیں۔ آپ اپنے آپ کو مزید بہتر کریں اور وقت کے ساتھ ساتھ مزید منصوبہ بندی کرتے ہوئے راستہ تلاش کریں۔ کبھی بھی آپ کے بُرا بھلا کہنے سے

دوسرا شخص بُرا نہیں بن جائے گا۔ ہاں مگر اسے ۲۰ تعریفی کلمات کسی شخص کو تاحیات آپ کا ممنون کرنا ہیں۔ جب آپ کسی دوسرے کو اپنی ناکامی کا سبب بن گئے تو نتیجتاً اس کے اور آپ کے درمیان نفرت کی دیوار بلند ہونا شروع ہو جائے گی جس کی وجہ سے پبلک ریلیشننگ (Public Relationing) سے دور رہنے چلے جائیں گے اور ایک وقت ایسا آئے گا جب آپ زمانے کی بھیڑ میں تنہا کھڑے ہوں گے اور یہ حالات آپ کی زندگی میں بہت کٹھن ثابت ہوں گے۔

ایک مرتبہ میرا ایک دوست تقریر کرنے اسلام آباد میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے تقریر اچھی طرح سے کی ہوئی تھی اور کئی بار مجھے سنائی بھی۔ مقابلے کے دن ہال میں جا کر بیٹھے، کل ۱۶ مقررین تھے اور اس کا ٹیبلہ آخری تھا۔ ابھی پانچواں یا چھٹا مقرر ہی تقریر کر رہا تھا کہ میرا دوست نے مجھ سے کہا، ان لوگوں کی تقاریر بہت اچھی ہیں اور جو تقریر میں نے تیار کر رکھی، وہ اچھی نہیں ہے۔ یہ لوگ مقابلہ جیت جائیں گے اور مجھے پوزیشن نہیں ملے گی۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی مگر اس کے ذہن میں خوف سرایت کر چکا تھا۔ میں اسے ہال سے باہر لے گیا، پانی پلایا اور ڈھارس بندھانے کی کوشش کی تاکہ اس کی سوچ خوف سے پاک ہو سکے اور پھر واپس ہال میں لے آیا مگر اس کی حالت ویسی ہی تھی۔ آخر اس کی باری آئی اور وہ تقریر کرنے سٹیج پر پہنچا۔ اس نے پہلا فقرہ بولا اور خاموش ہو گیا، اسے آگے کی ساری تقریر بھول گئی تھی۔ ہال میں موجود تمام لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا کہ بولو، ہمت کرو مگر وہ شور سن کے اور زیادہ حواس باختہ ہو گیا۔ ۳۰ سیکنڈ سٹیج پر خاموش کھڑا رہنے کے بعد سوری کہہ کر اتر آیا۔ جس سے نہ صرف اپنی بدنامی بلکہ اپنے ادارے کی بدنامی کا باعث بھی بنا۔

انسان زندگی میں کبھی ناکام ہوتا ہے جب اس نے محنت نہ کر رکھی ہو، اس میں جوش، جذبہ، لگن اور فکر نہ ہو یا پھر وہ اپنے اوپر خوف کو اتنا مسلط کر لے کہ اس کا خوف

کامیاب ہونے کا ایک اور اصول یہ بھی ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ جب آپ خوش رہیں گے تو آپ کا دماغ ہمیشہ زرخیز رہے گا اور آپ کی سوچ بھی مثبت ہوگی اور اپنے ہدف کو تکمیل تک پہنچانے کے نئے نئے خیال بھی آپ کے ذہن میں آئیں گے۔

لیکن جب آپ اداس ہوں گے تو آپ کی سوچ بھی مر جھائی ہوئی ہوگی، تو اس وقت اول تو کوئی خیال آپ کے ذہن میں آئے گا ہی نہیں اور اگر کوئی نئی سوچ دماغ کے کسی کونے سے ابھر بھی آئی تو آپ اسے قبول نہیں کریں گے۔ جب کبھی آپ زندگی میں اپنے کسی ہدف کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوں تو کوشش کریں کہ آپ کو غصہ بھی نہ آئے۔ کیونکہ جب آپ غصے میں ہوں گے تو ہمیشہ الٹ کام کریں گے یا پھر آپ اچھے خاصے کام کو غصے کی بھیٹ چڑھاتے ہوئے نہیں نہیں کر دیں گے۔

کامیابی اور ناکامی زندگی میں بہار اور خزاں کے موسم کی طرح ہوتی ہیں۔ اگر آپ کا جذبہ سچا ہے اور کچھ کرنے کا ارادہ ہے تو یقیناً آپ کامیابی کی طرف ضرور بڑھیں

گے۔ کامیاب ہونے کا ایک اور اصول یہ بھی ہے کہ آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ جب آپ خوش رہیں گے تو آپ کا دماغ ہمیشہ زرخیز رہے گا اور آپ کی سوچ بھی مثبت ہوگی اور اپنے ہدف کو تکمیل تک پہنچانے کے نئے نئے خیال بھی آپ کے ذہن میں آئیں گے۔

لیکن جب آپ اداس ہوں گے تو آپ کی سوچ بھی مر جھائی ہوئی ہوگی، تو اس وقت اول تو کوئی خیال آپ کے ذہن میں آئے گا ہی نہیں اور اگر کوئی نئی سوچ دماغ کے کسی کونے سے ابھر بھی آئی تو آپ اسے قبول نہیں کریں گے۔ جب کبھی آپ زندگی میں اپنے کسی ہدف کی تکمیل کے لیے کوشاں ہوں تو کوشش کریں کہ آپ کو غصہ بھی نہ آئے۔ کیونکہ جب آپ غصے میں ہوں گے تو ہمیشہ الٹ کام کریں گے یا پھر آپ اچھے خاصے کام کو غصے کی بھیٹ چڑھاتے ہوئے نہیں نہیں کر دیں گے۔

کامیاب ہونے کے لیے آپ کی قوت ارادی کا مضبوط ہونا بے حد اہم ہے۔ بہت سارے لوگ جو روز سورج غروب ہوتے وقت منصوبہ بندی کرتے اور اپنے ایک خاص ہدف کا تعین کرتے ہیں اور پھر کامیابی کی آرزو کی چادر اوڑھ کر سو جاتے ہیں۔ سورج طلوع ہونے تک ان کا ہدف، ان کی منزل اور ان کا نقطہ نظر تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ زندگی کے کسی میدان میں بھی کامیاب نہیں ہو پاتے۔ آپ کی ملاقات بھی کبھی ایسے شخص سے ضرور ہوئی ہوگی جو روز سوچتا ہے کہ صبح اٹھ کر نماز پڑھوں گا، جب صبح ہوتی ہے تو نیند کے خمار کی وجہ سے نماز تو نہیں پڑھ پاتا مگر یہ ضرور کہتا ہے کہ اگلے جمعہ والے دن سے باقاعدگی سے نماز پڑھوں گا۔

بقول حضرت لقمانؑ ”ایک دانا آدمی دوسروں کے تجربات سے سیکھتا ہے اور بے وقوف شخص اپنے اعمال سے بھی نہیں سیکھتا۔“ اپنی ناکامیوں سے سبق سیکھ کر اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی ایسے طریقے سے کی جائے کہ پھر کبھی ناکامی کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ کبھی اپنے کنارے کی گھاس سرسبز ہوگی ورنہ دوسرے کنارے کی گھاس تو آپ جانتے ہیں زیادہ ہی ہری بھری لگتی ہے۔

میرا کیا قصور

برطانیہ سے پاکستان آنے والے بدقسمت نوجوان کی داستان الم
جو بے خبری میں ایک مجرم کے ہتھے چڑھ گیا

ملک بنے والے پاکستانیوں میں
ایسے لوگ بھی شامل ہیں جو اب
کسی بھی طرح پاکستانی کہلانا پسند
نہیں کرتے۔ انھوں نے نئے وطن کو پوری طرح اپنا لیا
ہے۔ اپنی اولاد کو وہاں کی تہذیب اور معاشرت سکھا کر وہ
خوش ہیں۔ لیکن ایسے خاندان بھی ہیں جو مجبوری کی وجہ
سے دوسرے ملک میں رہتے ضرور ہیں لیکن اپنے وطن
میں بنے والے عزیزوں سے گاہے بگاہے ملتے اور کسی نہ
کسی طرح رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ سمیر کا تعلق بھی ایک
ایسے خاندان سے ہے، جن کے والد نے روزگار کی تلاش
میں برطانیہ کا رخ کیا۔ محنت مزدوری کی اور کچھ عرصہ بعد
اپنی بیوی کو بھی وہیں بلوا لیا۔

سمیر سب سے بڑا بیٹا ہے۔ ماں باپ نے گوروں
کے دیس میں جنم لینے والے بیٹے کی تربیت مشرقی انداز
میں کی۔ اسے پاکستان کے متعلق اس وقت آگاہی ہوئی
جب ہوش سنبھالا۔ ماں اسے اپنے گاؤں، عزیزوں، دیہی

حالات، اقدار لوک کہانیوں اور تہذیب و ثقافت
بارے میں سناتی۔ چند سال بعد سمیر والدین کے ساتھ
بار پاکستان آیا۔ اسے یہاں کے عزیزوں سے پیار ملا۔
دیہات کا ماحول، سادگی اور خوبصورت مناظر سب کچھ
کے ذہن پر نقش ہو گیا۔ برطانیہ جا کر وہ بار بار والدین
سے فرمائش کرتا کہ اسے دوبارہ گاؤں لے چلیں لیکن
ہے، روز تو کیا برسوں بعد آنا جانا بھی کارے وارد ہے۔
سمیر کا والد بڑھتے ہوئے کنبے کی پرورش کے لیے
پہلے سے بڑھ کر محنت کرنے لگا۔ پاکستان میں سمیر کے
چچا وغیرہ بھی تھے جن کو ایک معقول رقم ہر ماہ ضرور
جانی۔ ایسے میں کئی سال گزر گئے ان کا پاکستان آنا
سمیر کی خواہش کے پیش نظر والد نے اسے تنہا پاکستان
جانے کی اجازت دی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔
مصرفیات سے وقت نکال کر وہ پاکستان آ گیا۔ اب اس
آؤ بھگت پہلے سے بڑھ کر ہوئی سمیر نے اپنے گاؤں
علاوہ لاہور، مری، ایبٹ آباد وغیرہ کی سیر بھی کی۔

سمیر کی طبیعت، چچاؤں اور کزنوں کی توجہ اور سنگت
بابت محنت لینے کے بعد سمیر نے واپسی کی تیار کر لی۔
سمیر کی طبیعت و غیرہ بنوا کر وہ ایک روز کئی عزیزوں سمیت
سمیر کی لڑائی تھا سمیر لاؤنج میں داخل ہوا اور لائن
سمیر کے سامان کی پڑتال کرانے کے لیے باری کا انتظار
کے لگا۔ اسی وقت ایک شخص نے آکر سمیر سے دعا
کر لی۔ ملک بیک کے بعد سمیر کا سامان دیکھتے ہوئے
سمیر نے کہا کہ وہ بھی لندن جا رہا ہے لیکن سامان اس
سے کچھ زیادہ ہے۔ سمیر کا سامان بہت کم تھا۔ اس
سے اپنے ہم وطن بھائی سے ہمدردی کرتے ہوئے اس کا
بیک اپ اپنی لڑائی پر رکھوا لیا۔

بیک رکھ کر سمیر قطار میں چلتا رہا جب کہ وہ آدمی باقی
بیک کے بہانے کھسک گیا۔ سمیر نے بھی زیادہ توجہ
نہ دی اور باری آنے پر سامان چیک کرانے لگا۔ سامان
چیک کراتے ہوئے جب اس بیک کی باری آئی تو کسٹم
کام نے اسے کھولا۔ دیگر سامان کے علاوہ اس میں دیسی
دھات کی چیل بھی تھی۔ حکام نے جب چیل کو غور سے
دیکھا تو اسے "مسفید سفوف" برآمد ہوا۔

یہ "ہیروئن" ہے۔ انسپکٹر نے کہا اور سمیر کو ایک طرف
لے کر سمیر نے لاکھ کہا کہ یہ بیک اس کا نہیں مگر کوئی
بھائی کو تیار نہ تھا۔ لاؤنج میں دور تک اس آدمی کا نام و
نشان بھی نظر نہ آیا جس نے بیک سمیر کو دیا تھا۔ یوں سمیر
بے گناہ جانے کے بجائے ہیروئن سمگل کرنے کے جرم میں
جیل بھیج دیا۔ آزاد برطانوی معاشرے میں پلے بڑھے
سمیر کے لیے جیل ایک عذاب سے کم نہیں جہاں وہ روز
بہ روز مارا جاتا رہتا ہے۔ اس کا باپ بیٹے کی گرفتاری کی خبر سن
کر بے ہوش ہو گیا۔ فوج نے آدھا جسم مفلوج کر دیا۔
جیل میں سمیر کی مشکلات بڑھتی گئیں۔ اسے بڑی عمر
کے منشیات داروں میں رکھا گیا۔

جیل حکام برطانوی شہری سمجھ کر اسے سونے کی چڑیا
بوسنے اور طرح طرح سے پیسے اینٹھنے کی کوشش کرتے تو

قیدی اس سے ضرورت کا سامان طلب کرنے کے علاوہ
خدمت بھی لیتے۔ شروع میں سمیر سب کچھ سہتا رہا۔ جب
مطالبے ختم ہونے میں نہ آئے اور پردیس سے والدہ نے
بھی دہائی دی تو اس نے ماں سے مزید پیسے مانگنے سے
گریز کرنا شروع کر دیا۔ لیکن اب وہ جیل حکام اور قیدیوں
کی ضروریات کہاں سے پوری کرتا؟

پرانے گھاگ قیدیوں نے اسے جیل میں منشیات
بیچنے پر لگا دیا۔ کچھ حالات کچھ بری صحبت کے باعث وہ
بیچتے بیچتے خود بھی ہیروئن پینے لگا۔ عدالت نے اسے ۱۳
سال قید بامشقت سنائی تھی۔ یوں جو پاکستانی نوجوان دور
پردیس سے اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان دیکھنے آیا تھا،
اب دنیا و مافیہا سے بے خبر نشے میں گم صم قیدیوں کی
جھڑکیاں، ملازموں کی گالیاں اور سنگی ساتھیوں کی گھرکیاں
سننے اور سردھننے اس کا وقت گزرنے لگا۔

ایسے میں ایک خدا ترس پڑھے لکھے قیدی نے اسے
سنبھالا وہ بھی کچھ عرصہ برطانیہ میں رہ کر آیا تھا۔ اس کی توجہ
اور محنت سے کچھ عرصے بعد سمیر ہوش و حواس میں آ گیا۔ اب
وہ اس خدا ترس قیدی کی مہربانی سے جیل کی مسجد میں قرآن
سیکھنے، دینی تعلیم حاصل کرنے اور اپنے محسن کو دعائیں دینے
میں مصروف ہے۔ اس کی مشقت اتنی ہے کہ مسجد کی صفائی
ستھرائی کرے، قرآن اور ترجمہ قرآن کے علاوہ وہ درس
نظامی (وفاق المدارس العربیہ) کی جماعتوں میں شرکت
کرنے والے قیدیوں کی خدمت کرے۔ سمیر کو تو کسی کی دعا
نے سنبھال دیا، وہ قید کاٹ کر کسی روز رہائی پالے گا لیکن
جس شخص نے اس نوجوان کو اتنے مصائب میں ڈالنے کا
سامان کیا، اس کے ذریعے منشیات کا گھناؤنا کاروبار کرنا چاہا،
ایسے "موت کے سوداگر" کا کیا بنے گا؟ خدا جانے اس بد
بخت نے اب تک اور کتنے سمیروں کو نشانہ بنایا ہوگا؟ یہ ناسور
کسی نئے نام سے، کسی سرکاری اہل کار کی مدد سے، کسی ایئر
پورٹ پہ ایسے معصوم مسافروں کو ڈھونڈ نکالتے ہیں جنہیں کبھی
اپنی منزل پر پہنچنا نصیب نہیں ہوتا اور باقی زندگی وہ سوال
کرتے ہی رہ جاتے ہیں کہ میرا کیا قصور تھا؟

میری حیرت نہیں جاتی

خدا گواہ ہے کہ میں نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا تھا

ایک خواب کا حیران کن ماجرا

واقعہ لاہور میں ہوا۔ ذکر کویت کیسے جانچا۔



(اللہ وافعی)

حقائق کی دنیا میں رہنے والا آدمی ہوں اور خوابوں پر مجھے کبھی یقین نہیں رہا۔ خواب نہ دیکھتا ہوں نہ سنتا ہوں نہ انھیں اہمیت دیتا ہوں۔ گو کہ کچھ خواب ایسے بھی تھے جو اللہ تعالیٰ نے عین میری خواہش کے مطابق پورے کر دیے تاہم یہ جاگتی آنکھوں سے دیکھے جانے والے

خواب تھے۔ جن کی تعبیر بھی مجھے ملی اور حیران کن طور پر تعبیر ملی۔ جہاں تک سوتے میں دیکھے جانے والے خواب کا تعلق ہے تو وہ نہ میں نے دیکھے نہ ان پر اعتبار کیا۔ کئی سال ہوئے مجھے گھٹنے کی تکلیف رہنے لگی۔ اتنا بڑھ گیا کہ نماز پڑھنے میں دشواری ہونے لگی۔ گلبرگ II میں واقع مسجد شان اسلام جاتا تو وہاں پر

میں دیکھا ہے۔ وہ کبھی مجھے مل جاتا، کبھی کسی دوسرے کے کام آتا ہوتا تو میں بہت تنگی میں نماز ادا کرتا۔ میں نے سوچا کہ میرے جیسے کوئی اور بھی تو ہو سکتے ہیں، ان کے لیے مزید موڑھے ہونے چاہئیں تا کہ ضرورت مند کو تسکین مل سکے۔ میں نے اپنے حلیہ اور حالت کا جائزہ لیا۔ میں نے اپنے صاحب کی طرح بڑی بڑی باتیں کہیں نہ کہیں کر سکتا۔ چنانچہ چھوٹے موٹے کام میں بھی اپنی زبان کا گمان ہو سکتا ہے، میں بڑے شوق سے کر لیتا تھا اور پھر متنی رہتا ہوں کہ خالق کی نظر میں وہ نیکی ہی ہے جو کام، اس کے ہاں جو کام، جو نیکی قبولیت کا ثواب دے۔ وہی اصل میں کامیابی ہے اور وہی بڑا کام ہے۔ موڑھوں کا خیال لیے میں بازار سے ۶/۷ موڑھے لے کر آیا۔ ان پر غلاف چڑھائے۔ ایک گھر میں رکھا اور پھر مسجد میں رکھ دیے۔

ہم انسان بڑے کاروباری واقع ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے بھی حساب کتاب اور لین دین کرتے رہتے ہیں۔ اس کی خوشی اور رضا کی خاطر کوئی کام کریں تو ساتھ ہی کوئی شرط، کوئی فرمائش، کوئی ضرورت بھی نکھی کر دینے سے نہیں جھجکتے۔ میں نے موڑھے مسجد میں رکھے اور دل میں دعا کی "یا اللہ! ان موڑھوں کو مسجد میں رکھنے کا ثواب میری بیوی ممتاز کو پہنچا دینا۔" وہ کچھ عرصہ قبل فوت ہو گئی تھی۔ (مہربانی ہوگی۔)

اس واقعہ کے ایک سال بعد، جب کہ میں موڑھوں کی خریداری اور خدا سے اپنی فرمائش بھول بھال چکا تھا، میری بیٹی نادیا کویت سے پاکستان آئی۔ اس نے گھر میں بڑا ہوا موڑھا دیکھا تو ایک دن پوچھنے لگی: "ابو! یہ موڑھا کس کا ہے؟ مسجد سے لائے ہیں کیا؟"

میں نے اسے بتایا کہ یہ موڑھا تو اپنا ہے، مسجد کے لیے میں الگ سے لایا تھا، وہ مسجد میں رکھ دیے۔ یہ ایک گھر میں رہنے دیا۔ اس پر اس کو کچھ یاد آ گیا اور وہ بتائے گی کہ اس کی سہیلی نائلہ نے اسے کویت سے خط لکھا تھا اور اس میں لکھا کہ میں نے آپ کی امی کو خواب

میں دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا: "آئی، کیسی ہیں؟" اس کا جواب انھوں نے یہ دیا کہ "ٹھیک ہوں۔ جب سے تمہارے انکل نے موڑھے لا کر دیے ہیں مجھے بیٹھنے میں بڑی سہولت ہے۔" مجھے اپنی بیٹی پر کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا اور نہ میں نے اسے کبھی ڈانٹا تھا لیکن اس وقت غصے بھری حیرت و بے یقینی کے عالم میں، میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا: "تم عورتوں کے یہ ڈرامے اور ڈھکوسلے ہوتے ہیں، کسی بھی بات کو خواب بنا کر سنا دیا۔ جیسا دل چاہا خواب بنا لیا۔" وہ حیرانی کے ساتھ وضاحت کرنے لگی، "نہیں تو ابو! نائلہ نے یہ سارا کچھ مجھے کویت سے خط میں لکھا تھا۔"

میں نے یقین نہ کرتے ہوئے کہا: "نائلہ کا نمبر ملاؤ، اس سے میری بات کراؤ۔"

اس نے رسیور اٹھایا اور میری بات کرائی۔ میں نے اس سے پوچھا: "میں یہ کیا سن رہا ہوں؟ تم نے اپنی آنٹی کے بارے میں کیا کہا تھا نائلہ سے؟" اس نے کہا: "انکل، میں خواب میں آپ کے گھر جاتی ہوں۔ وہاں آنٹی ملی، میں نے پوچھا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں ٹھیک ہوں، جب سے تمہارے انکل نے موڑھے لا کر دیے ہیں، بیٹھنے میں بڑا آرام ہے۔"

میری عمر اللہ کے فضل سے اب ۸۰ سال سے زیادہ ہے اور یہ واقعہ میری اہلیہ کے فوت ہونے کے ۴ سال بعد پیش آیا۔ مسجد میں موڑھے رکھتے ہوئے میری جو نیت تھی، خدا گواہ ہے کہ وہ صرف میرے دل میں تھی۔ کسی سے ذکر تک نہ کیا تھا۔ اتنی سی بات کا بھلا ذکر بھی کیا کرتا؟ مگر قربان جاؤں اپنے خالق اور مالک کے، وہ ایک معمولی موڑھے کی نیت اور نیکی بھی ضائع نہیں کرتا! تب بھی حیرت زدہ تھا اور آج بھی قادر المطلق کی شان پر حیران ہوں۔ وہ سچ کہتا ہے اپنی کتاب میں کہ ذرا بھرنیکی بھی ضائع نہیں جانے دیتا۔

شرطِ محبت

اُردو کے ایک خوش فکر، خوش کلام
ادیب ڈاکٹر شیر شاہ سید کی تحریر
وہ حیران کر دینے کا فن خوب
جانتے ہیں محبت کرنے والے آدمی
کی کہانی وہ ریت کے گھروندوں میں
رہتا تھا اور بچوں سے پیار کرتا تھا



مہنتیں

W

مہنتیں

علوم اسلامیہ

لاہور

لاہور

مہنتیں

مرغیہ

نجات

042-3

میں

اُس زمانے میں برمنگھم میں رہتا تھا۔ برمنگھم، انگلستان کا دوسرا بڑا شہر ہے لندن اور برمنگھم میں فرق ایسے ہے جیسے کراچی اور حیدر آباد۔ آبادی

مستقل کی بھرمار کے باوجود برمنگھم ابھی تک لندن کی طرح کسی بے کسی، تڑپ اور چھین اپنے اندر نہیں لاسکا ہے۔ لوگ چلتے چلتے رُک جاتے ہیں، جیسے کچھ بھول آئے ہوں اور بھولی ہوئی چیز کے لیے لوٹ بھی جاتے ہیں۔ سڑکوں پر گھبرے ہوئے بات کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ لوگ بے مطلب اور بے غرض بھی بات کر لیتے ہیں، ہیلو کر دیتے ہیں، حال پوچھ لیتے ہیں۔

اُس روز انجم کی طبیعت خراب تھی، صبح سے رو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے شام کو اسے نیند آئی تھی اور گھر میں کچھ سکون ملا تھا۔ نسیم بھی تھک کر سو چکی تھی۔ دونوں ماں بیٹی سرد ہواؤں سے بے خبر گرم کمرے میں لحاف میں دبکی ہوئی تھیں اور میں ٹیلی ویژن کے آگے بیٹھارات کا سفر کاٹ رہا تھا کہ کسی نے آہستہ سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ پہلے تو میں ہوا کا کوئی آوارہ بھونکا سمجھ کر بیٹھا رہا مگر جب دوسری دفعہ بھی دروازہ ہلا تو میں نے جا کر دروازہ کھولا۔ ایک بوڑھا آدمی سردی سے کپکپا رہا تھا۔ ”میرا نام جان ہے، میں رات گزارنا چاہتا ہوں۔“

انگلستان میں اس کا رواج تو نہیں ہے مگر اب کچھ دنوں سے گرتی ہوئی معاشی صورت حال اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری نے جہاں بھکاری پیدا کیے ہیں وہاں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے تو میرے جی میں آئی کہ ’سوری‘ کہیے کہ دروازہ بند کروں مگر بندھے کے چہرے پر کچھ ایسی بے کسی تھی، کچھ ایسا اضطراب تھا، کچھ ایسی امید تھی کہ مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں لاہور میں اپنے گھر میں کھڑا ہوں، ٹھنڈی ہواؤں کے جھکڑ مل رہے ہیں اور چچا فضل دین کپکپاتا ہوا جا رہا ہے اور یکا یک رُک کر کہہ رہا ہے۔ ”مر تھی! رات تیرے پاس سو جاؤں کیا؟“ میں راستے سے ہٹ گیا اور جان کو اندر بلا لیا۔ گرم کمرے میں آتے ہی جیسے اسے آرام ملا، اس کے چہرے پر اطمینان آ گیا۔ وہ جلتے ہوئے بیٹر کے پاس والے صوفے پر بیٹھ گیا،

مجھے محسوس ہوا، جیسے وہ بھوکا ہو۔ میں نے چار سلائس گرم کیے اور دو انڈے قل کر بھرے ہوئے کافی کے مگ کے ساتھ لا کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ اس نے تشکر بھری نظروں کے ساتھ مجھے دیکھا اور اس طرح کھانا شروع کر دیا جیسے نہ جانے کب کا بھوکا ہو۔

اوپر ایک چھوٹا کمر خالی تھا، میں نے جتنی دیر میں بستر ٹھیک کیا، اتنی دیر میں جان کھانا ختم کر چکا تھا اور کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ بھرے پیٹ کا اطمینان اس کے چہرے پر آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔ صبح نسیم نے مجھے جگایا۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ چھوٹے کمرے میں کون سو رہا ہے؟ جان ابھی تک سو رہا تھا اور اس طرح سو رہا تھا جیسے کبھی نہ سویا ہو۔ ویسے بھی آج ہفتہ تھا، چھٹی کا دن۔

میں نہا دھو کر تیار ہوا تو جان جاگ گیا تھا۔ آج بھی مجھے بہت سے کام نمٹانے تھے۔ ڈرائنگ روم کا وال پیپر بدلنا تھا، نیا قالین لا کر رکھا ہوا تھا، وہ بچھانا تھا اور باہر باغیچے صاف کرنا تھا۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا مگر وقت کی کمی کی وجہ سے چیزیں خراب سے خراب تر ہو گئی تھیں۔ جیسے ہی میں نے پرانا وال پیپر نکالنا شروع کیا، جان بھی میرے ساتھ شامل ہو گیا۔

پورا دن ہم دونوں کام میں لگے رہے۔ شام تک ڈرائنگ روم میں نیا قالین بھی بچھ گیا اور نیا وال پیپر بھی لگ گیا۔ ہم دونوں بری طرح تھک چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر جان رک جائے تو اس کے ساتھ مل کر باغیچے کا کام بھی نمٹا دوں گا۔ کھانا کھانے کے بعد نہ اس نے جانے کے لیے کہا اور نہ میں نے اس سے کچھ کہا۔

رات گئے جب مجھے نیند آنے لگی تو میں نے جان سے کہا کہ وہ اوپر کمرے میں جا کر سو جائے۔ آج دن بھر انجم کی طبیعت بھی سچ رہی تھی۔ وہ ہم لوگوں کے کام کے درمیان آ کر پڑ پڑ بولتی رہی۔ مجھ سے زیادہ اس کی دوستی جان سے ہو گئی۔

دوسرا دن بھی کام میں نکل گیا مگر شام کو باغیچے اور گھر اس طرح لگ رہا تھا جیسے ہم نئے گھر میں آ گئے ہوں۔ ہر

تین سال سحری اور سلیقے سے لگی ہوئی تھی۔ جان دن بھر میرے ساتھ کام کرتا رہا تھا۔

صبح کے دن صبح میں کام پر چلا گیا، شام کو واپس آیا تو گھر کے اندر کی صورت ہی بدلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جیسے کسی نے پورا گھر سجا دیا ہے۔ نسیم نے بتایا کہ جان نے پورے گھر کی صفائی کی ہے اور اب انجم کو لے کر پارک گیا ہوا ہے۔ جان واپس آیا تو انجم کے ہاتھ میں چاکلیٹ کے کئی پھونے بڑے پیکٹ تھے، غبارے تھے اور کچھ کھلونے، چھوٹی سی بچوں والی ٹوکری میں بھرے ہوئے تھے۔ کھانا کھا کر ہم لوگ کافی دیر تک ٹیلی ویژن دیکھتے رہے۔

منگل کے دن سے نسیم جاب شروع کر رہی تھی۔ جان کے ذمے یہ کام لگا دیا گیا کہ وہ انجم کو زسری چھوڑ کر آئے گا اور شام کو لے کر بھی آئے گا۔

شام کو ہم لوگ گھر پہنچے تو دیکھا، انجم کے ہاتھ منہ دھلے ہوئے ہیں۔ وہ شام کا صاف ستھرا لباس پہنے جان کے ساتھ کھیل رہی تھی۔

میں نے اور نسیم نے مل کر جلدی جلدی کھانا تیار کیا اور پھر روز کی طرح رات ہو گئی۔

اب جان کا یہ معمول ہو گیا کہ صبح انجم کو زسری پہنچاتا، دن بھر گھر کی صفائی کرتا، چھوٹے موٹے کام نمٹاتا، شام کو انجم کو واپس لے کر آتا۔ رات کو اسے کوئی کہانی سناتا پھر مجھ سے تھوڑی بات کر کے خود بھی سو جاتا۔

وہ بہت دھیرے سے ہمارے چھوٹے سے خاندان کا حصہ بن گیا۔ اسے انجم سے بہت محبت تھی۔ انجم کے پاس پہلے بھی کئی کھلونے تھے مگر چار پانچ مہینے میں اس کے پاس نہ جانے کیا کیا چیزیں آ گئی تھیں۔ جان اپنی پینشن کا بڑا حصہ انجم پر صرف کر دیتا۔ وہ بڑا مست آدمی تھا، اپنی ذات میں مگن۔ آہستہ آہستہ پتا لگتا گیا تھا اس کے بارے میں۔ اس کا ایک بیٹا، امریکہ شفٹ ہو گیا تھا اور ایک بیٹی آسٹریلیا میں شادی کر کے آباد ہو گئی تھی اور بیوی ۱۵ سال پہلے کسی حادثے کا شکار ہو گئی تھی اور اب اس کا کوئی نہیں تھا۔ ایک بھائی تھا، انگلینڈ کے کسی کونے میں۔ نہ اسے اس کی خبر تھی اور نہ اسے اس کی۔

جان ہمارے ہاں آنے سے پہلے ایک اولڈ ہوم میں رہتا تھا مگر اب ہمارے ہی گھر کا ایک فرد بن گیا تھا جیسے پردیس میں کوئی بزرگ مل گیا ہو اور انجم کو تو جیسے کوئی ساتھی مل گیا تھا۔ وہ جان کے ساتھ ہر وقت مگن رہتی۔

ایک دن انجم کو بخار ہو گیا۔ ہم دونوں اسے جان کے پاس چھوڑ کر کام پر چلے گئے۔ دوپہر کو جان نے میرے آنکس فون کیا کہ اس نے انجم کو اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ اس نے ڈاکٹر کو گھر پر بلایا تھا، ڈاکٹر نے اسے اسپتال بھجوا دیا ہے۔

میں اور نسیم اسپتال پہنچے تو جان راہ داری میں ایک دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ چھوٹی سی ایک صلیب اس کے ہاتھوں میں دبی تھی۔ نہ جانے وہ دل ہی دل میں کیا بڑبڑا رہا تھا۔ میں سمجھا کہ شاید انجم کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے مگر وہ ٹھیک ٹھاک تھی۔

خرے کی وجہ سے اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی لگ رہی تھیں مگر ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ ہم لوگ گھر آ گئے۔

رات بھر مجھے ایسا لگا جیسے کوئی ٹہل رہا ہے۔ جان کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ رات بھر نہیں سویا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا جذبہ تھا، کون سی کسک تھی، کون سا رشتہ تھا جو جان کو رات بھر جگاتا رہا۔ انجم نہ اس کی بیٹی تھی، نہ نواسی، نہ پوتی۔ وہ ایک اجنبی سماج کا، اجنبی ملک کا، اجنبی شہر کا، اجنبی زبان کا ایک اجنبی آدمی تھا۔ ایک مسافر کی طرح جو کسی سرائے میں چلا آتا ہے۔

دوسرے دن میں اور نسیم شام کو اسپتال پہنچے تو اسپتال میں زبردست تماشا لگا ہوا تھا۔ سسٹر انچارج میرا انتظار کر رہی تھی اور جان استقبالیے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جان صبح وہاں پہنچ گیا تھا اور نرسوں سے جھگڑ رہا تھا کہ وہ انجم کا خیال نہیں کر رہی ہیں۔ سسٹر نے مجھ سے کہا کہ میں جان کو واپس لے جاؤں اور کل سے اسے اسپتال میں نہیں آنا چاہیے کیونکہ سارے مریض، سارا نظام اس کی وجہ سے ڈسٹرب ہو گیا ہے۔ مجھے سخت خفت کا سامنا کرنا پڑا پھر جب میں نے جان سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ تو وہ اور ناراض ہو گیا۔

سارے راستے ہم لوگ خاموش رہے۔ میں نے گاڑی کے آئینے میں دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ وہ دھیرے دھیرے رو رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر میں نے اس سے آہستہ سے کہا۔ ”جان! کیا بُرا مان گئے؟“ اس نے بڑے کرب سے کہا۔ ”نہیں چارلی! نہیں مجھے بُرا ماننے کا کیا حق ہے۔ جب میرے بچے میرے پاس نہیں رہے تو میں تم پہ حق کیسے جتا سکتا ہوں؟ میں تو دشمن ہوں انجم کا۔ یہ حرام خورنریں مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں اسے۔ میرا کیا حق ہے؟“ وہ جذباتی ہو گیا۔ اس کے چہرے والے چہرے پر آنسو ٹٹماتے ہوئے چراغ کی طرح بجڑک رہے تھے۔

میں نے اس سے معافی مانگ لی۔ ”نہیں، جان! یہ مطلب نہیں ہے میرا۔ میں بھی تو تمہارے بیٹے کی طرح ہوں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، درست ہے۔“

انجم جلد ہی اسپتال سے لوٹ آئی اور زندگی کے روز و شب اسی طرح سے شروع ہو گئے۔ سال ایسے گزر گیا جیسے شروع ہی نہ ہوا ہو۔ کرمس پر جان نے انجم کے لیے ایک قیمتی کھلونا خریدا۔ وہ جان سے اتنی زیادہ مانوس ہو گئی تھی کہ نسیم کا دل پریشان ہو گیا تھا، وہ کہتی تھی کہ ایک دن ہم لوگ واپس چلے جائیں گے، پھر کیا ہوگا؟

جان بڑے دھیرے سے ہم لوگوں کی زندگی میں داخل ہوا تھا اور آہستہ آہستہ ہمارے خاندان کا فرد بن گیا تھا۔ بوڑھے جان کی زندگی بھی عجیب تھی۔ اسے بیٹے کو دیکھے ہوئے سالہا سال گزر چکے تھے۔ شروع میں تو کرمس کا رُخ وغیرہ آتے تھے پھر آہستہ آہستہ ان کا سلسلہ بھی بند ہو گیا۔ فون کا ایک تعلق رہ گیا تھا مگر وہ بھی اس طرح ختم ہوا کہ جان کے بیٹے پیٹر نے شادی کر لی اور کسی نئے شہر میں آباد ہو گیا۔ اس شہر سے اس نے فون ہی نہیں کیا اور جان کو پچھلے گھر سے کسی نے نیا نمبر بھی نہیں دیا۔ جان کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔ وہ اکثر کہتا۔ ”نہ جانے پیٹر کے بچے ہیں کہ نہیں۔ نہ جانے کیسے ہوں گے، کاش میں ان سے مل سکتا۔“ وہ مجھے چارلی کہتا تھا اور شاید مجھ سے بھی اسی شدت سے

محبت کرنے لگا تھا، جس شدت سے اسے انجم پیاری تھی۔ اس نے کبھی اپنی بیٹی کا ذکر نہیں کیا تھا جو آسٹریلیا میں آباد ہو گئی تھی۔ سلویا اس کا نام تھا۔ ایک مرتبہ جمعہ کی رات نسیم اور انجم دونوں سوئے ہوئے تھے۔ میں نے جان سے پوچھا کہ تم کبھی آسٹریلیا نہیں گئے؟ یہ بھی ایک اتفاق تھا، ٹی وی پر ابھی ابھی آسٹریلیا کے ”ایب اور بچنلز“ کے بارے میں پروگرام ختم ہوا تھا، اسی لیے میں نے جان سے پوچھ لیا تھا۔ ”ایب اور بچنلز“ آسٹریلیا میں رہنے والے اصل لوگ تھے جنہیں انگریزوں نے مار مار کر ختم کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس وسیع و عریض زمین پر قبضہ کر لیں۔ قبضہ تو ان کا ہو گیا تھا مگر وہ ”ایب اور بچنلز“ کو ختم نہیں کر سکے تھے اور اب تو ”ایب اور بچنلز“ کی بقا کے لیے مہم شروع ہو چکی تھی۔ وہ سفید فام لوگ جو پکے رنگ کے گندمی ”ایب اور بچنلز“ کے سر کاٹنے پر ۱۰ ڈالر کمایا کرتے تھے، اب ان کی ثقافت اور تہذیب بچانے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔

میرے سوال پر جان دھیرے سے مسکرایا، ایک تلخ سی مسکراہٹ۔ ”ہاں چارلی! میں گیا تھا۔ میری تو وہاں بیٹی ہے۔ اس کے بچے ہیں مگر وہاں دل نہیں لگا۔ میں تو اس لیے گیا تھا کہ ہمیشہ کے لیے وہاں رہ جاؤں گا۔ نواسوں اور نواسیوں کو کھلاتے ہوئے زندگی گزار دوں گا مگر یہ نہ ہو سکا۔ انہوں نے میرے ساتھ وہی کیا جو ”ایب اور بچنلز“ کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ایک ماہ بعد ہی میری بیٹی نے کہا کہ پاپا واپس چلے جاؤ۔ مجھے محسوس ہوا، جیسے بچوں کا مجھ سے قریب آنا انہیں اچھا نہیں لگا۔ ہوا یہ تھا کہ ان کا چھوٹا بیٹا اینڈریو میرے بہت قریب آ گیا تھا جیسے انجم میرے قریب آ گئی ہے۔ ایک شام ہم سب باہر بیٹھے ہوئے شام کا مزہ لے رہے تھے۔ میں تھا، میری بیٹی سلویا تھی، اس کا شوہر ڈیسمنڈ تھا۔ ٹھنڈی بے درد بھر کی ٹھکن مٹا رہی تھی اور بچے دوڑ بھاگ رہے تھے اور اپنے کھیل میں لگے ہوئے تھے کہ یکا یک اینڈریو ایک چھوٹی سی دیوار سے نیچے گر گیا اور اپنے سر پر چوٹ لگا بیٹھا۔ چوٹ کوئی خاص نہیں تھی مگر وہ جیسے ہی سنبھلا، روتا ہوا، ہچکیاں لیتا ہوا اور دوڑتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ ڈیسمنڈ اور سلویا دونوں اس کی طرف



مظہر سلیم مجوکہ

وہ دس روپے

ایک ادھار کا تذکرہ جس نے دوستوں کو سالوں سے باہم باندھ رکھا تھا

بھولے سے اُس نے بھی کوئی تقاضا کیا تھا۔ میں بالکل بھول چکا تھا کہ میں نے کسی سے ۱۰ روپے ادھار لیے ہیں جن کو واپس کرنے کا میں اخلاقی طور پر پابند ہوں۔ کالج چھوڑے ہوئے قریباً ایک برس ہو گیا تھا۔ ایک دن میں ریلوے اسٹیشن گیا جہاں ایک دوست کو الوداع کرنا تھا۔ وہاں اچانک ایک شناسا چہرہ نظر آ گیا۔ جی ہاں یہ آصف تھا۔ وہی ہم جماعت جس سے میں نے کالج میں ۱۰ روپے ادھار لیے تھے۔ مجھ سے بڑے خلوص سے ملا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُس کے ایک رشتہ دار آرہے ہیں جن کو لینے وہ وہاں آیا تھا۔ کالج کی سہانی یادوں کا ذکر چھڑ گیا۔ گاڑی کے آنے میں کچھ تاخیر تھی اس لیے ہم کافی دیر گفتگو کرتے رہے۔ باتوں باتوں میں اُسی تقریب کا ذکر چھڑ گیا اور اُس تقریب کے حوالے سے مجھے وہ ۱۰ روپے یاد

میں ہمارے ادنیٰ گروپ کی جانب سے کوئی تقریب تھی۔ تقریب سے کچھ روز پہلے گروپ کے انچارج ممبر صاحب نے تمام لڑکوں سے کہا کہ وہ اپنے اپنے رقم کی رقم جلد از جلد جمع کرادیں جو کہ ۱۰ روپے فی کس تھی۔ رقم وصول کرنے کے لیے ایک دن متعین کر لیا گیا تھا۔ سب لڑکوں نے اُس دن ۱۰، ۱۰ روپے جمع کرادیے۔ میرے پاس اُس دن اتفاق سے کوئی پیسہ نہیں تھا اس لیے میں نے ایک ہم جماعت آصف سے ۱۰ روپے ادھار لے کر جمع کرادیے۔ تقریب منعقد ہوئی۔ انہی گہما گہمیوں میں گزرتے رہے یہاں تک کہ کالج کی سہانی زندگی سے بے غم ہو گیا۔ سب دوست بچھڑ گئے۔ مجھے اس اثنا میں ان دوست کو رقم لوٹانی بالکل یاد نہ رہی اور نہ ہی کبھی

کالج

اور انجم کے لیے تحفے لایا اور ہم لوگوں کو بھینچ کر چھوڑنے آیا۔ اس کا پروگرام تھا کہ ہمیں چھوڑنے کا نیوکاسل جائے گا جہاں اس کا گھر تھا، جس میں اس کا دار رہ رہا تھا۔ بچھے ہوئے دل کے ساتھ میں نے اس رخصت کی رسمی اجازت لی۔ اس نے بڑے پیار سے الوداع کیا، مجھے پتہ تھا کہ بڑی ہمت سے اس نے آنسو روکے ہیں۔ پھر ہم لوگ اس سے رخصت ہو گئے۔ میں نے مڑ کر ایک آخری نظر ڈالی۔ میں نے اس کے ضبط کے بند ٹوٹ چکے ہیں۔ جان جالیوں سے روک روک کے آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا تھا۔ قدم ہلکا ہوا گیا کہ کہیں انجم بھی مڑ کر نہ دیکھے۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں اور مہینے میں بدل گئے۔ نہ مجھے فرصت ہوئی، نہ ہی جان کا کوئی آہٹ، انجم نئے لوگوں، نئے اسکول میں آکر جلد ہی بھول گئی۔ اب وہ سب کچھ ایک خواب سا لگتا تھا۔

ایک دن لندن سے رجسٹرڈ لفافہ آیا۔ فرینک فرینک وکیلوں کی کمپنی کی طرف سے جس میں جان کی موت کی خبر تھی۔ وہ سڑک پر ایک حادثے میں زخمی ہوا تھا پھر دن اسپتال میں رہ کر چل بسا تھا۔ لفافے میں وصیت نامہ ایک کاپی تھی جس کے مطابق جان کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ فروخت کر کے ادھے کا بینک آرڈر انجم کے نام تھا اور باقی ادھا اینڈریو کے لیے آسٹریلیا بھیج دیا گیا تھا۔

یہ جو خوب صورت مکان ہے، قیمتی اور بڑا، یہ مکان نہیں ہے۔ یہ انجم کا ہے، جہاں ہم سب رہتے ہیں اور اس مکان کا نام انجم منزل نہیں ہے، اس کا نام جان لان ہے اور اس کتبے کے نیچے لکھا ہوا ہے۔ ”بے لوث، بے غرض، غیر مشروط محبت۔“ اس کے سوا کسی طریقے سے ہم اسے نہیں رکھ سکتے تھے۔ اپنے اس اجنبی دوست کو، جس نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ محبت کی صرف ایک ہی شرط ہوتی ہے اور یہ کہ محبت بے لوث، بے غرض اور غیر مشروط ہو۔

دوڑے مگر معصوم بچہ میری طرف آیا کیوں کہ اس تھوڑے سے عرصے میں، میں نے اسے وقت دیا تھا اور اس کے ساتھ رہا تھا۔ یہ بات ان دونوں کو اچھی نہیں لگی، مجھے آج تک ان کا چہرہ یاد ہے، نامہربان، سخت اور حیران چہرہ۔ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ میں نے اینڈریو کو ان سے چھین لیا ہے۔ گویا بچہ میرے پاس دوڑتا ہوا اپنا زخم دکھانے نہیں آیا تھا بلکہ ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا تھا۔ آج کل کے رشتوں میں تحفظ کا احساس نہیں ہے، بے لوث محبت نہیں ہے، محبت، چاہ، اُلفت سب کی قیمت ہے۔ ہر ایک کچھ واپس مانگتا ہے اور فوراً واپس مانگتا ہے۔ اینڈریو تو ان کا بچہ تھا، ان کا بچہ ہے، ان کا اپنا ہے۔ وہ تو میری طرف اس لیے آیا تھا کہ چند دنوں کے لیے میری بھرپور توجہ اس کی طرف تھی۔ ورد کے اس لمحے میں اس معصوم کے ذہن میں صرف میری ہی گرم گود تھی کیوں کہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ میں ہی اسے بھرپور اور مکمل توجہ دے سکوں گا۔ اتنی سی بات سے رشتے تھوڑی بدل جاتے ہیں، دھماکے تھوڑی ٹوٹ جاتے ہیں مگر وہ دونوں یہ برداشت نہیں کر سکے تھے۔

”مجھے وہ گھر اجنبی لگا۔ میں روتے ہوئے اینڈریو کو چھوڑ کر واپس انگلینڈ آ گیا۔ مجھے ابھی تک وہ چہرہ یاد ہے، معصوم اور آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے۔ اب تو اینڈریو بڑا بھی ہو گیا ہوگا اور شاید مجھے بھول بھی گیا ہوگا، شاید کبھی ملاقات ہو تو پہچانے بھی نہیں لیکن مجھے وہ سب پیارے ہیں اور مجھے اب بھی ان سے پیار ہے، بے انتہا، بے شمار، بے غرض اور غیر مشروط۔“

میں بوڑھے جان سے نہیں کہہ سکا کہ وقت بدل گیا ہے، اقدار بدل گئی ہیں، یہ جدید دنیا ہے۔ اس جدید دنیا کے اپنے اصول ہیں، تازہ اور نئے۔ تم ایک پرانی دنیا کے، پرانی اقدار کے بے لوث، بے غرض انسان ہو، تم مر جاؤ اس سے پہلے کہ تمہیں اور دکھ ہوں، اور غم ہوں۔

پھر وہ دن آ گیا جب میرا کام برطانیہ میں ختم ہو گیا اور ہم لوگوں کے واپس آنے کا وقت آ گیا۔ میری اور نسیم کی توقعات کے خلاف، جان نے بڑے حوصلے سے ہم لوگوں کو انجم سمیت رخصت کیا۔

اس نے ہمارا سامان باندھا، میرے لیے، نسیم کے لیے

آصف علی اپنا افسانہ ”ارروپے“ آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ آواز میرے کانوں سے ٹکرائی اور پھر آصف کی آواز میں نے فوراً پہچان لی۔ یہ وہی آصف تھا جس سے میں نے ۱۰ ارروپے ادھار لیے تھے۔ وہ افسانہ سُنا رہا تھا اور میں خود کو زمین میں گڑتا محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے افسانے میں اُنہی ۱۰ ارروپوں کو موضوع بنایا تھا جو اُس نے مجھے ادھار دیے تھے۔ اُس نے اُن تمام ملاقاتوں کا اُس میں ذکر کیا جو میری اور اُس کی کالج چھوڑنے کے بعد ہوئی تھیں۔ میں افسانہ سنتا جاتا تھا اور خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ میں تو اپنے خیال میں یہ سمجھ رہا تھا کہ آصف اُن روپوں کو بھول چکا ہو گا مگر آج حقیقت کا فسانہ بنتے دیکھ کر مجھے بڑی تلخی اور غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ صبح جا کر سب سے پہلا کام یہ کروں گا کہ وہ ۱۰ ارروپے جا کر آصف کو دے آؤں گا۔ اگلے روز صبح میں گھر سے نکلا اور سیدھے آصف کے گھر کی راہ لی۔ جب میں وہاں اُس کے گھر پہنچا تو دیکھا۔ وہاں اُن کے مکان کے باہر کئی آدمی ایک دری پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ رات آصف سکوٹر پر ریڈیو اسٹیشن سے گھر واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ایک ٹرک سے اُس کی ٹکر ہو گئی اور وہ موقع پر ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ میرے دل میں ایک ٹیس سی اُنھی ۱۰ ارروپے کا نوٹ میری جیب میں مجھے آگ کی طرح جلا رہا تھا۔ میں واپس مڑا۔ بازار کی ٹکڑ پر ایک پھولوں والے کی دکان تھی۔ میں وہاں سے ۱۰ ارروپے کے پھولوں کے پار لیے اور دوبارہ آصف کے مکان پر آیا۔ اُن کے گھر میں کھرام مچا تھا۔ جوان بیٹے کی موت نے اُس کے والدین سے اُن کے بڑھاپے کا سہارا چھین لیا تھا۔ لوگ آرہے تھے اور اُن سے تعزیت کر رہے تھے اور میت کو غسل دیا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میت کو جنازے کے لیے مکان سے باہر لایا گیا اور مسہری کو گلی میں رکھ دیا گیا۔ قریب جا کر دیکھا آصف سفید کفن اوڑھے ابدی نیند سو رہا تھا۔ میں نے وہ پھولوں کے ہار آہستہ سے اُس کی میت پر رکھ دیے اور گرفتہ دل ۱۰ ارروپے کا بوجھ لیے واپس لوٹ آیا۔

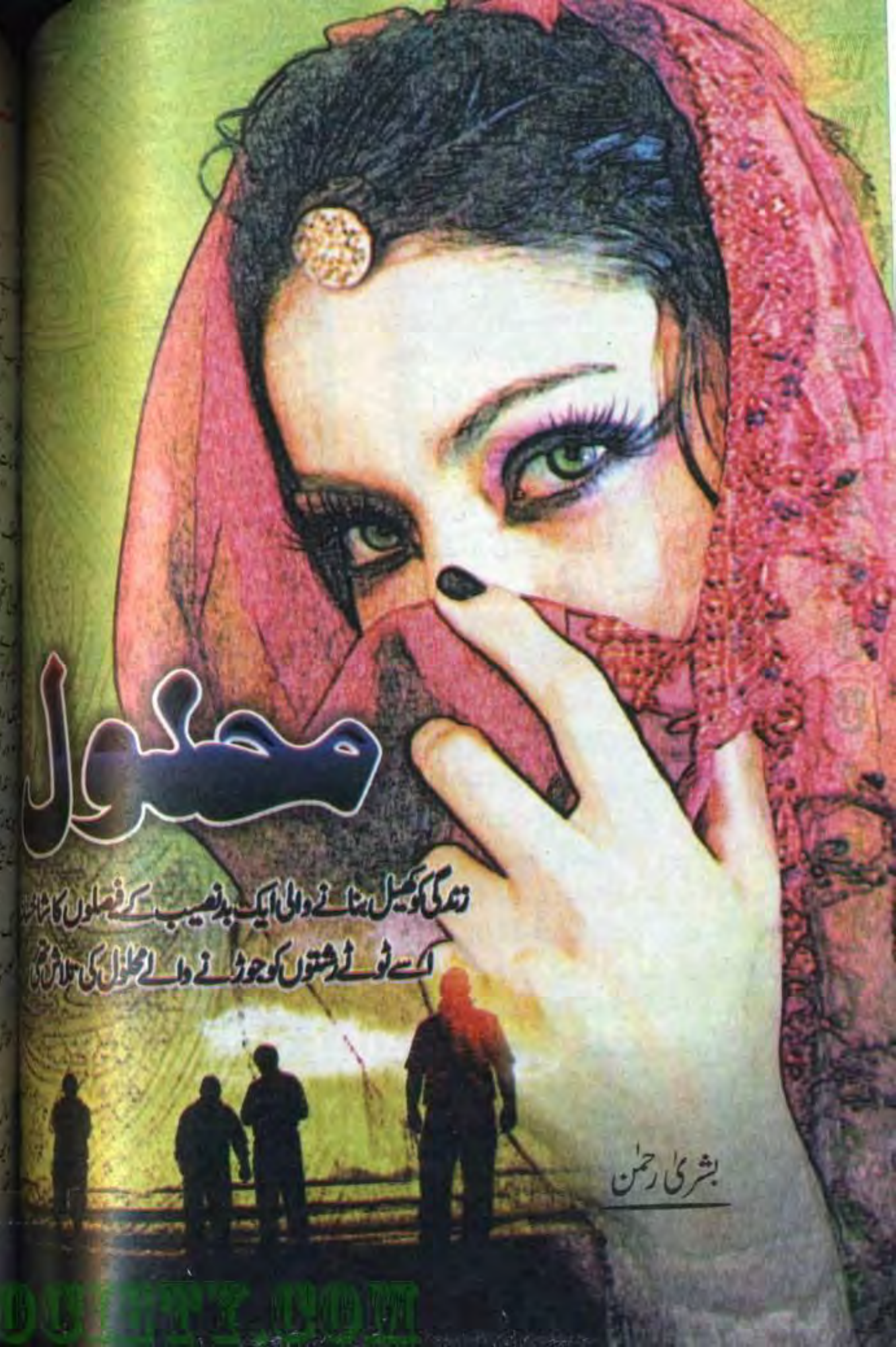
میں نے اُس سے ادھار لیے تھے۔ میری جیب میں ۱۰ ارروپے تھے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اُس سے پے کا ذکر مناسب نہیں۔ میرے خیال میں اُس کا بھول چکا تھا یا شاید مروتا تقاضا نہ کر رہا تھا۔ یہ ہے کہ اُس سے اُس کے گھر کے گھر کے گھر کا پتا معلوم کر لیا تھا پھر میں نے اُس میں پھر بھول گیا کہ مجھے کسی کا ادھار دینا ہے۔ ایک دن میں کسی کام سے بازار سے گزر رہا تھا کہ مجھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کر دیکھا تو آصف تھا۔ اب پھر مجھے اُن ۱۰ ارروپوں کا خیال سے ذکھ کی بات یہ تھی کہ میری جیب میں جتنی رقم ہے وہیں گھر سے لے کر آیا تھا۔ وہ میں نے خریداری کے لیے کر دی تھی اور چند روپے جیب میں باقی تھے۔ میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ اُس سے میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ آصف نے یاد دلایا تھا کہ میں نے اُس کے گھر آنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے اُس سے پکا وعدہ کر لیا کہ عنقریب اُس کے گھر آؤں گا۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اُس کو وہ ۱۰ ارروپے یاد نہیں رہے مگر میں پھر بھی خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ اب یہ بات نہیں کہ میں اُسے یہ پیسے لوٹانا نہیں چاہتا تھا۔ اس بات یہ تھی کہ جب بھی اُس سے ملاقات ہوتی تھی تو قسمت میری جیب میں اُس وقت ۱۰ ارروپے بھی نہ ہوتے تھے۔ پھر ایک دن وہ مجھے بازار میں مل گیا۔ وہ جلدی کرتا تھا۔ اس نے مجھے صرف یہ بتایا کہ اُسے یونیورسٹی میں داخل کیا ہے۔ جاتے جاتے اُس نے پھر مجھے یاد دلایا کہ میں نے اُس کے گھر آنے کا وعدہ پورا نہیں کیا۔ مجھے اب بات کا مکمل یقین ہو چکا تھا کہ اُن ۱۰ ارروپوں کی یاد اُس کے بالکل محو ہو چکی ہے۔ اس لیے تو کبھی بھی اُس کا ذکر نہیں کیا۔ اس ملاقات کے چند ہی روز بعد میں گھر پر لیٹا ریڈیو سن رہا تھا۔ ”یونیورسٹی میگزین“ آ رہا تھا طلبہ اپنی نگارشات سُنا رہے تھے۔ اب

مورت کو لوگ خوش قسمت کہتے ہیں
مگر اس کی بے شمار بد نصیبیاں بھی
ہوتی ہیں۔ پہلی بار سن رہی ہوں۔“
وہ بولی!

پہلی بار سن رہی ہوں۔
مورت کی میں بہت سی باتیں بندہ پہلی بار ہی
سنے پرے چہرے کو غور سے دیکھا اور بولی! کیا
تپ ڈالی حجر بے کی بنا پر کہہ رہی ہیں؟
پہلے ذات اور پھر کائنات..... ذات
جس سے آپ کائنات کو اور پھر رب
کو سمجھنے لگتے ہیں۔“
”جی! اتنی مشکل باتیں مت کرو میں کسی صوفیانہ
مذہب میں نہیں آئی۔“

تہذیبی ملاقات پیشہ شہر کے ایک خوشنما پارک میں
اپنی بوتیک شاپ میں بیٹھے بیٹھے میری کمر کے
میں دیکھنے لگے تھے اور ڈاکٹر کا مشورہ تھا، میں روزانہ
کم از کم ایک گھنٹہ واک کروں۔ اتنی مصروف زندگی
میں روزانہ تو نہیں آسکتی تھی..... مگر ہفتے میں دو چار بار
آجاتی۔ یہاں بھی ایک نظارہ ہوتا۔ ہر عمر کے لوگ،
بچے، لڑکے، لڑکیاں، بڑے، چھوٹے، کالج اور
یونیورسٹی سے بھاگے لڑکے لڑکیاں ہمیشہ کوئی ایسا کنج ڈھونڈ
تے تھے جہاں دکھائی بھی نہ دیں اور سنائی بھی نہ دیں۔
دوستوں کے غول الگ..... عورتوں کی ٹولیاں
میرے جیسے تنہا مگر تنہائی سے اکتائے ہوئے عام
مردم شاہد پر ہی گزارا کرتے ہیں۔

میری بھی اس بے اماں سی بھیڑ میں عاشق معشوق کو
تکلیف دینا بہت آسان ہو جاتا ہے۔
تابانہ نے میری نظر کی چوری پکڑ لی تھی..... ایک
دعا سے میں اس حسینہ کو تازہ ادا کے ساتھ جو گنگ کرتے
پہلے ایک سمارٹ سا مرد اس کا پیچھا کرتا
پھر دونوں ساتھ ساتھ چلتے نظر آئے۔
چلتے چلتے وہ دونوں ایک دوسرے میں کھو جاتے.....



محول

تم کی کوئیل بنانے والی ایک بد نصیب کے قصوں کا مجموعہ
اسے ٹولے رشتوں کو جوڑنے والے محلول کی تلاش میں

بشری رحمن

اور انھیں ارد گرد گزرنے والوں کی موجودگی کا احساس ہی نہ
ہوتا..... یہ شوہر بیوی نہیں ہو سکتے۔ شوہر بیوی ہاتھ پکڑ کے
بھی چل رہے ہوں تو ان کے چہروں پر کیف و سرور کا ایسا
اجالا نہیں ہوتا جو ان دونوں کے چہرے پر ہوتا تھا.....
کچھ عرصہ بعد ان دونوں کو والہانہ انداز میں ایک
دوسرے کا انتظار کرتے پایا۔ ایک آ جاتا تو دوسرے کے
انتظار میں کسی درخت کے سائے میں کھڑا بار بار فون کرتا۔
کلائی کی گھڑی دیکھتا۔ ایک دن اچانک شدید بارش ہو
گئی۔

میں درخت کے سائے میں رکھے بیچ پر آ کر بیٹھی
ہی تھی کہ دوسری طرف سے وہ بھی آ کر بیٹھ گئی۔
تعارف میں، میں نے پہل کی کیونکہ میرا تجسس مجھے
اکسار ہا تھا.....

اس طرح آنے والے دنوں میں ہم ایک دوسرے کو
ہیلو ہیلو کہنے لگے۔ کبھی کبھی باتیں بھی کرنے لگے.....
ایک دن جب وہ درخت تلے کھڑی انتظار کی
آگ میں جل رہی تھی۔ میں دانستہ رک گئی اور معصوم
شکل بنا کر پوچھا:

”آج آپ کے شوہر ساتھ نہیں ہیں؟“ وہ کھلکھلا
کے ہنس پڑی.....
”آپ ہنستی ہوئی بھی بڑی اچھی لگتی ہیں مگر میری
بات کا جواب نہیں دیا آپ نے.....“
وہ میرے شوہر نہیں ہیں۔

”تو کیا آپ کے عاشق ہیں.....“ بے ساختہ میں
نے کہا۔
اس نے حیران آنکھوں سے کچھ کہنے کے لیے منہ
کھولا..... پھر ہنس پڑی۔

”اب مجھے صرف آپ کی آبروروشن کی داد دینی
چاہیے۔“ وہ مستی میں آ گئی۔
”میں ایک سال سے آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ بھلا
کون ہے جو یہاں آپ کو نہیں دیکھتا۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے
شاید اسی لیے بنایا ہوگا۔“ میں نے کہا

”میں آپ سے دوبارہ ملوں گی۔“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ”مجھے ایک ایسے صلاح کار کی ضرورت تھی۔ آپ اپنے بارے میں بتائیں پلیز.....!“

میں نے اسے بتایا کہ میں گزشتہ ۱۰ سال سے ایک بوتیک چلا رہی ہوں اور ایک ہینڈی کرافٹس انڈسٹری کا سکول کھول رکھا ہے۔ وہاں لڑکیوں کو کام سکھاتی ہوں اور ان کے بنائے ہوئے کپڑے بوتیک شاپ پہنکھ کے سیل کر دیتی ہوں۔

ایک ہفتے بعد وہ میری بوتیک میں آگئی، خوب گپ شپ ہوئی..... اس نے مجھے اپنی ساری پتلا سنا دی کہ اس کا شوہر سخت گیر، شکی، تنگ نظر، بد زبان اور بے حس بھی ہے۔

شابانہ! ذرا انصاف کرو جس مرد کی بیوی اتنی حسین ہو جتنی تم ہو اسے تو حاسد اور سخت گیر ہونا چاہیے۔“

”سنو تابانہ! مرد کو خطرہ ہمیشہ کسی دوسرے مرد سے ہوتا ہے۔ مرد کی نگاہ بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ وہ جب بھی کسی خوبصورت عورت کو دیکھتا ہے تو یہ محض دیکھنا نہیں ہوتا، اس تحسین و آفرین کے اندر چاہ بھی ہوتی ہے بلکہ بعض مرد تو حسین عورت کو پہلی بار ہی اس والہانہ چاہت سے دیکھتے ہیں جیسے نگاہ کے شیشے میں اتار کر لے جائیں گے.....“

”مرد، خود مرد کی فطرت سے آگاہ ہوتا ہے اسی لیے خوبصورت بیوی کو اپنی نظر کے پنجرے میں رکھتا ہے، وہ اپنی بیوی کے ساتھ جان بوجھ کر بے حسی اختیار کرتا ہے..... کبھی بھی دانستہ معمولات کے علاوہ مخصوص حالات میں بھی صرف اسے یہ باور کرانے کے لیے کہ وہ انوکھی نرالی مخلوق نہیں ہے، عام سی عورت ہے بیوی بن کر رہے.....“

”وہ اس کی نفی کر کے اس کے پر پرزے کاٹتا رہتا ہے کیونکہ اس کے اندر کا آدمی احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

وہ بھی سچی تھی، کہنے لگی ”ان ختیوں اور پابندیوں کی

کوئی حد ہونی چاہیے۔ آخر عورت بھی انسان ہے۔ کہاں سے لائے کہ بس سستی ہی رہے۔“

”کتنے سال ہوئے تمہاری شادی.....“

نے پوچھا۔

بولی! میری بیٹی سولہ سال کی ہے اور اس سال کا! میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”جانم! یہ ۱۸، ۱۷ سال تو تمہارے لیے سایہ ڈالے بغیر گزر گئے ہیں یہ بھی تمہاری بدقسمتی ہے کہ تم جوان بچوں کی ماں نہیں لگتی ہو۔ کیا کر سکتے ہو ہر بچارا.....“

”بھاڑ میں جائے.....“ وہ جل کر بولی۔

تاہم اس معاملے میں اب زیادہ بحث کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کے ایک دیرینہ دوست نگاہیں اس کے پندار اور پنڈے میں دور تک اتر گئی اور وہ ۱۸، ۱۷ سالہ ازدواجی زندگی کی ساری بدحواسی ساری کڑواہٹیں، بہتان، الزام اور ناانصافیاں میرے دل میں لے آئی تھی۔

اگر میں پارک میں نہ جاسکتی تو وہ میری بوتیک میں جاتی..... اور ہر نئی مہم کا قصہ چسکے لے لے کر سناتی۔

”سنو تابانہ!“ ایک دن پھر میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تاب کہو تاب..... تاب! وہ مجھے تاب کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کون تمہاری تاب لاسکتا ہے؟“

”اور کیا کہتا ہے!“

”اُف..... کیا وہ میں بتا سکتی ہوں، ہرگز نہیں۔“

”تابانہ بی بی.....! مرد ازلوں سے قانع ہے۔ جب تک فتح نہ کرے چین سے نہیں بیٹھتا، فتح کرنے کے سارے داؤ پیچ اسے آتے ہیں۔ پرانے وقتوں کی بات پڑھ کر دیکھ لو۔“

”بیٹھے بیٹھے چڑھائی کو اٹھ دوڑتا ہے اور تھک تاراج کر کے رکھ دیتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ

”میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک سال میں وہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اس کی اداؤں میں نکھار آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا

تھا..... اس کی باتوں سے پھول جھڑنے لگے تھے۔ ملبوسات کے رنگ بدلنے لگے تھے۔

ایک بار میں نے پوچھا:

”یہ تبدیلیاں تیرے شوہر کی نظر میں نہیں آتیں؟“

کہنے لگی ”معلوم نہیں..... مگر اس کا رویہ کچھ بدلنے لگا ہے۔“

”کیوں.....!“

”شاید بچوں کی وجہ سے.....“

”تمہیں بچوں کا خیال نہیں آتا؟ جب بچے جوان ہو جاتے ہیں ہمارا خیال کرتے ہیں۔ جب ان کے خوابوں کا موسم آتا ہے تو ایک جھٹکے سے ماں باپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ ان کی ماں نے پھولوں بھری جوانی تنور کے دہانے پر گزار دی تھی۔ پھر بھی دنیا بھر میں بچوں کی خاطر ایثار تو مائیں ہی کرتی ہیں۔“

”کس کارن؟“

آخری عمر بچوں کے سہارے ہی گزرتی ہے.....

”میں ایسی ماؤں کی نمائندہ نہیں ہوں۔ عمر اپنی ذاتی میراث ہوتی ہے جیسے گزائیں گزرتی ہے اور بچوں کا کیا ہے..... ہر مرد میں سے پیدا کیے جاسکتے ہیں۔“

”اور تمہارے شوہر میں جو تبدیلی آرہی ہے؟“

”It is too late now.....“ اس نے ادا سے اتر کر کہا۔

میں سوچنے لگی، یہ وہ پہلے دن والی تابانہ نہیں ہے۔ جو ڈرتی جھجکتی میری بوتیک میں داخل ہوئی تھی۔ اب اس کے ہاتھ میں کار کی چابی تھی جس کا چھلہ وہ اپنی دو انگلیوں میں اس طرح گھما رہی تھی جیسے کہ شوہر کو کس بل دے رہی ہو۔

”تو اب تمہیں کار چلانے کی اجازت بھی مل گئی ہے۔“

”ہاں بھئی ہاں..... اب وہ بندے کا پتر بن گیا ہے۔ ان مردوں کے ساتھ مقابلے پر آؤ تو سیدھے ہو جاتے ہیں.....“ اس نے جاندار قبضہ لگایا۔ ”لیکن اب میں پہلے

”میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک سال میں وہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اس کی اداؤں میں نکھار آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا

”میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک سال میں وہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اس کی اداؤں میں نکھار آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا

”میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک سال میں وہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اس کی اداؤں میں نکھار آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا

”میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک سال میں وہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اس کی اداؤں میں نکھار آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا

”میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک سال میں وہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اس کی اداؤں میں نکھار آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا

”میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک سال میں وہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اس کی اداؤں میں نکھار آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا

”میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی نے ایک سال میں وہ کئی مرتبہ میرے پاس آئی۔ رفتہ رفتہ میں نے دیکھا اس کی اداؤں میں نکھار آ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار آ گیا

والی تابانہ نہیں ہوں۔ مرگئی وہ عورت..... راتوں کو رو رو کر اور دنوں کو جل جل کر..... یہ..... یہ۔ اس نے سینے پر انگلی رکھی یہ ایک نئی عورت ہے۔“

ایک دن آئی تو کچھ پریشان سی تھی۔ کہنے لگی ”میرے شوہر نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے..... وہ کئی دن سے میرا پیچھا کر رہا تھا۔“

”ارے.....“ میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بیٹھتے ہی بولی: ”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے پتا لگنا تھا..... سارے گھر میں بھونچال آ گیا ہے۔“

”پھر.....!“

”میں بھگتوں گی.....“

”اور تمہارے بچوں کا کیا رد عمل ہے؟“

”بچوں کو شوہر نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ ان کو تو اب میرے ساتھ بات کرنے کی اجازت بھی نہیں۔“

”بچوں کا یہ رویہ برداشت کر لو گی۔ اوہو: بچوں کا کیا ہے۔ دونوں میں سے جو بھی زندگی کی آسائشیں پیش کر دے۔ اس کے ہو جاتے ہیں۔“

اگلی ملاقات میں اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ اس نے تنہی نکاح کا دعویٰ کر دیا ہے۔

میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا..... کہ یہ ایک تپتی ہوئی خواہش ہے جو شوہر کے رویے کا انتقام لینے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ یہ محبت نہیں ہے۔ وہ سر جھٹک کر بولی: ”اب میں بہت آگے نکل آئی ہوں، اتنی کہ قدموں کے نشان ہی مٹ گئے ہیں۔ واپسی کیسی.....!“

”تابانہ! ایک قید قضا سے آتی ہے، ایک رضا سے..... قضا و قدر کی قید میں تو بندے کو چھوٹ مل جاتی ہے مگر جو اپنی رضا سے گلے میں پھندہ ڈالا جاتا ہے اس سے رہائی ممکن نہیں ہوتی۔“

وہ غصے سے کھڑی ہوئی اور پیر پکتی ہوئی باہر نکل گئی.....

پھر پتا نہیں کہاں چلی گئی..... بس اس کے بارے

میں دو چار خبریں سنیں۔ تین سال کے بعد آج اچانک وہ میری شاپ میں آ گئی..... میں نے پہچان تو لیا مگر پہچان گئی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے ایک بہت سی چیزیں کپڑے کو بار بار بے پرواہی سے دھویا جائے..... جاتا ہے، بد رنگ ہو جاتا ہے، بے آب ہو جاتا ہے بوسیدہ اور بے شکا لگنے لگتا ہے.....

کار کی چابی! آج بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ گھماتی خود ہی بیٹھ گئی۔ ”ایک عرصہ بعد آئی ہو لیا۔“

”کرو گی.....؟“

”حال بھی نہیں پوچھو گی.....؟“

”نظر آ رہا ہو تو کیا پوچھوں.....؟“

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی..... وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی اور سچی بات ہے خود میں اسے دیکھ کر ساکت ہو گئی تھی۔ ایک شاندار مینار کو بھر بھرا ہوا دیکھنا صدمے کا باعث ہو سکتا ہے۔

”مجھے یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟“ وہ بھڑک اٹھی۔ خوبصورت عورت کی بے شمار بد نصیبیاں بھی ہوتی ہیں..... ہوتی ہیں پھر..... آگے تم نے نہیں بتایا..... میں بتاتی ہوں۔

رؤف کا عشق ایسا نہیں تھا کہ میں اس کے سرے نکل جاتی۔ طلاق لے لی۔ اس نے مجھے ایک فلیٹ میں جا بسایا..... اور عشق میں عذر لے آیا کہ..... ”میرا سر اثر و رسوخ والا ہے، نہ بیوی کو طلاق دینے دے گا نہ دوسری شادی کے بعد چین سے رہنے دے گا۔ سو تھوڑا سا وقت کا انتظار کرنا پڑے گا..... یوں وہ آتا رہا۔ میرے صبح و شام سجاتا رہا..... وہ سب ہونے لگا جو نہیں ہونا تھا..... ایک سال کے اندر اس نے اپنی تھکاوٹ اتار لی۔“

”تم نے یہی کیا تھا نا کہ کفالت کے بوجھ سے تھا ہوا مرد بس منہ ماری کرنا چاہتا ہے.....“

”ہمارا ایک مشترکہ دوست تھا، سلمان..... وہ ہمدردی

میں دو چار خبریں سنیں۔ تین سال کے بعد آج اچانک وہ میری شاپ میں آ گئی..... میں نے پہچان تو لیا مگر پہچان گئی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے ایک بہت سی چیزیں کپڑے کو بار بار بے پرواہی سے دھویا جائے..... جاتا ہے، بد رنگ ہو جاتا ہے، بے آب ہو جاتا ہے بوسیدہ اور بے شکا لگنے لگتا ہے.....

کار کی چابی! آج بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ گھماتی خود ہی بیٹھ گئی۔ ”ایک عرصہ بعد آئی ہو لیا۔“

”کرو گی.....؟“

”حال بھی نہیں پوچھو گی.....؟“

”نظر آ رہا ہو تو کیا پوچھوں.....؟“

تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی..... وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتی رہی اور سچی بات ہے خود میں اسے دیکھ کر ساکت ہو گئی تھی۔ ایک شاندار مینار کو بھر بھرا ہوا دیکھنا صدمے کا باعث ہو سکتا ہے۔

”مجھے یاد ہے تم نے کیا کہا تھا؟“ وہ بھڑک اٹھی۔ خوبصورت عورت کی بے شمار بد نصیبیاں بھی ہوتی ہیں..... ہوتی ہیں پھر..... آگے تم نے نہیں بتایا..... میں بتاتی ہوں۔

رؤف کا عشق ایسا نہیں تھا کہ میں اس کے سرے نکل جاتی۔ طلاق لے لی۔ اس نے مجھے ایک فلیٹ میں جا بسایا..... اور عشق میں عذر لے آیا کہ..... ”میرا سر اثر و رسوخ والا ہے، نہ بیوی کو طلاق دینے دے گا نہ دوسری شادی کے بعد چین سے رہنے دے گا۔ سو تھوڑا سا وقت کا انتظار کرنا پڑے گا..... یوں وہ آتا رہا۔ میرے صبح و شام سجاتا رہا..... وہ سب ہونے لگا جو نہیں ہونا تھا..... ایک سال کے اندر اس نے اپنی تھکاوٹ اتار لی۔“

”تم نے یہی کیا تھا نا کہ کفالت کے بوجھ سے تھا ہوا مرد بس منہ ماری کرنا چاہتا ہے.....“

”ہمارا ایک مشترکہ دوست تھا، سلمان..... وہ ہمدردی

امام ابو یوسف کی گواہی

امام ابو یوسف لکھتے ہیں کہ میرے استاد پرہیزگار، فیاض، خاموش رہنے والے، مہمان نواز، کثرت سے احسان کرنے والے، دھیمے لہجے میں بات کرنے والے، آدھی رات سونے اور آدھی رات عبادت کرنے والے تھے۔ کوفے میں ان کی درس گاہ تھی۔ انھوں نے آنحضرتؐ کے ۸ صحابہ کو دیکھا۔ ان کی درس گاہ میں کئی کئی سوطلبہ حاضر رہتے تھے۔ ایک بار راہ میں جاتے ہوئے کسی عورت نے دوسری عورتوں سے کہہ دیا ”یہ امام ابو حنیفہ ہیں۔ جانتی ہو پوری پوری رات اپنے رب کی عبادت کرتے ہیں۔“ اس واقعہ کے بعد راتوں کو ان کا معمول بدل گیا۔ اب وہ پوری پوری رات عبادت کرتے۔ شاگرد عزیز نے معمول بدلنے کی وجہ پوچھی تو کہا ”مجھے شرم مانع ہوئی کہ میرے بارے میں جو مشہور ہے مجھے ویسا تو ضرور ہونا چاہیے۔ اس موقع کو غلط نہیں ہونا چاہیے۔“ کل کسی ایک شاگرد کو تو امام ابو یوسف کی طرح میری آپ کی گواہی یوں دینی چاہیے۔

(”ڈننگ لائن پر کون پہنچاتا ہے“ سے ایک اقتباس صفحہ ۸۹)

فون کرنے کی غرض وغایت بتا کر کہہ:

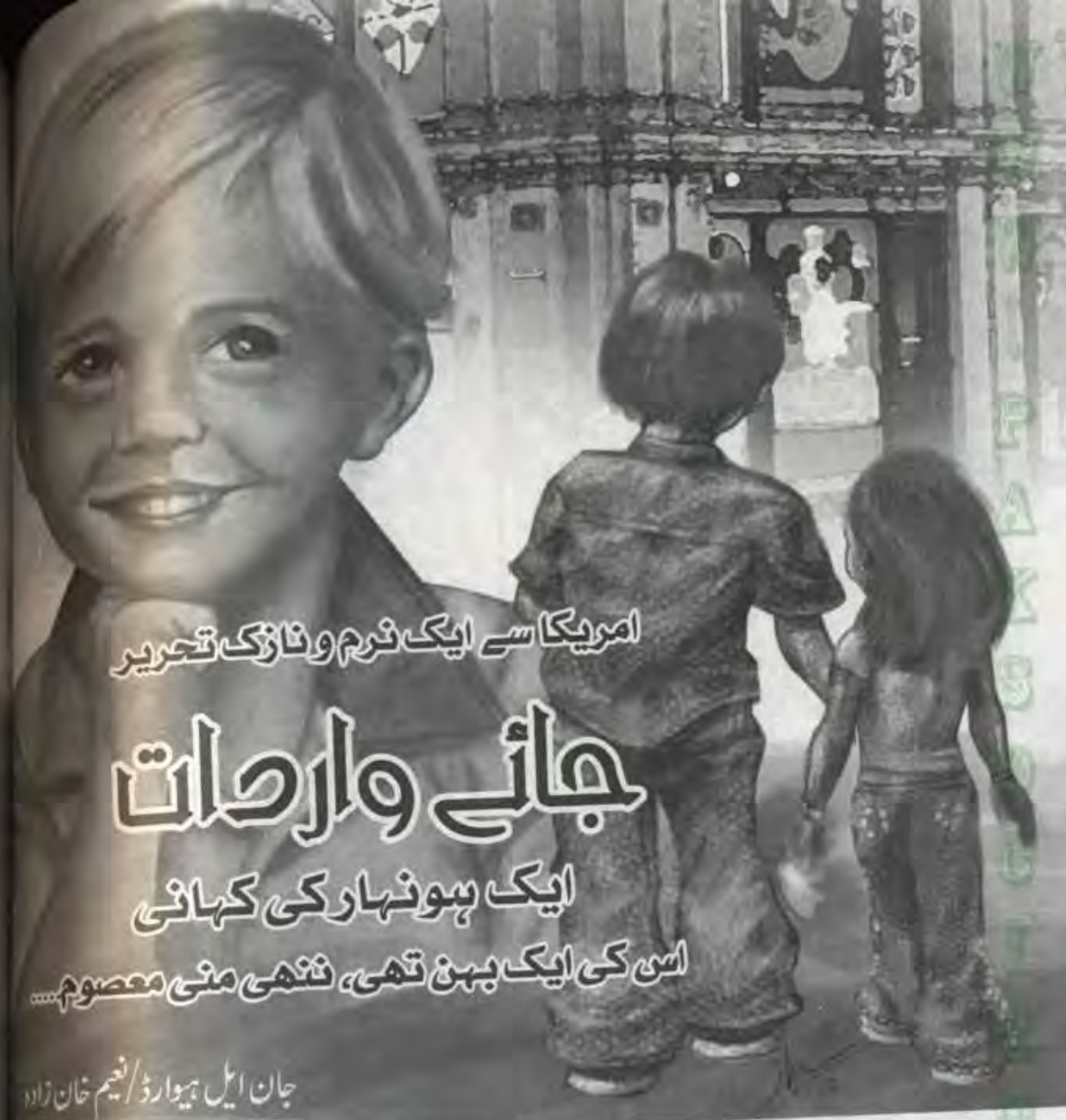
”بٹی سے بات کرادو.....!“

اس نے خود بات نہیں کی بلکہ فون کے قریب آ کر چیخ چیخ کر بولی..... کہہ دو اس عورت سے مجھے اپنی منحوس شکل نہ دکھائے، میری ماں مر گئی تھی۔ مجھے اس کے بدشگون تحفوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اسے کہہ دو وہ خصم بدلنے کا شغل جاری رکھے۔

خبردار! اگر پھر کبھی فون کیا تو..... نہ میری ازدواجی زندگی پر اپنی پرچھائیں ڈالے۔

”اچھا..... پھر اس کی آواز کنوئیں میں چلی گئی..... رندھے ہوئے گلے سے بولی! تمہارا تو بہت تجربہ ہے زندگی کا..... یہ تو بتاؤ کیا دنیا میں ٹوٹے ہوئے رشتے جوڑنے کا کوئی محلول کوئی سلیوشن ہے؟“

179 | urdudigest.pk | جنوری - 2013



امریکا سے ایک نرم و نازک تحریر

جائے وارسات

ایک ہونہار کی کہانی

اس کی ایک بہن تھی، ننھی منی معصوم۔۔۔

جان ایل ہیوارڈ / نعیم خان زاہد

اسٹور
کا سراغ رساں ہنری گرمی کی شدت سے بوکھلایا ہوا تھا۔ پسینے کے قطرے کمر سے چپکی ہوئی پتلون میں جذب ہو رہے تھے۔ وہ کوٹ، قمیص اور جوتے اتار دینا چاہتا تھا مگر یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کے چھوٹے سے کمرے میں دو بچوں کے علاوہ دو خواتین بھی موجود تھیں۔
کتابی چہرے والی عورت موسم کے اعتبار سے کچھ زیادہ

ہی کپڑے پہنے ہوئے تھی، گرمی کا اثر بھی اسی پر زیادہ تھا۔ وہ مسلسل طعنہ زنی کر رہی تھی حالانکہ اس کا دس ڈالر کا نوٹ اس کے پرس میں واپس پہنچ چکا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو نوٹ کی واپسی پر صبر و شکر سے معاملہ رفع دفع کر کے گھر کی راہ لیتا۔ ”یہ مسئلہ یوں ہی درگزر نہیں کیا جاسکتا۔“ عورت ہنری کی آنکھوں میں گھستے ہوئے بولی۔ ”یہ لڑکا چور ہے، اسے ایسا سبق ملنا چاہیے کہ اس سے آئندہ اس قسم کی حرکت سرزد نہ ہو، آف میرے خدا، یہ عمر اور ایسی دیدہ دلیری۔“ کمرے

میں ایک نرم لڑکا اپنی ننھی سی بہن کے ساتھ موجود تھا۔ ”لڑکا، اسے دیکھو کہ یہ اتنی بھیڑ بھاڑ کے علاقے میں اپنی ماں کی بدلت سے آیا ہے۔ میں سمجھتی ہوں، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ عورت کی زبان تیزی سے چلتی رہی۔ ”آپ ایسے حالات میں کیا کرتے ہیں جناب سراغ رساں صاحب؟“ ہنری نے بیزار سی کاندھے اچکائے۔ پولیس کے کمرے سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ گزشتہ پانچ سال سے یہاں ملازم تھا۔ اپنے طویل تجربے سے اس نے یہ سمجھا تھا کہ ہر معاملہ نوعیت کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے لہذا تمام واقعات کے لیے تفتیش کا کوئی معین طریقہ اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے عورت سے کہا۔ ”دیکھیے محترمہ! یہ ایک واضح مگر پیچیدہ قصہ ہے۔ کیا آپ نے لڑکے کو نوٹ اٹھاتے ہوئے دیکھا تھا؟“

”نہیں“ مدعیہ نے جواب دیا۔ ”میں نے دیکھا نہیں تھا مگر اس نے نوٹ اٹھانے کا اعتراف کیا ہے۔“

کاؤنٹر کلرک مسز ہیمز نے بھی لڑکے کو نوٹ اٹھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہنری کے ذہن میں یہ سوال چبھ رہا تھا کہ مدعیہ اور مسز ہیمز دونوں عاقل و بالغ عورتیں ہیں، انہوں نے دس ڈالر کا نوٹ اس طرح کیوں چھوڑ دیا تھا کہ کوئی بھی اسے آسانی سے اٹھا لے۔ ملزم لڑکا بہت ڈرا ہوا تھا لیکن اس کے چہرے سے مستقل مزاجی ظاہر ہو رہی تھی، یہ بات ہنری کو پسند آئی۔ مدعیہ نے کہا۔ ”مسٹر ہنری! اگرچہ میں نے اسے نوٹ اٹھاتے ہوئے دیکھا نہیں لیکن جیسا کہ میں بتا چکی ہوں، میں اپنی ضرورت کی چیزیں لینے کے بعد ان کی قیمت ادا کرنے کے لیے کاؤنٹر پر آئی، میں نے دس ڈالر کا نوٹ نکال کے کاؤنٹر پر رکھا پھر اچانک کچھ یاد آنے پر نوٹ واپس چھوڑ کر دوبارہ اسٹور کے اندر چلی گئی، اسٹور سے میں نے ایک چیز اور لی پھر فوراً واپس آئی لیکن اتنی دیر میں نوٹ غائب ہو چکا تھا۔ یہ لڑکا اور چھوٹی لڑکی کاؤنٹر سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میرا نوٹ لڑکے کے ہاتھ میں ہے۔“ اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے لڑکے کی طرف دیکھا۔ ”کیوں لڑکے! میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

لڑکے نے اقرار میں سر ہلایا۔ اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا۔

”تمہاری عمر کیا ہے مسٹر؟“ ہنری نے اس سے پوچھا۔ لڑکے نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر دھیرے سے بتایا۔ ”۸۔“

پھول کی طرح معصوم چھوٹی بچی لڑکے کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔ اس کے سنہرے بال ربر بینڈ سے پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ اس کا سرسوں کے رنگ کا لباس موسم بہار کی علامت تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں ہنری کے چہرے پر تھیں۔ ہنری نے لڑکے سے سوال کیا۔ ”تمہاری بہن کتنے سال کی ہے؟“

”۳ سال کی۔“

”تم نے نوٹ کیوں اٹھایا تھا؟“ ہنری نے نرمی سے پوچھا۔

لڑکے نے ہنری کی پرانی میز پر ایک نظر ڈالی۔ ”پتا نہیں۔“ وہ زیر لب بولا۔

ہنری ایک لمبی سی سانس لے کے کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ نہ معلوم لڑکے نے نوٹ کیوں اٹھالیا، گرمی کی وجہ سے اسے آس کریم کھانے کی خواہش ہو رہی ہوگی یا کسی ٹھنڈے مشروب کی۔ مدعیہ کبھی لڑکے کو گھورتی، کبھی ہنری کو۔ ہنری نے اس کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے لڑکے سے دریافت کیا۔ ”تم اسٹور میں کیوں آئے تھے؟“

وہ چند ثانیے چپ رہا پھر بولا۔ ”کھلونے دیکھنے۔“

”تلمین (ٹرین) دیکھنے۔“ ایک باریک آواز ابھری۔

ہنری نے باریک آواز والی پیاری سی بچی پر نظر ڈالی اور سوچا، شاید یہ کھلونا ٹرین کا ذکر کر رہی ہے۔ اس نے کاؤنٹر کلرک مسز ہیمز سے پوچھا۔ ”کیا تم نے انہیں اس واقعے سے پہلے اسٹور میں دیکھا تھا؟“

مسز ہیمز کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک فوراً پریشان ہو جانے والی عورت ہے۔

اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسا کے جواب دیا۔ ”جی نہیں۔ میں نے انہیں واقعے سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔“

محسنِ محله

ایک زندہ محلے کا ماجرا
انہیں جانے والوں سے بہت ہمدردی تھی

اشفاق احمد



بھائی سے ہاتھ چھڑایا اور بچوں کے بل اور ہوس کے گارڈ
سے چاکلیٹ کا پیکٹ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی یہ
کوشش رائیگاں گئی۔ پیکٹ اس کی انگلیوں سے چٹا لڑکھو
رہ گیا۔ ہنری نے خود پیکٹ اٹھا کے اسے دے دیا۔
”مسٹر ہنری! آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔“
مدعیہ کو طیش آ گیا۔ ”معلوم ہوتا ہے، آپ چور لڑکے کا
بے گناہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اسے سزا دلوانے کے
لیے مجھے منیجر کے پاس جانا پڑے گا؟“

ہنری نے سر دنگا ہوں سے عورت کی طرف دیکھا اور
اپنی جیب سے ایک نوٹ نکال کے وہاں رکھ دیا جہاں
چاکلیٹ کا پیکٹ رکھا تھا۔ ہنری نے مدعیہ سے دریافت
کیا۔ ”محترمہ! ذرا یہ بتائیے کہ آپ نے اپنا نوٹ یہاں
رکھنے کے بعد کیا کیا؟“

مدعیہ اسٹور کے اندر چند قدم گئی اور لوٹ آئی۔ اس
کے چہرے سے بے صبری ظاہر ہو رہی تھی۔ ہنری نے مسز
بہمر سے پوچھا۔ ”اور آپ کیا کر رہی تھیں؟“
مسز بہمر نے مڑتے ہوئے بتایا۔ ”میں نے ایک
لمحے کے لیے اس کی طرف پیٹھ کر لی تھی۔“

ہنری کی نظریں اپنے نوٹ پر جمی ہوئی تھیں۔ مسز بہمر
نے جیسے ہی کاؤنٹر کی طرف پیٹھ کی، پیچھے رکھے ہوئے پٹے کی
تیز ہوائے نوٹ اڑا دیا۔ مدعیہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ سخت
منتشر ہو گئی تھی۔ ہنری آہستہ آہستہ لڑکے کے نزدیک گیا۔
”ہاں ماسٹر! کیا تم نے نوٹ کاؤنٹر سے اٹھایا تھا؟“ لڑکے نے
انکار کیا۔ ہنری نے پوچھا۔ ”کیا نوٹ تمہارے بجائے
تمہاری بہن نے فرش سے اٹھا کر تمہیں دیا تھا؟“ لڑکے نے
گردن جھکا لی۔ ہنری نے دریافت کیا۔ ”کیا تم نے یہ دیکھا
تھا کہ تمہاری بہن نے نوٹ کہاں سے اٹھایا تھا؟“

لڑکے نے اپنی بہن کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا اور
بکھری ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہ میری بہن ہے،
چھو.... ٹی بہن۔“

مدعیہ کا منہ فق ہو گیا۔ ہنری کو ایسا محسوس ہوا کہ سارا
قصور گری کا ہے اور اس مقدمے کا اصل مجرم ”گری“ ہی ہے۔

”میرا خیال ہے، یہ معاملہ پولیس کے حوالے کر دینا
چاہیے۔“ مدعیہ نے دُشٹی سے کہا۔ ”یہ قصہ یہاں طے ہوتا
دکھائی نہیں دیتا۔“

ہنری کو اس کی سنگ دلی بہت ناگوار گزری۔ لڑکا عام
چوروں کی طرح نہیں لگ رہا تھا۔ کیا واقعی یہ معاملہ پولیس
کے حوالے کر دیا جائے؟ کیا ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں فروش
کوئی منصف ہی اس معاملے کا فیصلہ کر سکتا ہے؟ ہنری نے
سوچا کہ یقیناً کوئی ایسی بات ہوگی جس نے لڑکے کو نوٹ
اٹھانے پر مجبور کیا اور جس کا یہ اظہار نہیں کر پا رہا ہے۔ اس
نے واردات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے کچھ غور و فکر کیا مگر
گری کے باعث اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ آخر اس نے
کہا۔ ”کیوں نہ ہم اس جگہ چلیں جہاں یہ سب کچھ ہوا ہے۔“
مسز بہمر اور مدعیہ، ہنری کے محبوب کمرے سے باہر نکل
گئیں۔ ہنری نے بچوں کو اشارہ کیا، وہ بھی آہستہ سے باہر
نکلے، لڑکا اپنی بہن کا ہاتھ ذمہ داری سے تھامے ہوئے تھا۔
اسٹور کا اندرونی حصہ ہنری کے دفتر سے ٹھنڈا تھا۔ چھت کے
پچھلے ست رفقاری سے چل رہے تھے، ہلکی ہلکی ہوا آرہی تھی۔
وہ کاؤنٹر کے قریب پہنچے۔ ہوا لگنے سے مسز بہمر کے چہرے کا
تناؤ کم ہو گیا۔ اس کی پشت کے شیف پر رکھا ہوا گھومنے والا
پنکھا گھوم کر اس کے سر پر آیا تو لڑکی کے بال بکھر گئے۔ اس
نے فوراً کلب لگا کے بال ٹھیک کیے۔ ہنری نے مدعیہ سے
نرم لہجے میں پوچھا۔ ”خاتون! نوٹ آپ نے کہاں رکھا تھا؟“
مدعیہ نے نخوت آمیز انداز میں کاؤنٹر پر ایک جگہ کی طرف
اشارہ کیا۔ ہنری نے شائستگی سے پوچھا۔ ”کیا بالکل اسی جگہ
آپ نے نوٹ چھوڑا تھا؟“ آپ کو اچھی طرح یاد ہے؟“

”جی ہاں۔“ عورت نے زہریلی آواز میں جواب
دیا۔ ”بالکل اسی جگہ، کیش رجسٹر کے قریب۔“ مسز بہمر نے
بھی اس کی تائید کی ہنری نے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ اٹھا
کے اس جگہ رکھ دیا اور مسکرا کے بچی سے سوال کیا۔ ”بے
بی! تمہیں چاکلیٹ پسند ہیں؟“ بچی نے اس کی آنکھوں میں
دوستانہ تاثر محسوس کر کے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہنری
نے کہا۔ ”اچھا، کاؤنٹر سے چاکلیٹ اٹھا لو۔“ بچی نے اپنے

کسی

کو ٹھیک سے معلوم نہیں کہ ماسٹر الیاس کب اس محلہ میں آیا تھا اور کب اس نے یہ کوٹھڑی کرائے پر لی تھی لیکن اس بات کا ہر ایک کو علم تھا کہ ماسٹر الیاس مہاجر ہے اور اس کا تعلق انبالہ کے کسی علاقے سے ہے کیونکہ وہ بولی ہی ایسی بولتا ہے جو انبالہ پٹیالہ میں بولی جاتی ہے۔

ماسٹر الیاس کرائے کی کوٹھڑی میں رہتا تھا اور اس کے پاس محلے کے لڑکے گنتی سیکھنے، پہاڑے کہنے اور تختی لکھنے کے لیے آجاتے تھے۔ اس کے پاس دو لڑکا بیٹے اور ایک اکیل مرغا تھا۔ بیڑ تو پختروں میں بند رہتے تھے لیکن اکیل مرغا اس کی کوٹھڑی کے دروازے سے ذرا دور کھڑا رہتا تھا۔ ماسٹر الیاس نے مرغے کی ایک ٹانگ میں پیتل کا چھلا ڈال کر اس سے اسی کی مضبوط ڈور باندھ رکھی تھی اور اس ڈور کا دوسرا سرا اپنی کوٹھڑی کی دہلیز میں میخ ٹھونک کر اس سے باندھ رکھا تھا۔ حسن محلہ کے سبھی لوگ ماسٹر الیاس کی عزت کرتے تھے اور اس کو السلام علیکم کہہ کر اس کے دروازے کے آگے سے گزرتے تھے۔ ماسٹر جی کچھ اور کام بھی کرتے تھے لیکن کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ شاید وہ سبزی منڈی میں مٹی گیری کرتے تھے یا کسی دور کے محلے میں پھیری لگاتے تھے یا کسی کارخانے میں رنگ روغن کی دھاڑی کرتے تھے۔ کوئی اس کی بابت اچھی طرح نہیں جانتا تھا لیکن اتنا سب کو معلوم تھا کہ ماسٹر الیاس کی گزر بسر ذرا تنگی ترشی سے ہی ہوتی ہے۔

دراصل ماسٹر صاحب سیدھے آدمی تھے اور ان کو زمانے کے ساتھ چلنے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ کچھ تو ان کی شکل ہی ایسی تھی کہ اسے دیکھ کر لوگوں کے دل میں محبت یا ہمدردی کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا تھا اور کچھ ان کی گفتگو اس انداز کی ہوتی تھی کہ کسی کو اس پر یقین نہیں آتا تھا۔ وہ جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ ہیرا پھیری نہیں کرتے تھے۔ مبالغے سے کام نہیں لیتے تھے۔ سچی نہیں

بگھارتے تھے۔ کسی کو خوفزدہ نہیں کرتے تھے۔ اسی سے کسی کو ان کی بات پر یقین نہیں آتا تھا۔ ان کی کوٹھڑی میں گرامر کی اور علم بیان کی بہت سی غلطیاں ہوتی تھیں اور سننے والا جھٹکا کر ان کی صحبت چھوڑ دیتا تھا۔ وہ است سیدھے اور اس قدر بے بیج تھے کہ انسان ہی نہیں گتے تھے۔ سارے محلے اور ساری سوسائٹی پر ایک بوجھ مانتے تھے اور چونکہ ایسے لوگوں کے ساتھ رسم و رواج کرنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا، اس لیے کوئی بھی ان کا دوست نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ محلے والے ان کی عزت کرتے تھے اور ان کے دروازے کے آگے سے گزرتے ہوئے السلام علیکم کہہ کر آگے بڑھ جاتے۔ سردیوں کی ایک شام مالک مکان نے ماسٹر الیاس کو بڑے سخت الفاظ میں ڈانٹا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے ۳ دن کے اندر اندر گزشتہ ۶ ماہ کا کرایہ ایک ساتھ ادا نہ کیا تو وہ اس کا سامان نکال کر باہر پھینک دے گا۔ ماسٹر جی کی خوف کے مارے کھلھی بندھ گئی۔ کیونکہ ان کے پاس ۱۸۰ روپے یکمشت موجود نہیں تھے۔ صرف ۴۰ روپے تھے۔ جن کے ساتھ ۱۰ کا ایک نوٹ اور پود کر انھوں نے ۵۰ بنا لیے تھے۔ پہلے تو مالک مکان ۲۵، ۳۰، ۴۰، ۵۰ لے کر آگے کی تاریخ دے دیا کرتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ وہ بڑنگ ہو گیا اور اس نے دھاگے میں پروئے ہوئے ۵۰ روپے اکیل مرغے کے آگے پھینک کر کہا ”جاوئے! میں نہیں لیتا۔ مجھے پورے ۱۸۰ کر کے دے۔“

جب وہ یہ کہہ کر چلا گیا تو ماسٹر الیاس نے ۵۰ روپے فرش پر سے اٹھا کر اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال لیے۔ پھر وہ اپنی کوٹھڑی کے اندر جا کر چار پائی پر بیٹھ گئے۔ چونکہ وہ اظہار کے معاملے میں کمزور تھے اس لیے ان کو رونا بھی نہیں آتا تھا۔ دھکی سے ہو کر بیٹھ گئے اور شدید غم کے باعث ان کی کھلھی بندھ گئی اور یہ پہلا موقع تھا کہ روئے بغیر کسی شخص کی کھلھی بندھی ہو!

وعدے کے مطابق مالک مکان نے ان کا سامان

بھینٹ دیا۔ ماسٹر صاحب کی چار پائی کے سامنے دو کھنبوں کے پیچھے لگا دی اور ان کا بانی کے سامنے سوار ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ اس کا گھر محلے سے کافی دور تھا اور وہ اپنی کوٹھڑیوں کا کرایہ ملنے کے لیے یہاں آیا کرتا تھا۔

ماسٹر صاحب نے ایک رات جوں توں کر کے اپنے گزاری اور اگلے دن شیخ کریم نواز کی خدمت میں ۲ سو روپے ادھار کے طلب گار کے طور پر اس نے ماسٹر صاحب کو نیک دل، سادہ لوح، سچا، سادہ، محض سمجھ کر رخصت کر دیا۔ کیونکہ ایسے احمق لوگوں کو ماسٹر صاحب نے کبھی نہیں ہوتا۔ پھر وہ اسماعیل بزاز کی دکان پر گئے۔ وہاں ۱۵۰ کا سوال ڈالا۔ اس نے بھی محلے کا کوئی نائی، حلوائی، قصائی، ڈاکٹر، وید، ماسٹر صاحب نے نہیں چھوڑا۔ لیکن ہر طرف سے ان کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ان لوگوں کو شدید مہنگائی نے گھیر لیا تھا اور ان کے پاس ادھار دینے کو کچھ بھی باقی نہ تھا۔

جس دن ماسٹر الیاس نے ہو میو پیٹھک ڈاکٹر کو اپنی نبض لکھا، اس روز انھیں ٹرانسفارمر کے نیچے سوتے آٹھواں دن لگا۔ انھوں نے ہتھو سکوپ لگا کر دیکھا اور کہا ”ماسٹر صاحب! آپ میں آپ کو پڑیا تو دے دیتا ہوں لیکن آپ کسی کو بھی دکھالیں۔“ ماسٹر صاحب نے کہا ”بہت اچھا“ اور اپنے جبار حلوائی کی دکان پر چلے گئے۔ انھوں نے اپنی رانی نبض جبار کو دکھائی اور پھر گڑ گڑا کر اس سے ۲ روپے قرض کی درخواست کی۔ جبار ہنس پڑا۔ اس کو پتا تھا کہ ایسے لوگو کوئی ایک روپیہ بھی ادھار نہیں دے سکتا، یہ ہے اسو ما بگ رہا ہے۔ جب ایسی انہونی بات ہو تو ہر آدمی آمبانی ہے اور اسی وجہ سے جبار ہنس پڑا تھا اور نہ ہی اس نے قرض ہی کم ہٹا تھا۔

۳ دن تک ماسٹر الیاس اپنی رضائی سر پر اگلو کی اور اندر جا کر چار پائی پر بیٹھے رہے۔ جو کوئی وہاں سے گزرتا تو ”ایک“ کہہ کر یہ ضرور پوچھتا۔ ”کیوں جی ماسٹر جی

میری سادگی دیکھ

کسی نے علامہ اقبال سے پوچھا: ”عقل کی انتہا کیا ہے؟“ جواب ملا: ”حیرت۔“

پھر پوچھا گیا: ”حیرت کی انتہا کیا ہے؟“ جواب ملا: ”عشق۔“

”عشق کی انتہا کیا ہے؟“

فرمایا: ”عشق لا انتہا ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں۔“

سوال کرنے والے نے کہا: ”مگر آپ نے لکھا ہے ”تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں۔“

آپ نے مسکرا کر کہا: ”دوسرے مصرعے میں اپنی غلطی کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ”میری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں۔“

دھوپ سینگی جا رہی ہے“ اور ماسٹر جی اندر سے بند آواز میں جواب دیتے ”ہاں جی تھوڑی سردی لگ رہی تھی۔“

چوتھے روز فجر کی اذان کے وقت جب ماسٹر صاحب فوت ہو گئے تو محسن محلہ کے ایک ایک شخص کو ان کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ ناشتہ کا وقت ختم ہونے تک ہر شخص خاموشی اور دکھ کے کونے میں لپٹ کر دھوپ میں جا کھڑا ہوا۔ ماسٹر جی کے بیٹروں کو کٹورہ بھر کنگنی اور ان کے مرغے کو آٹے کی آبنورہ بھر گولیاں ڈالی گئیں۔ شیخ کریم نواز صاحب اپنی حویلی سے نکل کر ٹرانسفارمر کے نیچے آ بیٹھے۔ یہاں لوگوں نے بڑی سی درمی بچھا دی اور دو تین تازہ اخبار لا کر رکھ دیے۔ لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ شیخ کریم نواز نے ۲ سو روپے نکال کر سعید اور بلال کو سکوتر پر بھیجا کہ جا کر قبر کا بندوبست کریں۔ ۳ سو روپے بابو جلال کو دیے کہ رحمت کو ساتھ لے جا کر لٹھے، کافور، عرق گلاب اور پھولوں کا بندوبست کریں۔ جبار حلوائی نے دودھ پتی کا ایک پتیلا کاڑھ کر صف پر پہنچا دیا۔ لوگوں نے ماسٹر صاحب کی رسم فل کے لیے پیسے جمع کرنے شروع کیے اور دیکھتے دیکھتے محسن محلہ کے لوگوں نے ۸۱۱ روپے جمع کر کے شیخ کریم نواز صاحب کے پاس محفوظ کرادیے۔

دجیو

ہندی ادب سے ایک پُر اثر کہانی

ایک کینے میں کام کرنے والے 10 سالہ لڑکے کی کہانی

وہ اپنے گھر والوں سے دور تھا

اور اسے بڑے بھائی کی یاد بہت سستی تھی

جگدیش

بابو نے اُسے پہلی بار اُس کینے میں دیکھا تھا، جس پر ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا اور جو بازار سے آتے ہوئے سڑک پر

جگدیش نے اپنے باپ کو اپنی سگریٹ کا دھواں کھینچتا ہوا دیکھا تھا۔ اُس کی چلت بھرت میں ایک قسم کی بالکل شبنم کے اُس قطرے جیسی جو پتے پر آہستگی سے لڑھکتا ہے۔ اُس نے زیادہ سے زیادہ دس سال ہو گئی۔ جس وقت جگدیش بابو اپنی سگریٹ کا دھواں کھینچتا ہوا دیکھا تھا، وہ لڑکا میز سے پلیٹیں اٹھا رہا تھا۔ جیسے وہ کسی کا منتظر رہا ہو۔ لڑکے نے کچھ کہا نہیں، بس تعظیماً تھوڑا سا سر ہلایا۔ جگدیش بابو نے چائے کا آرڈر دیا۔ وہ دوبارہ مسکرایا اور چائے لے گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ پھر نمودار ہوا، چائے سمیت۔ یہ احساسات بھی عجیب چیز ہوتے ہیں۔ بسا اوقات آدمی بالکل تنہا اور سناٹا جگہ پر بھی خود کو اکیلا نہیں محسوس کرتا، تنہائی کے باوجود کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہر چیز اس کی لگتی ہے، اپنی سی لگتی ہے اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ آدمی بھری ہوئی محفل میں بھی یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ بالکل اکیلا ہو، کوئی بھی شے مانوس نہیں لگتی مگر جذبے کی جڑیں کہیں نہ کہیں بیگانگی یا دُوری میں ضرور ہوتی ہیں۔

جگدیش بابو اس بڑے سے شہر میں ایک دُور افتادہ مقام سے آیا تھا اور خود کو بہت تنہا محسوس کرتا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی میں اُسے کوئی اپنا پن نظر نہیں آتا تھا۔ ممکن تھا کہ کچھ عرصے یہاں رہنے کے بعد وہ اس کا عادی ہو جاتا مگر فی الحال یہاں کی ہر چیز اُسے اجنبی لگتی تھی۔ اُسے اپنا گھر یاد آنے لگا۔ وہاں کے لوگ یاد آنے لگے، سکول یاد آنے لگا، ہنگی ساتھیوں کا خیال اُسے ستانے لگا۔

”چائے صاحب!“

جگدیش نے سگریٹ کا گُل جھاڑ کر لڑکے کے بولے ”اے لفظ“ صاحب“ کا تجزیہ کیا۔ اُسے لگا جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز اسے نظر آئی ہو۔ اُس نے لڑکے سے پوچھا، ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”مدن۔“

”مدن، تم کہاں کے رہنے والے ہو؟“

”میں پہاڑی ہوں صاحب!“

”پہاڑ تو بہت سے ہیں، دارجلنگ، آبو، مسوری، شملہ، تم کون سی پہاڑی کی بات کر رہے ہو؟“

”الموڑ صاحب!“ اُس نے مسکرا کر کہا۔

”گاؤں کا نام۔“

لڑکے نے کچھ تذبذب سے کہا، ”دراصل اُس گاؤں کا نام ذرا عجیب سا ہے۔“ اُس نے گریزاں لہجے میں کہا،

”صاحب! وہ الموڑا سے ۲۰ میل پر ہے۔“

”پھر بھی..... اُس کا کوئی نام تو ہوگا۔“ جگدیش نے

اصرار کیا۔

”دتیال کہتے ہیں اُسے۔“ لڑکے نے کھیاتے ہوئے بتایا۔

جگدیش کے چہرے پر چھائی ہوئی تنہائی کی پرچھائیاں جیسے پھر سے اُڑ گئیں۔ مسکراتے ہوئے اُس نے لڑکے سے کہا کہ وہ خود بھی ادھر ہی کا ہے۔ اُس کا گاؤں دتیال کے پاس ہی تھا۔ لڑکے کے چہرے پر خوشی کا گہرا تاثر ابھرا۔ اُس کے ہاتھ میں دبی ہوئی ٹرے گرتے گرتے پیچی۔ چند لمحوں تک وہ گنگ سا کھڑا رہا، جیسے ماضی کو یاد کر رہا ہو۔ ماضی..... اُس کا گاؤں، اُس کے پہاڑ، چشمے، ماں، باپ، بہنیں اور بڑا بھائی، دجیو۔ ہاں، وہ اپنے بڑے بھائی کو یہی کہتا تھا۔

آخر یہ کس کی شہادت اُسے جگدیش میں دکھائی دی تھی؟ اپنے آپ کی یا اپنے بڑے بھائی کی، جسے وہ ”دجیو“ کہہ کر پکارا کرتا تھا؟

ذرا ہی دیر بعد جگدیش اور اُس کے درمیان اجنبیت ختم ہو چکی تھی۔ اب صورت یہ تھی کہ جگدیش جوں ہی کینے میں آتا تھا، مدن لپک کر اُس کا استقبال کرتا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولتا تھا، ”سلام دجیو!“

”دجیو! آج تو بڑی سردی ہے۔“

”دجیو! لگتا ہے بارش ہوگی۔“

”دجیو! تم ٹھیک تو ہو؟“

ہنس مکھ

اُس روز جگدیش جب کیفی کی سمت آ رہا تھا، راستے میں اُسے اپنا ایک بچپن کا دوست ہیمنت مل گیا۔ یہ ایک اتفاقی ملاقات تھی۔ وہ اُسے لے کر کیفی میں آ گیا۔ میز پر بیٹھنے کے بعد اُس نے مدن کو بلایا تو اُسے احساس ہوا کہ مدن ہرگز کھنچا سا ہے۔ بہر حال، اُس کی دوسری آواز پر وہ آ گیا۔ آج اُس کے چہرے پر وہ پرانی مسکراہٹ نہیں تھی۔ نہ ہی اُس نے اُسے دیکھ کر کہا، ”کیوں دجیو! کیا لاؤں؟“ اس بار جگدیش کو خود ہی بولنا پڑا، ”دو چائے۔“ اس بار بھی مدن نے ہمیشہ کی طرح ”ٹھیک ہے دجیو! ابھی لایا“ کے الفاظ ادا نہیں کیے، بلکہ اُس نے کہا، ”صاحب! اور پھر اس طرح چلا گیا جیسے وہ کسی مکمل اجنبی سے بات کرتا رہا ہو۔“

”مجھے تو یہ کوئی پہاڑی لڑکا لگتا ہے۔“ ہیمنت نے لڑکے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں!“ جگدیش بابو نے سر ہلایا اور موضوع بدل دیا۔ مدن نے چائے لا کر میز پر رکھ دی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ یکا یک ہیمنت نے اُسے مخاطب کیا۔ اُس کا لہجہ دوستانہ اور مشفقانہ تھا۔

لمحے بھر خاموشی رہی۔ جگدیش بابو نے نگاہیں پڑاتے ہوئے اپنی توجہ پیالی پر مرکوز کر دی تھی۔ مدن کی آنکھوں کے سامنے یادوں نے ابھرنا ڈوبنا شروع کر دیا۔ اسی طرح کبھی جگدیش بابو نے بھی اُس سے نام پوچھا تھا اور پھر ایک روز اُس نے محبت سے اُسے پکارا تھا: ”دجیو!“

اور پھر ایک دن اُس نے سنا تھا، ”تمہیں اتنی بھی تیز نہیں کہ تم ٹھیک سے بڑوں کو مخاطب کر سکو۔“

جگدیش بابو نے اپنا سر اٹھایا تو دیکھا، مدن کچھ ایسی کیفیت سے دوچار ہے جیسے ابھی ابھی رو دے گا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ ہیمنت نے دوبارہ پوچھا۔

”صاحب! مجھے یہاں لوگ ”بوائے“ کہہ کر بلاتے ہیں۔“ اُس نے کہا اور فوراً ہی وہاں سے چلا گیا۔

”عجیب بھوندو لڑکا ہے۔“ ہیمنت نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا، ”اسے اپنا نام تک نہیں معلوم!“

پھر کسی طرف سے آواز لگتی، ”بوائے“ اور مدن فوراً لپک کر اُدھر چلا جاتا۔ آرڈر لے کر جاتے ہوئے وہ جگدیش سے پوچھا، ”دجیو! کوئی اور چیز لاؤں؟“

”پانی لے آؤ۔“

”ابھی لایا دجیو!“ مدن دوسری طرف سے پکار کر کہتا۔

”دجیو“ کا لفظ دہراتا ہوا، جس میں بلا کی محبت اور قربت بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ سے کافی دنوں سے دور تھا۔ اُسے یہ لفظ ادا کرتے ہوئے شاید بڑا سکون ملتا تھا۔

کچھ عرصے بعد جگدیش بابو کو جو اس جگہ اکیلا پن محسوس ہوتا تھا، وہ رخصت ہو گیا۔ اب یہاں کے بازار، یہاں کے لوگ اور یہاں کی چیزیں اُسے مانوس لگنے لگی تھیں۔ مدن کی پکار ”دجیو، دجیو“ اُسے ایک دم سے بری لگنے لگی تھی۔

”مدن! ادھر آنا۔“

”آیا دجیو!“

مدن کا ”دجیو“ اُسے ایک دم سے اکھرے لگا تھا۔ اُسے لگتا تھا، جیسے اُس کی تحقیر ہو رہی ہو۔ اُن کے ہاتھ میں اُنس کا دھاگا بہت کمزور تھا۔

”چائے لاؤں دجیو!“

”نہیں، اور سنو، یہ تم ہر وقت ”دجیو، دجیو“ کیوں کہتے رہتے ہو؟ تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں کہ بڑوں کو مخاطب کس طرح کیا جاتا ہے۔“

جگدیش کا چہرہ غصے سے تمٹما اٹھا تھا۔ اُس کی زبان چل پڑی تھی۔ مدن چھوٹا ضرور تھا مگر اُس کی سمجھ، اُس کی عمر سے زیادہ تھی۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں زندگی کے ٹھوس حقائق کا سامنا کرنے والا بچہ اتنا نادان کیسے ہو سکتا تھا کہ ان باتوں کو نہ سمجھ سکتا۔

اُس روز وہ کیفی کے مالک سے رخصت لے کر گھر چلا گیا جو ایک چھوٹی سی کھولی پر مشتمل تھا۔ اُس نے سر کو بازوؤں میں چھپالیا اور سسک سسک کر رونے لگا جو حالات تھے یعنی گھر سے دوری، شفقتوں سے محرومی اور ایک اپنے آدمی کا پا جانا۔ اُن کی موجودگی میں اُس کا رویہ فطری ہی تھا مگر اُس روز اُسے شدید احساس ہوا کہ اس علاقہ غیر میں جیسے کسی نے اُسے اپنی ماں کی آغوش سے نوج لیا ہو۔ مدن دوسرے روز پھر کام پر موجود تھا۔

ایک شہر و شنگ لڑکی کی داستان
اُس کے لہجہ اور خدمت کی زبان تھی مگر خدائے دل کی بات کہنی دہاتی تھی
سہرشی شاعر اور ادیب شیخ الیاس کا قلم پارہ

کی سادگی میں چالاکی تھی، چالاکی میں سادگی۔ کبھی بچے کی طرح دوڑتی ناچتی آیا کرتی تھی اور میرے پیچھے سے آکر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی۔ کبھی میرے بال بکھیر کر کہتی۔ ”دیکھو تو کیسے لگ رہے ہو؟“ اور پھر شیشہ اٹھا کر ہاتھ میں دے دیتی۔ کبھی میں پنسل تراشتا تو وہ اسے توڑ دیتی اور اسے اٹھانے کی کوشش کرتا تو ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ کبھی دوپٹے کی پگڑی باندھ کر آ جاتی اور میرے ہاتھ سے کتاب چھین کر کہتی۔ ”کہو اب کیا کہہ رہے ہو؟“ کبھی پن اٹھا کر میری گردن میں چھبوا دیتی، کبھی شربت میں نمک ملا کر لے آتی، کبھی بھڑ پکڑ لاتی اور مجھے دکھا کر ڈرانے کی کوشش کرتی۔

ایک دن بچھو ہتھیلی پر لے آئی۔ نہ جانے کیسے اس کا ڈنک نکالا تھا! دیکھو میں نے اس پر جادو کیا ہے، اس نے کہا۔

میں نے شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم تو انسان پر بھی جادو کر سکتی ہو۔“

اس کے چہرے پر شرم کی سرخی دوڑ گئی اور بچھو میری گود میں اچھال دیا۔

میں ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسے چُنیا سے پکڑ کر بولا۔ ”کہو پھر ایسے کرو گی؟“

”نہ بابا میری توبہ، میری امی کی بھی توبہ!“ اس نے چُنیا چھڑاتے ہوئے کہا۔

ایک دن دوپہر کو آتے ہوئے مجھے دیر ہو گئی تو وہ کھانا لے کر آئی۔ میں نے بہت کہا کہ خود ہی کھاؤں گا لیکن وہ نہ مانی زبردستی نوالے بنا بنا کر منہ میں ٹھونسنے لگی۔

”سب عورتیں بے وقوف ہوا کرتی ہیں۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”اس لیے تو تم بھی پاس نہیں ہو رہی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے ہڈی نوالے میں چھپا کر منہ میں ڈال دی۔ ہڈی چپا کر میرا منہ خراب ہو گیا تو وہ بھاگ گئی۔ میں نے غصے سے کہا۔ ”بس پھر کبھی یہاں

نہیں آؤں گا۔“

”ارے دیکھتی ہوں، کتنے دن نہیں آؤ گے، کتنے دن اس شور و غل میں پڑھ سکتے ہو۔“ اس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”گھر میں ایک لفافہ بھی ہو سکے تو کہنا۔“

میں نے سوچا کہ کہہ تو سچ رہی ہے۔ ہمارا گھر چھوٹا تھا اور بچے بھی زیادہ تھے، اس لیے میں ان کے گھر آ کر پڑھتا تھا۔ اس کے گھر میں صرف دو افراد تھے، خالہ اور وہ لیکن اس نے ناک میں دم کر دیا تھا۔ ہر روز نئی شرارتیں سن کر کرتی تھی۔

جب میٹرک میں فیل ہو گئی تو پڑھنے کا خیال ہی نہ رہا۔ اسے نکال دیا اور اب میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ ایک دن میرے ہاتھ میں کیمرا دیکھ کر ضد کرنے لگی کہ میری تصویر کھینچیں۔ بڑی تگ و دو کے بعد جب میں نے تصویر کھینچنے تو اس نے دوپٹے میں منہ چھپا لیا۔

ایک مرتبہ میں ابھی کتاب لے کر ہی آیا تھا۔ کمرے میں دو چار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ میں جوں ہی کمرے میں داخل ہوا سب ہنسنے لگیں اور وہ اتنا ہنسی کہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے جھینپ کر اسے کہا۔ ”خیر تو ہے؟“

”تم پر تو نہیں ہنس رہے تھے۔“ اس نے ہنسی روک کر کہا۔ ”تم خود بتاؤ تمہاری شکل ایسی ہے کیا تمہاری شکل دیکھ کر تو مجھے رونا آتا ہے۔ ہنسی کبے آئے گی۔“

”اب بکواس چھوڑو!“ میں نے ڈانٹ کر کہا۔ ”ایسے ہی آدمی دیکھ کر تمہارا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔“

”دماغ تو تمہارا بڑھ پڑھ کر خراب ہو گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔ ”بتاؤں کہ کیوں ہنس رہے تھے! میں نے زہرہ کو بتایا کہ تم نے بی اے میں فلسفہ لیا ہے۔ اس پر اس نے ایک فلسفی کی بات سنائی کہ کیسے اس نے دیوار پر ایلے لگے دیکھ کر کہا کہ

”اس نے اس دیوار پر کیسے کیا؟ اس پر مجھے اس کی بات یاد ہے۔“

میں نے سوچا کہ اس کو ایسے شرارت بھرے خیالات سے آگے نہ بڑھائے۔

اس کی ہنسی میں زندگی تھی اور زندہ دلی تھی۔ ہنسنے کے لمحوں میں جیسے سفید اور سرخ گلاب لکڑی لگاتے تھے اس کے نازک لب شبنم آلود ہو جاتے۔ وہ ہنسنے میں اُسے مسکراتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بیٹھتی رہتی تھی اور اس کی ہنسی میں دنیا بھر کا سنگیت سما جاتا تھا۔ اس کے قہقہے میں معصومیت اور شرارت ہوتی تھی۔ ہاتھ ہاتھ میں ملا کر ناچتے ہوئے گم ہو جاتی تھی۔ کتا بولی تو گاتی رہتی تھی، جب آدمی دیکھتی تو ہنس پڑتی جیسے ماری دنیا کی خوشی اس کی روح میں سمائی ہوئی تھی۔ ”اتنا ہنستی تھی کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے تھے۔“

یہ باتیں نہیں چلتا تھا کہ وہ ہنس رہی ہے یا رو رہی ہے۔ اس کی زندگی میں مسکراہٹ اور آنسو ملے جلے تھے، ایک کو پریشان کرتی تھی لیکن کوئی بھی اس سے غافل نہ تھا۔ میں تو اس سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ مجھے اس سے محبت تھی اور محبت اس لیے کرتا تھا کہ مجھے اس سے نفرت تھی۔ میٹھی میٹھی نفرت۔ کڑوی کڑوی نفرت۔ دور ہو کر دور رہنا نہیں چاہتا تھا اور نزدیک ہو کر

تنگ ہو جاتا تھا۔ میری اور بھی خالہ زاد، چچا زاد بہنیں تھیں لیکن اور کوئی بھی ایسی عجیب و غریب نہ تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ مجھ سے شرارت کر سکے۔ سب کتابی کیزا سمجھ کر میری عزت بھی کرتی تھیں اور نفرت بھی۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے چھیڑتی رہتی تھی، میں کتاب کے کسی صفحے پر نشان ڈال کر جاتا تو وہ نشان نکال کر کسی اور صفحے پر رکھ دیتی، میں فاؤنٹین پین میں سیاہی بھرتا تو وہ سیاہی نکال کر اس میں پانی بھر دیتی۔ مطلب یہ ہے کہ عجیب شامت تھی۔ میں نے کئی بار سوچا کہ پھر اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ہی وہ کوئی بہانہ کر کے کسی کو بھیج کر بلا لیتی۔ مثال کے طور پر کہلوا کر بھیج دیتی کہ امی کے سر میں درد ہے، دوا دینے کو بلایا ہے اور میں دوائی لے کر پہنچتا تو پیغام دینے والا غائب ہو چکا ہوتا، مجبوراً مجھے ہی دوا لے کر اس کے گھر جانا پڑتا۔ جب میں گھر میں داخل ہوتا تو وہ ہنس کر کہتی۔ ”دیکھو کس طرح چالاکی سے بلوایا۔ اب پتا لگا۔“

اور پھر رسی کو دہانے لگتی۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ مجھے صرف شرارت کرنے کے لیے بلواتی۔ مجھے یاد ہے کہ کڑا کے دار گرمی میں پڑھتے ہوئے مجھے نیند آ گئی اور پسینے کی وجہ سے کروٹیں بدل رہا تھا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے پر آنکھ کھل گئی۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ پنکھا جھل رہی ہے۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر میری پیٹھ پر وہی پنکھا دے مارا اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی کہ ”نیند میں کیوں بڑبڑا رہے تھے، ہماری نیند خراب ہو رہی تھی۔“

جب اکٹھے کھانا کھانے بیٹھتے تھے تو کہتی تھی، دیکھنا میں تمہیں بھوکا ماروں گی اور پھر قہقہہ مار کر ہنستی تھی لیکن میں نے دیکھا تھا کہ وہ بہت کم کھاتی تھی اور اچھی اچھی چیزیں میرے لیے رکھ دیتی تھی۔

ایک دن مجھے سخت بخار ہو گیا۔ میں نے اپنی بہن سے کہا ذرا سرد باد دو۔

اس نے ڈانٹ کر کہا۔ ”دو گھنٹے سے مسلسل خالہ زاد

بہن آپ کا سرد بار ہی تھی اور اب بھی سرد بانے کو کہہ رہے ہیں۔“

مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ غشی کے عالم میں وہ میرا سرد بار رہی تھی۔ اس طرح کئی بار میں نے محسوس کیا کہ اس نے مجھ سے ہمدردی کی تھی۔

میں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا تو اسکے گھر گیا۔ اس نے کہا۔ ”مٹھائی کھلائیں۔“ اور پھر زوردار قہقہہ لگا کر بولی۔ ”چلو کنگال، تم کیا کھلاؤ گے۔“ کہہ کر ہنسنے لگی۔

میری شادی ہو گئی۔ وہ آئی اور بولی۔ ”مٹھائی کھلاؤ۔“ اور پھر ”چلو کنگال، تم کیا کھلاؤ گے۔“ کہہ کر ہنسنے لگی۔

میرے ہاں بیٹا پیدا ہوا تو وہ آئی اور پھر وہی۔ ”مٹھائی کھلاؤ!“ کہہ کر بولی۔ ”چلو کنگال، تم کیا کھلاؤ گے۔“ اور پھر زوردار قہقہہ۔ اس میں ابھی تک وہی معصوم شرارت تھی۔ اب بھی زندہ دلی تھی۔ اب بھی ہنستے ہوئے اس کے آنسو نکل آتے تھے۔

کل وہ میرے بیٹے کو گود میں کھلا رہی تھی۔ میرے بیٹے سے اسے بہت محبت تھی۔ بچہ گھٹنے چلنا سیکھ گیا تھا۔ کل وہ بچے کو اچھال رہی تھی۔ میں دفتر سے واپس آیا تھا۔ بچے نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”با آبا آ۔“ میں نے اسے اٹھانے کے لیے بازو بڑھائے لیکن بچہ سر ہلا کر اس کے سینے میں چھپنے لگا اور بولا۔ ”ام۔ ماں۔“

میں نے مذاق سے کہا۔ ”ارے تمھاری امی تو روٹی پکا رہی ہیں۔ یہ تو تمھاری پھوپھی ہیں!“ لیکن بچے نے میری بات نہ مانی اور اس کے سینے سے منہ نکال کر اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اماں۔“ اچانک میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ فق ہو گیا اور آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کیوں خیر تو ہے؟

اس نے بچے کے گال چومے اور اس کی قمیص میں منہ چھا کر سسکیاں بھرنے لگی۔ میں دیکھتا رہ گیا۔

یہ بیچارے

تنویر خواجہ

میرے وطن کے سارے شیدے، فیتے اور حمیدے
میرے وطن کی ہر اک شیداں، فیتقاں اور حمیداں
کب تک یہ فیتے ہی رہیں گے کب تک وہ شیداں ہی رہیں گی
کوئی انھیں تعویذ ہی لاوے، دوا انھیں حاصل ہی کہاں ہے
باسی سالن، سوکھے ٹکڑے ہیں ان کا یہ خوانِ نعت
مانگے مانگے کی اُترن ہے خلعت ان بیچاروں کی
منت کش ہیں ان کی سانس صدقوں اور خیراتوں کی
نام کے ہیں یہ آدم زادے اصل میں ہیں حشرات الارض
ڈانٹ ڈپٹ اور حشمتیں طعنے، دھکے، جھڑکی گزر رہے ہیں
پیدا ہونے سے مرنے تک یہی حشر ہے یہی سفر ہے
پھٹا ہوا اخبار، بچھا کے سو جانا ہے ان کی فطرت
نیند کی گولی کی تو ان کو نہ ہی حاجت نہ ہی عادت
کون ہے حاکم کون رعایا اس سے یہ بالکل لاتعلق
خواہ کوئی ہارے یا کوئی جیتے ان کی حالت نہ بدلے گی
روحیں ان کی زخمی زخمی، پیروں میں چھالے ہی چھالے
آنکھیں ویراں، چہرے بے رنگ، ہونٹوں پہ نالے ہی نالے
شیداں، شیدے، فیتقاں، فیتے تم اپنی قیمت پہچانو
اصل میں طاقت تم ہی تو ہو اپنے کو بیکار نہ جانو
بھوکو، نگو، بھولے لوگو اک دو بے بازو تھا مو
کندھے سے کندھے کو جوڑو وقت کڑا ہے کچھ کر گزرو
ووٹ کے بھوکوں کو دھتکارو، زرداروں کے دامن کھینچو
فرعونوں کی گردن تھا مو، شدادوں کے کپڑے نوچو
یہ لمحہ گریست گیا تو وقت نہ تم کو معاف کرے گا
وقت بہت تھوڑا ہے باقی اس کو ہاتھ سے جانے نہ دو

مغرب سے درآمد شدہ ایک پرتشخص کہانی



دوستوں کا ماجرا

انھیں دولت کمانے کا ایک آسان نسخہ مل گیا تھا
اکھٹی ادھوری معلومات کیسے زندگی کے رنگ بدل دیتی ہیں

ڈینیئل بنیڈی / سلیم انور

لیری

ٹانگیں پھیلائے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مشروب کی خالی بوتل تو ند پر رکھی ہوئی تھی۔ گرمی بے حد شدید تھی اور وہ اب بھی پیاسا تھا۔ لیکن ریفریجریٹر باورچی خانے میں تھا، پورے ۲۰ فٹ دور کمرے کے پردے گرے ہوئے تھے، لیکن گرمی کی شدت کم کرنے کی ناکام کوشش تھی۔ اسپیکر سے ایک نیوز رپورٹر کی آواز آ رہی تھی:

”چلڈرن کلا تھنگ اسٹور کے چیف ایگزیکٹو آفیسر ملٹن لاک وڈ جونیر نے پارامانا کے قدیم باشندے روبن وینڈر بلٹ کو بینکاری سے متعلق دشوار صورت حال میں مدد کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے۔ روبن کو اپنی جمع شدہ پونجی بنک میں ڈیپازٹ کرانے میں ناکامی ہوئی تھی۔ یہ رقم ۱۰ لاکھ.....“

”لیری! کرم پانی آنا پھر سے بند ہو گیا۔ کیا تم.....؟“

”لعنت ہو ٹیڈ! میں خبریں سننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سنو، یہ ہمارے پڑوسی کے بارے میں بتا رہے ہیں۔ ان کے خیال میں اُس کا نام روبن ہے۔“

”ایک بکتر بند ٹرک اس سینچر کو مسٹر روبن کی بچت کی رقم پارامانا کے ویسٹ فیلڈ شاپنگ سنٹر منتقل کرے گا۔ دوپہر کی اس تقریب میں مسٹر روبن اور ”میک اے وٹ فاؤنڈیشن“ کو چیک پیش کیا جائے گا، جس کی مالیت ۱۰ لاکھ.....“ ٹیلی ویژن ایک چھپا کے سے بند ہو گیا۔

”تم جون میں گرم غسل لینا چاہتے ہو؟“ لیری نے کہا۔ ٹیڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”میں اپنا مشروب ختم کرنے کے بعد اسے ٹھیک کر دوں گا۔“

لیری نے خالی بوتل منہ سے لگالی اور چسکی لینی چاہی، لیکن بوتل میں ایک قطرہ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ اُس نے

بوتل پلٹ کر دیکھی، پھر غراتے ہوئے صوفے پر سے اتر کھڑا ہوا۔ ”ٹھیک ہے!“ گرم پانی کا مسئلہ حل کرنے کے بعد لیری نے ریفریجریٹر میں سے آخری بوتل نکالی اور واپس فریج پر رکھ دیا۔ اُس نے پھر اپنی پشت صوفے سے لگا دی تھی، البتہ اس مرتبہ ٹی وی کا ریموٹ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اُس نے ٹی وی آن کر دیا۔

ٹیڈ لیری کے پاس سے گزرتا ہوا باورچی خانے میں چلا گیا۔ لیری کو ریفریجریٹر کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر ٹیڈ کچن کے دروازے پر کھڑا دکھائی دیا۔ ٹیوب لائٹوں کی روشنی میں وہ ایک ہیولے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ وہ تالیے سے اپنے بال رگڑ رہا تھا۔

”باقی مشروب کہاں ہے؟“ ٹیڈ نے پوچھا۔ لیری نے بوتل اوپر اٹھائی اور ڈکار لیتے ہوئے بولا، ”یہ آخری تھی!“ تالیے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ٹیڈ کمرے میں آگیا اور کاؤچ پر ڈھیر ہو گیا، پھر لیری کی جانب دیکھتے ہوئے گویا ہوا، ”تمہارے پاس کچھ نقدی ہے لیری؟“

لیری نے ٹٹولتے ہوئے اپنی پتلون کی جیب سے اپنا بٹوا نکالا۔ پھر ایک ہاتھ سے بٹوا کھول کر ٹیڈ کی نظروں کے سامنے کر دیا۔ ”نہیں۔“

”یہ اچھی بات نہیں۔“ ٹیڈ نے کہا، ”میرے پاس کوئی نقدی نہیں، تمہارے پاس کوئی نقدی نہیں، ریفریجریٹر میں کوئی مشروب نہیں، بس رات کا بچا ہوا پیزا پڑا ہے۔“ ”ہاں، لیکن تمہیں جمعرات کو ادائی ہو جائے گی۔ ٹھیک؟ اور جمعرات..... کل ہے!“ لیری نے کہا۔

”تمہاری آدھی بات درست ہے۔ کل جمعرات ہے!“

”اور باقی آدھی؟“

”مجھے کوئی ادائی نہیں ہوگی۔“

لیری یہ سن کر اٹھا اور ٹیڈ کے برابر بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں ٹیڈ کے تالیے پر جمی تھیں۔ پھر وہ دھیرے دھیرے

صوفے کے ہتھے پر پہنچ گیا۔ ”مجھے مت بتانا کہ تمہیں.....“ لیری نے جملہ ادھورا ہاتھ لگا کر کہا۔

لیری نے تو لیا ایک بار پھر مضبوطی سے جسم کے گرد لپیٹ لیا اور بولا، ”مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔“ ☆☆☆☆

لیری ٹیڈ کو دھکیلتا ہوا مکان سے باہر فٹ پاتھ پر لے گیا۔ ٹیڈ داخل رہی تھی اور درجہ حرارت بالآخر کم ہو کر ۲۰ سے نیچے آچکا تھا۔ لوگ گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ بچے سڑک پر رگی کھیل رہے تھے۔ فوارے پوری شدت سے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔

تین مکانوں کے فاصلے پر بد وضع دائرہ والی ایک گلی میں اپنے باغ میں پائپ سے پانی دے رہا تھا۔ اُس نے نیلے رنگ کا ایک اوور آل پہن رکھا تھا، لیکن برت کا باعث وہ اوئی ٹوپی تھی جو اُس نے شدت کی گرمی میں اوڑھی ہوئی تھی۔

اُس مکان تک پہنچنے سے چند فٹ پہلے ٹیڈ لیری کی جانب گھوم گیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا، ”یہ کام تم کرو گے۔“ ”ہم اس بارے میں پہلے ہی بات کر چکے۔“ لیری ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بولا۔ اُس کی نگاہیں اب بھی نیلے اوور آل میں ملبوس شخص پر مرکوز تھیں۔ ”تمہیں صرف گفتگو کا آغاز کرنا ہے، پھر باقی میں سنبھال لوں گا۔“ ”نہیں۔“

لیری نے ٹیڈ کو ایک جانب دھکیل دیا اور خود اُس شخص کی جانب چل دیا۔

”کل رات تمہیں ٹی وی پر دیکھا تھا۔“ لیری نے اُس شخص کے قریب پہنچ کر کہا بولا۔

اوور آل میں ملبوس اُس شخص نے نگاہ اٹھا کر لیری کی جانب دیکھا اور پھر پانی دینے میں مشغول ہو گیا۔ اس بار لیری بلند آواز سے گویا ہوا، ”میں نے کہا کہ

میں نے کل رات تمہیں ٹی وی پر دیکھا تھا۔“ اوور آل میں ملبوس شخص نے سر پر سے اپنی اوئی ٹوپی اتار دی۔ اُس کے نیچے ایک ہیڈ فون سیٹ نکلا جو گردن سے لٹکا ہوا تھا۔ ”سوری، میں تمہاری بات نہیں سن سکا۔ تم کیا کہہ رہے تھے؟“

”تمہیں ٹی وی پر دیکھا ہے کرس!“

”ہاں وہ مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آرہے ہیں۔“

”اُنھوں نے تمہارا نام روبن وینڈر بلٹ بتایا۔ کیوں؟“

”وینڈر بلٹ۔ روبن وینڈر بلٹ..... یہ میرا نام ہے۔“

”تو پھر لوگ تمہیں ”کرس“ کیوں کہتے ہیں؟“

روبن نے اپنے مکان کی بیرونی دیوار کی جانب اشارہ کیا۔ کھڑکی کے اوپر چھت کے عین نیچے ایک تختی لگی ہوئی تھی، جس پر لکھا تھا: ”کرس۔“

لیری نے ٹیڈ کی پسلیوں میں کہنی ماری۔

ٹیڈ کھانسنے لگا اور پھر بولا ”اے کرس! تمہارے پاس اتنی ڈھیر ساری رقم کہاں سے آگئی؟“

روبن نے قبچہہ لگایا اور پائپ کی گھنڈی بند کر دی۔ پائپ سے پانی بہنا بند ہو گیا۔ ”اس میں بہت وقت لگا۔ میں کوئی ہنگامہ برپا کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن وہ ایک خیراتی قسم کا ادارہ ہے۔“ اُس نے اپنا ہاتھ پائپ کے سامنے کر دیا اور جو پانی بھی ہاتھ میں آسکا، وہ لیری پر اچھال دیا۔ لیری کو طیش آیا، لیکن وہ خاموش رہا۔ روبن نے اُس کی کیفیت پر کوئی دھیان نہیں دیا۔

”تم اس ڈھیر ساری رقم کا کیا کرو گے؟“ لیری نے پوچھا۔

روبن نے پائپ سے اپنے باغ کی جانب اشارہ کیا اور بولا ”اسے کو درست کراؤں گا۔“

باغ کی حالت واقعی اتر تھی۔ پودے اس حد تک بڑھ چکے تھے کہ کھڑکیوں کو ڈھانپنے لگے تھے۔ کوئی بھی

دروازہ واضح نظر نہیں آتا تھا۔ لیری نے اس پاس کے مکانات کی جانب دیکھا۔ سبھی کے باغیچے اور لان صاف ستھرے اور با ترتیب تھے۔ اس مکان کے باغیچے کو واقعی درستی درکار تھی اور وہ بھی جلد از جلد تاکہ یہ بھی محلے کے دیگر باغات سے ہم آہنگ ہو جائے۔

”تحفظ کے بارے میں کیا اقدامات کیے ہیں؟“ لیری نے پوچھا، پھر وہ گڑبڑا سا گیا اور بولا ”میرا مطلب ہے، اتنی ڈھیر ساری رقم کے ہونے پر تم یہ تو نہیں چاہتے ہو گے کہ کوئی اسے لوٹ کر لے جائے۔“

”میں نے پہلے ہی شان دار قسم کے تحفظ کے انتظامات کیے ہوئے ہیں۔“ روبن نے پاپ ایک جھٹکے سے نیچے گرا دیا اور دوسرے ہاتھ سے شمار کرتے ہوئے بولا، ”اندر کے کیمرے، دروازوں اور کھڑکیوں میں الارم سامنے کے حصے میں کیمرا، درختوں کے پیچھے کیمرا اور ایک کیمرا عقب میں۔ میرے پاس سب کچھ دیکھنے کے لیے اسپیشل مانیٹر ہے۔ میرے ذہنی سکون کے لیے تحفظ نہایت ہی اہم ہے۔“

☆☆☆☆

لیری اور ٹیڈ کاؤچ پر براجمان ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھے تھے۔ برف سے بھری بالٹی پٹکے کے سامنے رکھی تھی۔ ٹیڈ ریوٹ سے بار بار چینل تبدیل کر رہا تھا۔

لیری نے اپنے پیر فرش پر پٹے اور بولا، ”ہم وہاں زبردستی نہیں گھس سکتے۔ مجھے کچھ اور ہی سوچنا ہوگا۔“

”زبردستی گھسنا؟“ ٹیڈ نے پوچھا۔ ”ہمیں رقم چاہیے۔ کرس نے، جو حقیقت میں روبن ہے، اپنے گھر میں ۱۰ لاکھ ڈالر چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ تحفظ بڑا سخت ہے، سو ہم زبردستی نہیں گھس سکتے۔ خاص طور پر اس لیے بھی کہ ہم اس کے بے حد نزدیک رہتے ہیں۔“

”تم اس رقم کو چرانا چاہتے ہو؟ یہ تو غلط بات ہے۔“ ٹیڈ نے کہا۔

”غلط بات تو یہ ہے کہ میرے پاس پینے کے لیے کوئی

مشروب نہیں۔“ لیری نے گلاس اوپر اٹھاتے ہوئے کہا، جس میں خالی برف کے ٹکڑے پکھل رہے تھے۔ ٹیڈ بولا، ”یہ کڈز کا تھنگ والے اسے چیک کیوں دے رہے ہیں؟ وہ یہ رقم سیدھی بینک کیوں نہیں لے جاتا؟ اور وہ اتنی بڑی رقم کے متحمل کیوں کر ہو سکتے ہیں؟ میری مراد کڈز کا تھنگ سے ہے۔“

لیری نے ٹیڈ کے ہاتھ سے ریوٹ جھپٹ لیا اور ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے بولا، ”انھیں معلوم ہے کہ بچوں کے ملبوسات پر منافع کتنا ہوتا ہے؟ مجھے بھی معلوم نہیں، لیکن کثیر منافع ہوتا ہے۔ وہاں برما میں بچے دن بھر غلامی کرتے ہیں اور اس کے عوض انھیں صرف چاول کا ایک پیالہ ملتا ہے اتم نے دیکھا ہے کہ وہ اسٹور کتنا بڑا ہے؟ ذرا سوچو۔ بچوں کے ملبوسات جلد چھوٹے ہو جاتے ہیں، کیوں کہ بچے تیزی سے بڑھتے ہیں۔ ہر سال نئے لباس درکار ہوتے ہیں۔“

”لیکن وہ اسے چیک کیوں دے رہے ہیں؟“ ”بکواس مت کرو..... میں سوچ رہا ہوں۔“

ٹیڈ نے ریوٹ جھپٹنے کی کوشش کی۔ لیری نے اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔ ٹیڈ خاموشی سے لیری کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”میری سمجھ میں آگیا۔“ لیری نے کہا، ”سیدھی سی بات ہے۔ ہم زبردستی اس کے گھر میں نہیں گھسیں گے، ہم انتظار کریں گے۔“

”ہوں؟“ ”نیوز رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ وہ سینئر کو ایک بکتر بند ٹرک لے کر آرہے ہیں۔ بھی ہم یہ کام کریں گے، لیکن مکان کے سامنے نہیں، وہاں کیمرے کا عملہ ہوگا۔ ہر کوئی یہاں یہ سوچے گا کہ سرکس کا تماشا ہو رہا ہے۔“ اس نے یہ کہہ کر ٹیڈ کی طرف دیکھا۔ ”تمہاری اپنے دوست منکی سے اب بھی بات چیت ہوتی ہے؟“ ”ہم کبھی کبھی گالف ساتھ کھیلتے ہیں۔“ ٹیڈ نے

منکی سے اپنا تے ہوئے کہا، ”کیوں؟“ ”اب بھی فوج سے وابستہ ہے؟ ہم اس سے کچھ لے سکتے ہیں۔“ لیری نے کہا۔

☆☆☆☆

لیری اور ٹیڈ، سبز کرولا میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنی کارروائی کے مکان کے عین مقابل کھڑی کر رکھی تھی۔ لیری کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کے دو چھوٹے چھوٹے لباس تھے جن پر سرخ رنگ کے بٹن لگے تھے۔ ان میں سے ایک یہ ایک سوچ بھی لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچ والا بکس ٹیڈ کی جانب بڑھا دیا۔

”یاد ہے، منکی نے کیا کہا تھا؟“ ”ٹیڈ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ہاں، سرخ بتی والا بکس ٹرک کے نیچے لگانا ہے۔“

لیری نے ٹیڈ کے شانے پر ایک دھپ جما دی۔ ”نہیں، جس میں بتی لگی ہوئی ہے، وہ میرے پاس رہے گا۔ جس میں سوچ لگا ہوا ہے وہ ہم ہے۔ جب تم اسے ٹرک کے نیچے لگاؤ گے تو پھر سوچ کو جھٹکے سے دوسری طرف کر دینا۔ میرے بکس کی روشنی جل اٹھے گی۔ سو مجھے پتا چل جائے گا کہ ہم پھٹنے کے لیے تیار ہے۔ پھر ہم ٹرک کا تعاقب کریں گے۔ جب ہم ایک مناسب مقام پر پہنچیں گے تو میں بٹن دبا دوں گا۔“

”اگر تمہیں ہر بات معلوم ہے تو یہ کام تم خود کیوں نہیں کر لیتے؟“ ٹیڈ نے کہا۔

”اس لیے کہ یہ منصوبہ میں نے بنایا ہے۔ اب جاؤ۔“

”لیکن جب ہم پھٹ گیا تو پھر ہم کیا کریں گے؟“ ”جاؤ!“

لیری نے بکس ٹیڈ کی جانب دھکیل دیا۔ پھر جھک کر ٹیڈ کی جانب کا دروازہ کھولا اور اسے کار سے باہر دھکا دینے کے بعد دروازہ جھٹکے سے بند کر دیا۔

اسی دوران بکتر بند ٹرک آن پہنچا۔ دو بھاری بھر کم محافظ اس کے ساتھ تھے۔ گاؤن اور سلپہر پہنے ہوئے پڑوسی سڑک پر جمع ہونے لگے۔ روبن وینڈر بلٹ ہلکے نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس تھا۔ اسے دیکھ کر لیری کو ہائی سکول کے رقا ص یاد آ گئے۔ لیری اپنی کار میں دبک کر بیٹھ گیا اور ٹیڈ پر نظریں جمادیں۔

محافظوں میں سے ایک کورے لٹھے کے تھیلوں سے بھری شاٹنگ ٹرائی دھکیلتا ہوا ٹرک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دوسرا محافظ ٹرک کے عقب میں چوکنٹا کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنی گن پر تھا، دوسرے سے وہ لوگوں کو پرے رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

اتنے میں ایک کم سن لڑکا، جس کے بال گچھے کی شکل میں تھے، ٹھٹھا ہوا ٹرک کے عقب میں موجود محافظ کے پاس پہنچا۔

کار میں بیٹھے ہوئے لیری کو اس لڑکے کی باریک آواز صاف سنائی دی۔ وہ محافظ سے کہہ رہا تھا۔ ”کیا یہ اصلی گن ہے؟ میں نے سنا ہے کہ یہ پلاسٹک کی ہوتی ہیں۔“

”بھاگ جاؤ لڑکے!“ ”میں تم سے نہیں ڈرتا۔“ ”تم نے سنا نہیں، بھاگ جاؤ۔“

بچہ اپنا سر اس انداز سے کھجانے لگا جیسے بال کو سر سے اتار پھینکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ پیچھے ہٹا اور داہنی طرف گھوم گیا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹ پڑیں۔ ”یہ کیا کر رہا ہے؟“

”کون؟“ محافظ نے کہا اور ٹرک کے پہلو کی جانب لپکا۔

گھومتے ہی وہ ٹیڈ سے ٹکرا گیا۔

ٹیڈ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

محافظ نے ٹیڈ کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا، پھر بولا، ”تمہاری یہاں موجودگی کا کوئی مقصد ہونا چاہیے دوست!“

”کیا؟ نہیں۔ ہوں۔۔۔۔۔ ہاں۔ میں کرس کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ سب کچھ بالکل ”ریالٹی ٹی وی“ کی طرح لگ رہا ہے۔“ ٹیڈ نے اپنے ہاتھ اپنی جیبوں میں ڈال دیے تاکہ بم چھپا سکے۔

”یہ تم کیا چھپا رہے ہو دوست؟“ سیکورٹی گارڈ اپنے ہولٹر کا کلپ کھولتے ہوئے بولا۔ ساتھ ہی اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی۔

”کچھ نہیں۔“ ٹیڈ نے جواب دیا۔ ”ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔“

”کس کے لیے؟“

”اس ننھے جونی کے لیے۔“

”میرا نام جونی نہیں۔“ لڑکے نے کہا۔

ٹیڈ نے اپنی جیب میں سے بم نکالا اور اُس لڑکے کو تھماتے ہوئے بولا، ”بس، یہ اپنے ڈیڈی کو دے دینا۔ اُن کو بتانا کہ یہ گیراج کے لیے ہے۔“

لڑکے کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ”بہت خوب، ریموٹ! شکریہ!“

ٹیڈ نے منہ کھولا لیکن کچھ کہہ نہ پایا۔ اُس کے شانے

لٹک گئے اور وہ گھسٹے قدموں سے کار کی جانب پلٹ گیا۔

کار کے نزدیک پہنچ کر اُس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا، پھر ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔

”بم میرے ہاتھ سے نکل گیا۔“

”ہاں، میں نے دیکھ لیا۔“ لیری نے ٹیڈ کے پہلو

میں گھونسا رسید کرتے ہوئے کہا۔

ٹیڈ نے کھانتے ہوئے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ ”وہ لڑکے کے پاس ہے۔“

”وہ بھی میں دیکھ چکا۔“

”میں نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے ڈیڈی کے لیے ہے، وہ اُسے ریموٹ سمجھ رہا ہے۔“

لیری نے اس بار ٹیڈ کے بازو کو اپنے گھونے کا نشانہ بنایا۔

”ایک ریموٹ ہی ہے، ایک ریموٹ جن!“ لیری

نے آگے کی جانب جھکتے ہوئے کہا اور اپنی ٹھوڑی اسٹیرنگ ویل پر لٹکا دی۔

”لیری! تم ٹھیک تو ہونا؟“

”بکواس مت کرو۔“ لیری نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ محافظ ٹرائی میں سے آخری بیگ گھسیٹ کر ڈرگ کے عقبی حصے میں لاد رہے تھے، پھر ڈرگ کے دروازے بند ہو گئے۔ کھٹکا دو مرتبہ گھومنے کی آواز سنائی دی اور بکتر بند

ڈرگ وہاں سے روانہ ہو گیا۔

لیری نے آنکھیں مسلتے ہوئے اطراف کا جائزہ لیا۔

پڑوسی اپنے اپنے گھر پلٹ رہے تھے۔ سڑک پر بچے اب بھی موجود تھے۔ لیری کی نگاہ اُس لڑکے پر پڑی جس کے پاس ٹیڈ کا دیا ہوا بم تھا۔ لڑکے نے بم اپنی جیب سے نکالا اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

”تم یہیں ٹھہرو!“ لیری نے ٹیڈ سے کہا اور کار سے نیچے اتر آیا۔ پھر وہ تقریباً دوڑتا ہوا اُس لڑکے کے عقب

میں پہنچا۔ پیچھے سے گڈی پر ایک ضرب لگائی اور بم اُس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

”تم نے مجھے کیوں مارا؟“ لڑکا سڑک پر بیٹھ گیا اور ویوایلا مچانے لگا۔

لیری پلٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر اُس کی نگاہ چند پڑوسیوں پر پڑی جو لڑکے کا روناسن کر اُن کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔

اُن میں سے ایک سڑک پار ہی سے چلانے لگا۔

”اے سنو! تم نے اُس کے ساتھ کیا کیا ہے؟“

لیری دوڑ کر کار میں جا بیٹھا۔ کار اسٹارٹ کی اور تیزی سے رخ اُس سمت گھما دیا جہاں بکتر بند ڈرگ گیا تھا۔

☆☆☆☆

کرولا تیزی سے ہائی وے پر دوڑ رہی تھی۔

کار کی کھڑکیاں کھڑکھڑا رہی تھیں۔ پچھلے حصے سے تیز گزر گزراہٹ کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ کار کو خاصی مرمت درکار تھی، لیکن لیری فی الوقت اس بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“ ٹیڈ نے پوچھا۔

لیری نے اسٹیرنگ ویل مضبوطی سے تھاما ہوا تھا۔ وہ

پہلے خیال میں ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”وہ ڈرگ تو اس سمت نہیں آئے گا۔ ہے نا؟“

”نہیں۔“

”نہیں۔“

”ہم ہائی وے پر زیادہ تیز رفتاری سے جا سکتے ہیں۔“

”ہم وہاں پہلے پہنچ جائیں گے۔“

”کہاں؟“

”شاپنگ سینٹر، احمق!“

لیری نے تیزی سے کار شاپنگ سینٹر کی پارکنگ لاٹ

میں کھڑی کی اور پارکنگ ٹکٹ لیا۔ وہ بعد میں نکلنے وقت کسی قسم کی مشکل میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اُس نے

یاد دیکھی، جس میں سرخ بتی لگی تھی، ٹیڈ کو تھمایا اور دوسرا

بکس اپنی پتلون میں ٹھونس لیا۔

”تم اسے تھامے کار میں بیٹھے رہو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔“

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

”میں بم نصب کرنے جا رہا ہوں۔“

بکتر بند ڈرگ لیری کی توقع سے پہلے یہاں آ گیا

تھا۔ وہ آؤٹ ڈور پارکنگ میں کھڑا تھا۔ وہیں برابر

میں ایک چھوٹا سا چوترا تھا اور ایک چھوٹا سا اسٹیج بنا ہوا تھا۔

محافظوں میں سے ایک ڈرگ کے عقب میں کھڑا تھا

جبکہ دوسرا محافظ ڈرائیور کے ساتھ کیبن میں موجود تھا۔

لیری ٹہکتا ہوا ڈرگ کی جانب چل دیا۔ اُسے خود یقین

نہیں تھا کہ اُس کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ بھی ایک خیال اُس کے ذہن میں کوندا۔

وہ تیزی سے دوڑنے لگا اور لپک کر محافظ کے پاس

پہنچا۔ اُس نے محافظ کے پاس پہنچ کر شانے پر پھسکی دی۔

جب محافظ اُس کی جانب متوجہ ہوا تو وہ تیزی سے

بولا، ”اے سنو! مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔ وہاں ایک

بوڑھی عورت گر پڑی ہے۔ وہ زخمی ہے اور اُس کا خون بہہ رہا ہے۔“

محافظ اُس وقت خلال چبا رہا تھا۔ وہ بولا، ”ڈرگ کے

پاس سے پرے ہٹ جاؤ۔“

”ضرور۔“ لیری نے قدم پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا،

”لیکن مجھے مدد چاہیے۔ مجھے ابتدائی طبی امداد دینی

نہیں آتی۔“

گارڈ نے منہ پر زبان پھیرتے ہوئے تھوک کا

ایک گولا سڑک پر اگلا اور بولا، ”پارکنگ کا ملازم

کہاں ہے؟“

”وہاں کوئی بھی نہیں۔“

”ٹھیک ہے، آؤ، چلتے ہیں۔“ محافظ نے اپنے

ہولٹر کا کلپ بند کرتے ہوئے کہا۔ پھر لیری کا سر سے

پیر تک جائزہ لینے کے بعد بولا، ”نہیں، تم یہیں

ٹھہرو۔ ہورلیس سامنے کے حصے میں کیبن میں موجودہ

ہے۔ وہ میڈی کیئر والوں کو طلب کر لے گا۔ تم اُس سے بات کرو۔“

محافظ یہ کہہ کر تیزی سے پارکنگ لاٹ کی جانب

چل دیا۔

لیری نے اثبات میں سر ہلایا اور محافظ کی نظروں سے

اوجھل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ حلق خشک ہو چکا تھا۔ اُس

نے تھوک نکل کر اپنا حلق تر کیا۔

محافظ اب بند پارکنگ لاٹ کی اوٹ میں غائب ہو

چکا تھا۔

لیری نیچے جھک گیا۔ اُس کی انگلیاں پتلون کی

جیب میں موجود بم ٹٹول رہی تھیں۔ بم جیب میں کہیں

اٹک گیا تھا۔ وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے اپنی پتلون

درست کی تاکہ بم کسی دشواری کے بغیر جیب سے باہر

نکل آئے۔

بم نکالنے کے بعد وہ دوبارہ جھک گیا۔ پھر ایک ہاتھ

سے ڈرگ کے بمپر کے نیچے کوئی صاف ستھری خالی جگہ

ٹٹولنے لگا۔ اُس کی انگلیاں خالی جگہ تلاش کرنے میں کام



قدرِ گوہر

رومانیہ کی ایک ماہِ رخ، پری پیکر کی عجب کہانی
حسن و جمال، عزم و ہمت، خود آگہی اور مردم شناسی.....
اس میں کئی خوبیاں تھیں مگر ایک سب پر بھاری تھی

میجیکل سینڈو ویناؤ ترجمہ: صدیقہ علی

لیری کو بس کے ذریعے گھر واپس پہنچنے میں لگ گئے۔

جب وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو فلیٹ لمبی طرح تپ رہا تھا۔ ہوا کسی گرم کبل کی مانند ہر کمرے میں اُس کا پیچھا کر رہی تھی۔ اس نے سارے گھر کا جائزہ لیا، اس امید پر کہ شاید ٹیڈ وہاں کسی کمرے میں مل جائے۔

اُس نے ٹیڈ کے کمرے کا دروازہ دیکھا، پھر قالین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے پشت کاؤچ سے نکال دی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ٹی وی کا ریموٹ اٹھا لیا جو کاؤچ پر رکھا ہوا تھا۔ ریموٹ کا بٹن دباتے ہوئے وہ مختلف چینل کھنگالنے لگا۔ ”نیوز چینل“ آنے پر اُس کا ہاتھ رک گیا۔

”پاراماٹا کے ویسٹ فیلڈ شاپنگ سینٹر میں ہونے والی خیراتی تقریب دھماکے کے باعث ایسے میں بدل گئی۔ وہاں مسٹر روبن وینڈر بلٹ کو برابر کی رقم کے سکوں کے عوض ”ایکیٹوکڈز“ کی جانب سے ۱۰ ہزار ڈالر کا چیک پیش کیا جاتا تھا۔ اس سے قبل کہ چیک دینے کی تقریب منعقد ہوئی، کار پارکنگ میں ایک زوردار دھماکا ہوا جس ٹیڈ کرافورڈ نامی مقامی باشندہ ہلاک ہو گیا۔ وہ اپنی کار میں بیٹھا ہوا تھا۔ دھماکے کی وجہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکی۔“

لیری کو اب کچھ یاد آ گیا۔ وہ محافظ بھاری بھر کم تھیلے ٹرک میں منتقل کر رہے تھے اور بینکوں نے وہ رقم کیش کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

تو وہ کل رقم ۱۰ ہزار ڈالر تھی۔
لیری حساب لگانے لگا۔
۱۰ ہزار ڈالر یعنی ۱۰ لاکھ پیسے۔
گویا روبن وینڈر بلٹ کی کل جمع پونجی سکے ہی سکے تھے۔

۱۰ لاکھ پیسے کے سکے!
لیری نے غم و اندوہ کے مارے اپنا سر تھام لیا۔

یاب ہو گئیں۔

اُس نے ہم کو اُس مقام پر جمادیا۔
پھر وہ گھوم گیا۔ اُس کی انگلی ہم کے سوچ پر تھی۔
وہ اب بھی گھٹنوں کے بل ٹرک کے پاس جھکا ہوا تھا۔ پھر اُس نے ایک گہرا سانس لیا، پلٹ کر کار پارکنگ کی جانب دیکھا، اثبات میں سر ہلایا اور سوچ آن کر دیا۔

اسی وقت زمین لرز گئی، یوں لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔
کار پارکنگ کی جانب سے ایک زبردست دھماکے کی آواز سنائی دی۔ قریب کھڑی کاروں کی کھڑکیوں کے شیشے چٹخ گئے۔ لیری کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین میں سے ایک بڑی سی لہر ابھرتی ہوئی اُس کی ٹانگوں میں سے گزری اور اُس کے پیٹ میں داخل ہو گئی۔ اُس کے پیٹ میں مروڑ سا اٹھ رہا تھا۔

یہ کیا ہو گیا؟ کیا کسی کار کا حادثہ ہوا ہے؟ شاید کوئی وین کار پارکنگ کی دیوار میں جا گھسی ہے، لیکن اُسی وقت کیوں؟ عین اُسی لمحے جب اُس نے ہم کا سوچ ایک جھٹکے سے آن کیا تھا؟

اُس نے بکتر بند ٹرک کے سامنے والے حصے سے دوسرے محافظ کو اترتے دیکھا۔ محافظ نے دروازہ جھٹکے سے بند کیا اور کار پارکنگ کی جانب دوڑ پڑا۔ ساتھ ہی وہ لیری پر چلا رہا تھا کہ وہ اُس کے راستے سے ہٹ جائے۔

لیری اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی سماعت متاثر نہیں ہوئی تھی، لیکن دھماکے کی آواز اب بھی اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اُس کا ذہن دھماکے کے تانے بانے جوڑنے میں الجھ گیا۔

ہم کے دو حصے تھے: ریموٹ ٹرانسنگر اور پن بہ ذاتِ خود! اُس نے ٹرانسنگر ٹرک کے نیچے نصب کر کے پھر سوچ آن کیا تھا۔ اور..... اور ہم ٹیڈ کے پاس تھا۔

☆☆☆☆

سلطانہ بولی۔ ”اچھا، یہ تم ہو۔ میں سمجھی تھی، چور وغیرہ آگھے ہیں۔“ اس کی آواز سے گھنٹیاں بج اٹھیں مگر لہجے میں تمسخر تھا۔ اپنا جملہ ختم کر کے اچانک اس نے ہاتھ اٹھایا اور تنگی تلوار چمکی۔ تلوار کی غیر متوقع چمک سے نکولا گڑ بڑا گیا۔ سلطانہ نے کسی تاخیر کے بغیر اس کے سر پر تلوار سے ایک زور دار ضرب لگائی، نکولا لڑکھڑا گیا، پھر اس سے پہلے کہ سانس بھی مدد کو آگے بڑھتے، سلطانہ کے ملازمین نے ان پر دھاوا بول دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نکولا اور اس کے ساتھیوں کو پسپا ہونا پڑا اور وہ جان بچا کر بدحواسی سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

اس سانحے نے نکولا کو گوشہ نشین کر دیا۔ وہ ہر وقت اپنی حویلی کے ایک گوشے میں پڑا آہیں بھرتا رہتا۔ اس کا واحد غم گسار ویسائل تھا۔ ایک روز نکولا نے روتے ہوئے ویسائل سے کہا کہ اب ہم سلطانہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

ویسائل نے آہستہ سے کہا ”میں سمجھ سکتا ہوں، آپ پر کیا گزر رہی ہے۔“ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے نکولا کو کوہما سے مدد لینے پر اکسایا اور کہا کہ اگر وہ مہم پر آمادہ ہو گیا تو سلطانہ آپ کے پہلو میں ہوگی اور آپ جانتے ہیں کہ کوہما، دولت کے عوض کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

نکولا نے کوہما سے ملاقات کی۔ کوہما ایک شان دار گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ گھوڑے کی گردن پر تھا، وہ گھنٹوں تک چری جوتے پہنے ہوئے تھا۔ جوتوں میں آگے کی طرف لوہے جڑے تھے، شانے سے رائفل لٹک رہی تھی اور سر پر اونی سیاہ ٹوپی تھی۔ وہ گھوڑے سے اتر کے مضبوط قدموں کے ساتھ نکولا کی جانب بڑھا۔

نکولا نے اب تک اس کا صرف نام ہی سنا تھا۔ اسے اپنے سامنے کھڑا پایا تو دم بخود رہ گیا۔ وہ تھا ہی اتنا بارعب! ایک تو اس کی شخصیت کا جاہ و جلال، دوسرے اس کی شہرت۔ دونوں باتیں لوگوں کو خوف زدہ کرنے میں مہمیز کا کام کرتی تھیں۔

گفتگو میں پہل کوہما ہی نے کی۔ ”خدا تم پر مہربان ہو۔“ ”خوش آمدید کوہما! میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ ویسائل نے جواب دیا۔ نکولا ابھی تک خاموش تھا۔

”میرے بھائی کوہما! تمہاری مہربانی کہ تم ہماری مدد کر رہے ہو۔“ ویسائل نے نکولا کو خاموش دیکھ کر گفتگو کا آغاز کیا۔ ”ہاں! میں آگیا ہوں۔“ کوہما کی آواز میں شہرے لیک تھی۔ اس کا چہرہ اتنا سنجیدہ تھا جیسے کبھی اس چہرے پر مسکراہٹ آئی ہی نہ ہو۔

”ہاں..... ہاں..... تم آگئے۔“ نکولا ایک دم بول اچھے اچانک گہری نیند سے بیدار ہے۔ اس نے ویسائل کو حکم دیا۔ ”قبوے کا انتظام کرو..... اور ذرا جلدی۔“ ”میں قبوہ نہیں پیتا۔“ کوہما نے کھردرے لہجے میں جواب دیا۔

”بہت خوب، تم ہماری مدد کے لیے آئے ہو، تمہارا معاوضہ کیا ہوگا؟“ نکولا کچھ سنبھل گیا تھا، اس نے بھی براہ راست سوال کیا۔

”۵۰ ہزار۔“

نکولا نے ویسائل کو حکم دیا۔ ”رقم کی تحویل لاؤ۔“ ”نہیں۔“ نکولا نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”ابھی مجھے رقم نہیں چاہیے۔ یہ ایک سودا ہے، میں فراسینی سے سلطانہ کو کر تمہارے حوالے کروں گا، تم مجھے رقم ادا کرو گے۔ رات ہونے تک میں یہیں وقت گزاروں گا۔“ یہ کہتا ہوا کوہما اپنے گھوڑے سے اتر کر باغ میں گھاس پر لیٹ گیا۔

☆☆

کوہما، فراسینی پہنچا تو پوری بستی سو رہی تھی۔ اس نے حویلی کے بیرونی دروازہ پہ پہنچ کر زور زور سے دروازہ کھٹ کھٹایا۔

”کون ہے!“ اندر سے کسی پوچھا۔

”دروازہ کھولو۔“ کوہما نے حکم دیا۔

”تم ہو کون؟“ اندر سے پھر استفسار کیا گیا۔

”کھولو!“ کوہما دہاڑا۔ مزید سرگوشیاں ہونے لگیں۔

”کب تک انتظار کرنا پڑے گا!“ کوہما برہم ہو گیا۔

”نام بتاؤ ورنہ دروازہ نہیں کھلے گا۔“ اندر سے آواز آئی۔

”نام سننا چاہتے ہو، اچھا سنو، کوہما داکورے۔“

اندر خاموشی چھا گئی، پھر دروازے کی جھریوں سے روشنی

پڑی اور قلعہ کا دروازہ کھل گیا۔ کوہما اعتدال سے اندر پہنچا اور اندر سے کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اسے روکے۔ اندرونی دروازہ کھلا ہوا تھا، کوہما دروازہ اندر چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہونے سے اندر اندر لگا کر عورت دلیر معلوم ہوتی ہے۔

راہ داری میں کوہما کے بھاری جوتے گونج پیدا کر رہے تھے۔ ساتھ اندر کسی کمرے میں ہلکا سا شور ہوا، کوہما نے اسے دیکھا۔ اسی وقت راہ داری اچانک روشن ہو گئی۔ کوہما نے دیکھا کہ خواب گاہ کے دروازہ پر ایک عورت کھڑی ہے۔ وہ ہی سلطانہ تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ وہ لب خالی کا باریک سفید لباس زیب تن کیے ہوئے تھی۔

”کون ہو تم؟“ اور یہاں کس مقصد سے آئے ہو؟“ عورت نے سختی سے پوچھا۔

”میں کوہما ہوں اور رئیس نکولا کے لیے تمہیں لینے آیا ہوں۔“ کوہما نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”اچھا۔“ سلطانہ نے اپنی تلوار اٹھائی۔ ”میں ابھی سبق سن رہی ہوں، تمہیں بھی اور تمہارے رئیس نکولا کو بھی۔“

کوہما پیچھے ہٹنے کے بجائے اس کے اور قریب ہو گیا۔ اس نے چشم زدن میں عورت کی کلائی گرفت میں لے لی، تلوار عورت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی، وہ زور زور سے پکارنے لگی۔ ”گیریل! نکولا! نکولا! نوڈور! نوڈور۔“

حفاظت تیزی سے کوہما کی طرف بڑھے۔ کوہما ایک ہاتھ سے سلطانہ کو پکڑے ہوئے تھا، دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی اور آنکھوں میں چیتے جیسی چمک۔ اس کی خوں خواری دیکھ کر حافظہ ٹھنک گئے۔

کوہما کے رعب نے انہیں مفلوج کر دیا۔ انہیں رکتا دیکھ کر عورت نے ایک دم کوہما سے ہاتھ چھڑایا اور دیوار کی طرف لپکی، وہاں تنگی ہوئی تلوار کھینچ کر وہ اپنے آدمیوں پر نکل پڑا۔ ”بڑو! کھڑے کیا ہو، اسے باندھ دو۔“

”مامام!“ کوہما نے جھل سے کہا۔ ”آپ کیوں الفاظ ضائع کر رہی ہیں، آپ کے نمک خوار آپ کی طرح بہادر نہیں۔“

”سرکار!“ ایک ملازم نے ہکلا کے کہا۔ ”اسے ہم کیسے باندھ سکتے ہیں؟ یہ کوہما ہے، کوہما داکورے، اس پر رائفل کی گولیاں بھی اثر نہیں کرتیں۔“

نوکروں سے مایوس ہو کر سلطانہ خود کوہما پر جھپٹ پڑی۔ کوہما نے بھی برق رفتاری کا مظاہرہ کیا اور سلطانہ کو آنا فانا بے بس کر کے کسی پوری کی طرح اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ ملازم تتر بتر ہو گئے۔ کوہما نے آگے بڑھتے ہوئے سوچا، کیا عورت ہے؟ نکولا کی پسند واقعی قابل داد ہے۔

باہر آ کر کوہما گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سلطانہ کو اس نے آگے بٹھا لیا۔ مالک کا اشارہ ملتے ہی گھوڑا تارکی میں سرپٹ دوڑنے لگا۔ کچھ راستہ طے ہوا تو سلطانہ نے چہرہ موڑا اور مدھم چاندنی میں کوہما کو غور سے دیکھا۔

گھوڑے کی رفتار اور تیز ہو گئی تھی۔ سلطانہ کے بال ہوا میں لہرا رہے تھے، وہ رہ رہ کے لیرے کو دیکھ رہی تھی۔

کوہما کے ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط تھے اور سیاہ چمک دار آنکھیں پتھر کی طرح سخت تھیں۔ گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ منزل نزدیک آتی جا رہی تھی، چاند بادلوں میں تیر رہا تھا۔ کبھی چھپ جاتا، کبھی سامنے آ جاتا، دونوں خاموش تھے، سلطانہ پوری طرح کوہما کی طرف متوجہ تھی مگر کوہما ایسے بیٹھا تھا جیسے اس کے وجود سے بے خبر ہو۔

منزل پر پہنچ کر درختوں میں ہلکی روشنی اور کچھ انسانی سائے نظر آئے۔ سلطانہ نے پوچھا۔ ”یہ کون لوگ ہیں؟“

کوہما نے بتایا۔ ”نکولا اور اس کے ساتھی، یہ ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔“ سلطانہ خاموش ہو گئی۔ وہ کوہما کے بازوؤں کے حصار میں تھی، اس کے دونوں ہاتھ آزاد تھے۔ اس نے تیزی سے دایاں ہاتھ بڑھا کے گھوڑے کی لگام تھامی اور بائیں کلائی کوہما کی گردن میں حائل کر دی۔ گھوڑا جھٹکا کھا کر رفتار کم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ سلطانہ کوہما کے سینے پر سر رکھ کے سرگوشی کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے کسی کو مت دو۔“

کوہما نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا اور لگام ڈھیلی کر دی۔ گھوڑے نے رخ موڑا اور تاریکی میں حرکت کرتے ہوئے سائے پیچھے چھوڑ کے گھنے جنگلوں میں گم ہو گیا۔

رشتے ویسے کیوں نہیں ہوتے جیسے نظر آتے ہیں

مسکراتی آنکھوں میں چھپے آنسو

ایک پھولوں جیسی بیٹی کے دکھ سے مرجھانے کا ماجرا
اس کی مان تب خاموش ہو گئی تھی جب
ایک جملے کی بہت ضرورت اور خواہش تھی

صبا عاطف

کالج

میں میرا آخری دن تھا۔ بی ایس سی کا فائنل نتیجہ آچکا تھا۔ ہر کوئی خوش تھا لیکن سب سے زیادہ ہوش کی لڑکیاں خوش تھیں کہ ہم سب سہیلیوں نے منصوبہ بنایا تھا۔ اب سارا وقت گھر پر گزاریں گے، ہوشل سے مل آگئے تھے۔

سیماب بھاگتی ہوئی ہوشل کے کمرے میں آئی اور بولی: "ہاں جانتی ہوں! لیکن میری بہت قیمتی چیز گم ہو گئی ہے۔ وہ چیز دل کو اوپر نیچے کرتے ہوئے تلاش میں تھی کہ باقی چلائی: "ہاں مل گئی۔"

"سیماب دکھاؤ! کیا تھی تمہاری قیمتی چیز؟" سیماب نے گئی: "یہ تو تمہارے پاپا کی تصویر ہے۔"

"ہاں! یہی میرے لیے سب سے قیمتی چیز ہے۔ میں نے پاپا کو بہت یاد کرتی ہوں۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ہمیشہ میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔"

"جانتی ہوں تمہارے دل میں غم بھرا ہے، لیکن پھر بھی تم ہر وقت چہکتی رہتی ہو۔ ہوشل میں تمہاری وجہ سے ہمارا دل لگا رہا۔ سب سمجھتے ہیں کہ تمہیں کوئی غم نہیں لیکن میں اس حقیقت سے آگاہ ہوں۔"

"میں تو پھول ہی گئی تھی۔ نیچے سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں چلو۔ گروپ فوٹو بنوانے کے بعد سب جانے کے لیے تیار تھے۔ اسی سیماب کے ابو آگئے۔" سیماب ہاتھ ہوتی گئی اور ان کے گلے لگ گئی۔ یہ دیکھتے ہوئے ادا کو اپنے پاپا کی یاد آنے لگی جو زوہا سے بے حد پیار کرتے تھے۔

"ہاں ہاں جانتا ہوں، یہ زوہا تمہاری بہترین دوست ہے۔"

"السلام علیکم انکل! کیسی ہو بیٹا؟ ٹھیک ہوں۔ سیماب بیٹا تم اپنی دوست سے ملو، میں گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"تمہیں کوئی لینے نہیں آیا؟ میں تمہیں چھوڑ دوں؟" "نہیں امی کا فون آیا تھا، وہ مجھے لینے آرہی ہیں۔" سیماب کے جانے کے بعد ایک کروڑا گاڑی آئی۔ زوہا بھاگتے ہوئے گئی۔ اس نے پچھلا دروازہ کھولا لیکن ہمیشہ کی طرح اس کے خواب ادھورے ہی رہے۔ رامو کا گاڑی سے نکلے۔ "بیٹا کیسی ہو؟"

"رامو کا کا، مام نہیں آئیں؟" "بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ نہیں آئیں۔ تم بیٹھو بیٹا۔ میں تمہارا سامان لے کر آتا ہوں۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور غائب ہو گئے۔ گاڑی گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ "رامو کا کا گاڑی روکیے، وہ پھولوں کی دکان سے میں نے مام کے لیے پھول لینے ہیں۔ انہیں پھول بہت پسند ہیں۔"

زوہا نے پھولوں کا گلدستہ خریدا اور گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد گھر کے گیراج میں گاڑی رکی اور وہ بھاگتے ہوئے اندر آئی۔ "مام مام! میں آگئی۔ آپ کہاں ہیں مام؟" سامنے شمعو ماسی کھڑی تھیں ان سے گلے ملتے ہوئے وہ کہنے لگی کہ مام کدھر ہیں؟

"وہ لان میں تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔" شمعو ماسی نے کہا۔ زوہا بھاگتی ہوئی لان میں گئی۔ مام میں نے سارے گھر میں آپ کو تلاش کیا آپ یہاں ہیں۔ ہائے مام! یہ آپ کے لیے..... آپ کو پھول بہت پسند ہیں نا زوہا نے سمعیہ بیگم کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

تمہارا سفر کیسا رہا؟
"بہت اچھا مام۔" رامو کا کا کہہ رہے تھے کہ آپ

کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا ہوا؟

میں ٹھیک ہوں رامو کا کا بھی نا..... جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہیں پتا ہے کہ میں فضول میں گھر سے نہیں نکلتی۔ سمعیہ بیگم نے بائیں اپنے گرد سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ فریش ہو جاؤ کھانے کا وقت ہو گیا ہے اور وہ چلی گئیں۔

زوہا بہت دیر تک لان میں ساکت کھڑی سوچتی رہی، کیا سب کی مائیں اپنے بچوں کے ساتھ یہی کرتی ہیں.....؟ کیا وہ اسی طرح خوش ہوتی ہیں.....؟ انہیں میرے واپس آنے کی کوئی خوشی نہیں ہوتی.....؟ میرے آنے سے یہ اداس لگ رہی ہیں، ایسا کیوں ہے؟ وہ ناجانے کتنے سوال خود سے کر بیٹھی۔ اس سے پہلے اور کئی سوال اس کے ذہن میں ابھرتے۔ شمعو ماسی نے آتے ہی کہا، بیٹا، بیگم صاحبہ تمہارا کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔ کھانا کھاتے ہوئے سمعیہ بیگم نے پوچھا کہ آگے کے کیا پلان ہیں؟ کچھ تو سوچا ہوگا۔

نہیں مام میں اپنا وقت آپ کے ساتھ گزاروں گی۔ ہوٹل لائف سے بہت تنگ آ گئی ہوں۔ سمعیہ بیگم نے کہا کہ کراچی یونیورسٹی میں ایم۔ بی۔ اے میں تمہارا ایڈمیشن کرا دیا ہے۔ نمبر بہت اچھے لیے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئیں۔

زوہا چلائی رہی، نہیں مام اب میں کہیں نہیں جانا چاہتی، صرف آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، مجھے کہیں نہیں جانا۔۔۔۔۔ یہ گھر ڈیفنس میں واقع کسی محل سے کم نہیں تھا۔ پیسے کی کمی نہ تھی۔ کی تھی تو صرف پیار، محبت، خلوص کی۔

زوہا نے سوچا کہ کاش ہم غریب ہوتے۔ پاپا تو چھوٹی عمر میں چھوڑ گئے، کم سے کم ماں کا پیار تو ہوتا۔ سکول میں چھٹی کے وقت جب ماؤں کو اپنے بچوں سے پیار کرتے دیکھتی تو دل خوش ہونے کے بجائے ٹوٹ جاتا۔ ”ناجانے کتنے سنے ابھرتے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سو جاتے ہیں“

اگلے دن زوہا نے اپنا پرس اٹھایا اور باہر نکلے دروازے کی طرف جانے لگی لیکن آگے سمعیہ بیگم کھڑی تھیں۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“ وہ مام کہیں نہیں، بس یوں ہی کچھ دیر کے لیے جا رہی ہوں۔

میں نے یاد دہانی کروانی تھی کہ سجاد آرہے ہیں۔ وہ تمہیں ایم۔ بی۔ اے کے بارے میں بتائیں گے۔ شام ہونے سے پہلے آ جانا۔ سمعیہ بیگم نے شمعو ماسی کو آواز دی کہ اچھی سی چائے میرے کمرے میں بھیج دیں۔ کچھ دیر بعد شمعو ماسی چائے لے کر آئیں اور بولیں ”بیگم صاحبہ آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“

ہاں کہو! آپ زوہا سے ایسا سلوک نہ کریں۔ وہ بچی ہے۔ جانتی ہوں، وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔ کیا کروں میں، جب اسے دیکھتی ہوں تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ اسی لیے تو اسے دور بھیج رہی ہوں۔ آپ اسے سچ کیوں نہیں بتا دیتیں؟

نہیں بتا سکتی، میں نے اس کے پاپا سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے جانے کے بعد اس کا خیال رکھوں گی۔ زوہا کو جلتے ہوئے کافی دیر ہو گئی لیکن اجنبی لوگوں کی طرح وہ چلتی جا رہی تھی۔ نہ جانے کس دنیا میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس فکر سے آزاد کہ اسے گھر واپس جلدی جانا ہے، اس نے سوچا:

”کس قدر بے کیف اور بے رونق سی زندگی ہے“ اس نے ایک سوکھے ہوئے پتے کو ہاتھ میں پکڑا اور ایک سرد آہ بھرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ آنسوؤں کے کئی قطرے اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے دامن میں جذب ہو گئے۔

خزاں کا موسم تھا۔ سوکھے پتوں پر چلی تو پتوں نے عجیب سا شور مچا کر اس کے غم میں شرکت کی۔ اداس موسم میں دل بے چین و بے قرار تھا۔ طویل

میں بعد اس کی نگاہوں میں ماضی کی دھندلی تصویر بن گئی۔

جب تیار ہوتی تو مام سے کہتی، مام آج آپ کہیں مت جائیں۔ پاپا کے سامنے وہ مشکل سے مسکراتیں اور جیتیں مجھے بہت اہم پارٹی میں جانا ہے۔ اب تم بڑی ہوئی، ہو تم چھوٹی نہیں ہو۔

کیا چھ سال کی بچی چھوٹی نہیں ہوتی؟ ”یہی وہ لفظ تھے جو دل پر نقش ہو کر رہ جاتے“ پاپا بھی مام سے کہتے کہ اس کی بات مان لیا کرو، وہ تم سے اتنا پیار کرتی ہے، اپنی ذمہ داری کو سمجھو۔

”ارسلان احمد! آپ نے اپنی ذمہ داری پوری کی؟“ آپ جانتے ہیں آپ کی ذمہ داری کیا ہے؟“ اس جھگڑے پر بات ختم ہوتی اور وہ چلی جاتیں۔ پھر پاپا اس کے پاس آتے، اس سے پیار کرتے، سمجھاتے کہ بیٹا وہ بہت کام کرتی ہیں، ان کے پاس وقت نہیں ہوتا، تمہارے پاپا تو تمہارے پاس ہیں نا۔

پھر پاپا بھی ہمیشہ کے لیے دور چلے گئے۔ شاید ان کے پاس بھی میرے سوالوں کے جواب نہ تھے کہ مام مجھ سے پیار کیوں نہیں کرتیں؟ شمعو ماسی کو میں نے اکثر اپنے لیے روتے دیکھا۔ میں سوچا کرتی کہ کاش یہ میری ماں ہوتیں۔ مجھ سے کتنا پیار کرتیں۔

یہ سوچتے سوچتے وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ وہ جلدی سے گھر آئی تو سمعیہ بیگم انتظار میں تھیں اور شمعو ماسی ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ زوہا کو دیکھتے ہی چلائیں ”کہاں سے آرہی ہو؟“ وقت دیکھا ہے رات کے دس بج چکے؟ کہا تھا سجاد آئیں گے، وہ انتظار کرتے ہوئے چلے گئے۔ جانتی ہو مجھے کتنا شرمندہ ہونا پڑا۔ کیوں مجھے دوسروں کے سامنے ذلیل کرنا چاہتی ہو، آج مجھے بتاؤ؟؟ تم چاہتی کیا ہو؟ میرے سوال کا جواب دو؟“

مام میں بھی آپ سے سوال کرنا چاہتی ہوں، کیا

آپ میرے سوال کا جواب دینا پسند کریں گی؟ ”کیوں آپ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہیں؟ کیوں آپ دوسری ماؤں کی طرح نہیں ہیں؟ کیوں آپ میرے ساتھ پیار نہیں کرتیں، جیسا دوسری مائیں اپنے بچوں کے ساتھ کرتی ہیں۔ آنسو تھے کہ بہہ چلے جا رہے تھے جیسے نہ تھمنے والی برسات ہو رہی ہو۔ کیوں مام کیوں جواب دیں؟؟؟ کیوں میرے آنے سے پہلے ہی میرے جانے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔“

کیا باقی گھروں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، جواب دیں مام..... جواب دیں کیوں چھوٹی سی عمر میں پاپا کے جانے کے بعد آپ نے مجھے ہوٹل میں بھیج دیا کہ بچے ہوٹل میں اچھا پڑھتے ہیں۔ کیوں آپ نے مجھے گھر سے اتنا دور کیا؟ کیوں میں بچپن سے لے کر آج تک ہوٹل میں رہی؟ کیوں مام کیوں؟

میں چاہتی تھی کہ آپ کے ساتھ رہوں۔ مجھے میری ماں چاہیے تھی۔ جب ہوٹل میں سب سہیلیاں اپنی ماؤں کی باتیں کرتیں تو میں سونے کا بہانہ دیتی۔ میرے پاس میری ماں کا خوب صورت تصویر ہی نہ تھا کیا کرتی؟

سکول میں جب بچوں کا پروگرام (فنکشن) ہوتا، سب بچوں کی مائیں ان کے ساتھ ہوتیں اور میں نہ جانے کتنی بار دروازے کی طرف دیکھتی کہ شاید اب میری مام آجائیں۔ اب میں اتنے سال کے بعد آئی ہوں۔ آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ چھٹیوں میں آپ آنے نہیں دیتی تھیں۔ اب آپ چاہتی ہیں کہ میں ایم۔ بی۔ اے کرنے کراچی چلی جاؤں۔ کیوں مام؟

”میرے پاس تمہارے فضول سوالوں کا جواب نہیں“ کیوں جواب نہیں مام؟ آپ ایسا کیوں کرتی رہیں؟ آج مجھے میرے سوالوں کا جواب چاہیے..... مام جواب دیں۔ کیوں پاپا کے سامنے آپ میرے ساتھ اچھا پیش آنے کا ڈرامہ کرتیں اور بعد میں بدل جاتیں؟ جواب دیں؟؟

سمعیہ بیگم نے غصے میں بولنا شروع کر دیا۔ وہ یہ بھول

عرصے بعد اس کی نگاہوں میں ماضی کی دھندلی تصویر سامنے لگی۔

جب تیار ہوتی تو مام سے کہتی، مام آج آپ کہیں مت جائیں۔ پاپا کے سامنے وہ مشکل سے مسکراتیں اور کہتیں مجھے بہت اہم پارٹی میں جانا ہے۔ اب تم بڑی ہوگئی، ہوتم چھوٹی نہیں ہو۔

کیا چھ سال کی بچی چھوٹی نہیں ہوتی؟ ”یہی وہ لفظ تھے جو دل پر نقش ہو کر رہ جاتے“ پاپا بھی مام سے کہتے کہ اس کی بات مان لیا کرو، وہ تم سے اتنا پیار کرتی ہے، اپنی ذمہ داری کو سمجھو۔

”ارسلان احمد! آپ نے اپنی ذمہ داری پوری کی؟ آپ جانتے ہیں آپ کی ذمہ داری کیا ہے؟“

اس جھگڑے پر بات ختم ہوتی اور وہ چلی جاتیں۔ پھر پاپا اس کے پاس آتے، اس سے پیار کرتے، سمجھاتے کہ بیٹا وہ بہت کام کرتی ہیں، ان کے پاس وقت نہیں ہوتا، تمہارے پاپا تو تمہارے پاس ہیں نا۔

پھر پاپا بھی ہمیشہ کے لیے دور چلے گئے۔ شاید ان کے پاس بھی میرے سوالوں کے جواب نہ تھے کہ مام مجھ سے پیار کیوں نہیں کرتیں؟ شمعو ماسی کو میں نے اکثر اپنے لیے روتے دیکھا۔ میں سوچا کرتی کہ کاش یہ میری ماں ہوتیں۔ مجھ سے کتنا پیار کرتیں۔

یہ سوچتے سوچتے وقت کا پتا ہی نہ چلا۔ وہ جلدی سے گھر آئی تو سمیعہ بیگم انتظار میں تھیں اور شمعو ماسی ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش میں لگی ہوئی تھیں۔ زوہا کو دیکھتے ہی چلائیں ”کہاں سے آرہی ہو؟ وقت دیکھا ہے رات کے دس بج چکے؟ کہا تھا سجاد آئیں گے، وہ انتظار کرتے ہوئے چلے گئے۔ جانتی ہو مجھے کتنا شرمندہ ہونا پڑا۔ کیوں مجھے دوسروں کے سامنے ذلیل کرنا چاہتی ہو، آج مجھے بتاؤ؟؟ تم چاہتی کیا ہو؟ میرے سوال کا جواب دو؟“

مام میں بھی آپ سے سوال کرنا چاہتی ہوں، کیا

آپ میرے سوال کا جواب دینا پسند کریں گی؟ ”کیوں آپ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہیں؟ کیوں آپ دوسری ماؤں کی طرح نہیں ہیں؟ کیوں آپ میرے ساتھ پیار نہیں کرتیں، جیسا دوسری مائیں اپنے بچوں کے ساتھ کرتی ہیں۔ آنسو تھے کہ بہے چلے جا رہے تھے جیسے نہ جھنے والی برسات ہو رہی ہو۔ کیوں مام کیوں جواب دیں؟؟؟ کیوں میرے آنے سے پہلے ہی میرے جانے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔“

کیا باقی گھروں میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، جواب دیں مام..... جواب دیں کیوں چھوٹی سی عمر میں پاپا کے جانے کے بعد آپ نے مجھے ہوٹل میں بھیج دیا کہ بچے ہوٹل میں اچھا پڑھتے ہیں۔ کیوں آپ نے مجھے گھر سے اتنا دور کیا؟ کیوں میں بچپن سے لے کر آج تک ہوٹل میں رہی؟ کیوں مام کیوں؟

میں چاہتی تھی کہ آپ کے ساتھ رہوں۔ مجھے میری ماں چاہیے تھی۔ جب ہوٹل میں سب سہیلیاں اپنی ماؤں کی باتیں کرتیں تو میں سونے کا بہانہ دیتی۔ میرے پاس میری ماں کا خوب صورت تصویر ہی نہ تھا کیا کرتی؟

سکول میں جب بچوں کا پروگرام (فنکشن) ہوتا، سب بچوں کی مائیں ان کے ساتھ ہوتیں اور میں نہ جانے کتنی بار دروازے کی طرف دیکھتی کہ شاید اب میری مام آجائیں۔ اب میں اتنے سال کے بعد آئی ہوں۔ آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ چھٹیوں میں آپ آنے نہیں دیتی تھیں۔ اب آپ چاہتی ہیں کہ میں ایم۔ بی۔ اے کرنے کراچی چلی جاؤں۔ کیوں مام؟

”میرے پاس تمہارے فضول سوالوں کا جواب نہیں“ کیوں جواب نہیں مام؟ آپ ایسا کیوں کرتی رہیں؟ آج مجھے میرے سوالوں کا جواب چاہیے..... مام جواب دیں۔ کیوں پاپا کے سامنے آپ میرے ساتھ اچھا پیش آنے کا ڈرامہ کرتیں اور بعد میں بدل جاتیں؟ جواب دیں؟؟

سمیعہ بیگم نے غصے میں بولنا شروع کر دیا۔ وہ بھول

تھیں کہ انہوں نے اپنے شوہر سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زوہا کو خیال رکھیں گی۔ وہ چلائیں:

”یہ درست ہے کہ ارسلان احمد تمہارے پاپا ہیں لیکن میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔“

جب میں تمہیں دیکھتی ہوں مجھے تکلیف ہوتی ہے، اسی لیے میں نہیں چاہتی کہ تم میرے سامنے رہو۔ اسی لیے میں نہیں اپنے سے دور کرتی گئی۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

آنسو تھے کہ آنکھوں سے نکلتے گئے اور وہ جہاں کدوڑی تھی، وہیں بیٹھ گئی۔ روتے روتے اس نے سوچا، کاش میں مام سے یہ سوال نہ کرتی، میں انہیں اپنی ماں تو سمجھ رہی تھی۔ روتے ہوئے کافی رات ہوگئی، کب اس کی آنکھ لگ گئی، اسے پتا ہی نہ چلا۔ صبح ہوئی تو زوہا ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھی۔ رات کی ساری باتیں نظر انداز کرتے ہوئے ایک نئی زندگی گزارنے کا عہد کیا۔

بچپن میں گئی اور ناشتہ بنانے لگی۔ شمعو ماسی کچن میں آئیں اور حیران رہ گئیں۔ زوہا تم کیا کر رہی ہو۔ تم رہنے دو، میں ناشتہ بناتی ہوں۔ نہیں شمعو ماسی آج میں مام کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتہ بناؤں گی۔ شمعو ماسی، ناشتہ ٹیبل پر سجانے لگی۔ سمیعہ بیگم ناشتے کے لیے آئیں تو زوہا نے گلاس میں رس ڈالتے ہوئے انہیں دیا، یہ سوچے بنا کہ رات کو کیا ہوا تھا۔

”شمعو ماسی اتنی چیزیں بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ جانتی ہیں میں ناشتے میں صرف چائے لیتی ہوں۔“ سمیعہ بیگم نے کہا۔

بیگم صاحبہ یہ سب میں نے نہیں زوہا بیٹی نے آپ کے لیے بنایا ہے۔

چائے پیتے ہوئے ان کی نظر قریب رکھے بیگ پر پڑی، یہ کس کا سامان ہے رامو کا کا؟

”یہ میرا سامان ہے مام میں نہیں چاہتی کہ آپ کو میری وجہ سے اور تکلیف پہنچے۔ میں یہاں سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔“

بندوق کیوں سنبھال رکھی ہے؟

ایک بڑے میاں بندوق لیے اپنے خربوزوں کے کھیت پر پہرہ دے رہے تھے۔ ایک راہ گیر نے کہا ”کیے ہیں یہاں کے لوگ؟“

”ایماندار ہیں۔ کیا مجال جو میرے خربوزوں کو ہاتھ لگائیں۔“

راہ گیر نے کہا ”یہ بندوق آپ نے کیوں سنبھال رکھی ہے؟“

بڑے میاں بولے ”ان کو ایماندار رکھنے کے لیے۔“

”تمہارے پاپا تمہارے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئے ہیں کہ تم آرام سے زندگی گزار سکو۔ سمیعہ بیگم نے کہا۔ ویسے بھی تمہارے پاپا سے میں نے وعدہ لیا تھا کہ میں تمہارا خیال رکھوں گی۔“

”آج تک آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا۔ اچھی تعلیم دی۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھی نہیں بھول سکتی۔ اب جب کہ مجھے پتا چل چکا ہے کہ آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوتی ہے، میں اس گھر میں رہ کر آپ کو اور تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ اس پیسے کا کیا فائدہ جس میں محبت نہ ہو۔“

شمعو ماسی نے روکنے کی کوشش کی لیکن ان سے گلے مل کر رات کی باتیں اس کے ذہن میں گونجنے لگی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر آنسوؤں نے اسے مسکرانے بھی نہ دیا۔

”مجھے تم سے نفرت ہے تمہیں دیکھتی ہوں تو تکلیف ہوتی ہے۔“

وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

”مام پلیز مجھے روک لیں ایک دفعہ کہہ دیں کہ رک جاؤ، وہ سب کچھ بھول جاؤں گی۔ مام پلیز!“ رہیں لیکن سمیعہ بیگم بالکل خاموش۔

نوشین کی دو اولادیں پیدا ہوئیں، پہلے نجمہ اور پھر عمران۔
نوشین بہت خوش تھی۔ سب ٹھیک جا رہا تھا۔ اُس کا شوہر
محکمہ تعلیم میں ۱۸ روپے گریڈ کا افسر تھا۔ نوشین کو کبھی پوچھنے
کی ضرورت ہی نہیں پڑی کہ وہ کس محکمہ میں ملازم ہے۔
میاں بیوی خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔

نوشین یاد کرنے لگی جب وہ راشدہ کی شادی میں
شرکت کرنے کے لیے اپنے والدین کے گھر راولپنڈی
گئی تھی۔ نوشین بہت خوش تھی کہ اُس کے بچپن کی دوست
اور پیاری سہیلی کی شادی ہو رہی تھی۔ راشدہ ایم اے
کرنے کے بعد ایک سرکاری سکول میں استانی لگ گئی
تھی۔ راشدہ کو بچپن سے ہی ٹیچر بننے کا شوق تھا۔ اُس
کے والد کپڑے کے تاجر تھے۔ راشدہ کو نوکری کی کوئی
ضرورت نہیں تھی مگر اپنے شوق کی وجہ سے وہ ٹیچر بنی تھی
ورنہ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔

نوشین اپنی سہیلی راشدہ کی شادی میں شریک تھی۔
دونوں سہلیاں خوشی سے نہال تھیں۔ راشدہ نے نوشین کو
بتایا کہ اُس کے ہونے والے دلہا دنیا میں اکیلے ہیں۔ اُن
کے والدین بچپن میں ایک حادثہ کا شکار ہو گئے تھے۔
انہوں نے بڑی محنت اور لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کی اور
اب محکمہ تعلیم میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہیں۔ راشدہ نے کہا کہ
ہم دونوں محبت کی شادی کر رہے ہیں۔ کرامت مجھ سے
بہت محبت کرتے ہیں۔

کرامت کا نام سن کر نوشین کو حیرانی ہوئی مگر یہ سوچ
کر کہ کرامت نام تو کسی کا بھی ہو سکتا ہے اس سے کیا
فرق پڑتا ہے، اس خیال کو اُس نے فوراً اپنے دماغ سے
نکال دیا اور خود سے کہنے لگی، واقعی عورتیں بہت شکی مزاج
ہوتی ہیں۔ میرا شوہر کرامت تو بہت ہی پیار کرنے والا
ہے۔ وہ تو میرا دیوانہ ہے۔ میں نے اپنے شوہر کے
بارے میں یہ کیسے سوچ لیا۔ میرے دماغ میں ایسا خیال
آیا بھی کیسے، میں بھی بہت احمق اور پاگل ہوں۔ اپنے
محبت کرنے والے شوہر کے بارے میں ایسا خیال کرنا بھی
گناہ ہے۔ وہ تو محبت اور وفا کا دیوتا ہے۔ میں تو اُس کی

بار پھر تازہ ہو گیا تھا۔
نوشین بیگم کو اپنی زندگی کے اُس درد کا ایک بار پھر
بڑی شدت سے احساس ہوا تھا جسے آج تک چھپا کر
رکھا تھا۔ کبھی کسی سے کوئی شکوہ یا شکایت نہیں کی تھی۔
اس سب کو اللہ کی رضا مان کر برداشت کیا تھا ورنہ یہ
برداشت کرنا کسی بھی عورت کے لیے آسان نہیں ہوتا۔
اپنی سب سے عزیز اور پیاری سہیلی کو سوتن کے روپ
میں دیکھنا کسی پہاڑ سے کم نہیں تھا مگر نوشین نے یہ سب
گزشتہ ۱۶ برس سے برداشت کیا ہوا تھا۔ اُس نے کبھی
اپنے شوہر پر بھی اس بات کو ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ
ہر ہفتہ سرکاری دورے کا کہہ کر جہاں جاتا ہے، وہ جانتی
ہے۔ اُس نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اپنے شوہر کی
خدمت کی۔ ہمیشہ اُس کی حمایت اور اطاعت کو حکم خدا
سمجھ کر بجالاتی رہی۔

شوہر سے کبھی شکایت نہیں کی کہ وہ ہفتہ کے دو دن
کیوں گھر سے باہر گزارتا ہے۔ وہ ایک مالدار باپ کی بیٹی
ہونے کے باوجود درمیانہ درجہ کی زندگی بسر کرتی رہی۔
شوہر سے فرمائش یا مطالبہ تو اُس نے کبھی کیا ہی نہیں۔
شوہر نے جس حال میں رکھا وہ اُس میں خوش رہی۔ مگر آج
اُس کے آنسو کسی انجانے خوف کی وجہ سے رکنے کا نام نہیں
لے رہے تھے۔ اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ اُس کو اپنی
دوست راشدہ کی باتیں یاد آرہی تھیں۔

نوشین اور راشدہ بچپن کی سہلیاں تھیں۔ ایف اے
تک دونوں نے تعلیم بھی ایک ساتھ حاصل کی۔ ایف اے
کے بعد نوشین کی شادی ہو گئی۔ راشدہ ثانی کے ہاں
جہلم جانے کے باعث نوشین کی شادی میں شریک نہ ہو
سکی تھی۔ دونوں ایک ہی محلہ میں رہتی تھیں۔ نوشین کا
گھر گلی نمبر ایک میں تھا جبکہ راشدہ گلی نمبر ۲ میں رہتی تھی۔
نوشین کی شادی کے بعد بھی دونوں کے درمیان دوستی اور
محبت کا رشتہ ویسا ہی رہا۔

نوشین شادی کے بعد شوہر کے ساتھ اسلام آباد چلی
گئی۔ وہاں انھیں سرکاری رہائش گاہ مل گئی۔ چار سال میں



بوجہ

اظہر بن مظہر

ایک وفادار اور شوہر پرست بیوی کی داستان
اس کے دل پر اپنے شوہر کے ایک فیصلے کا بہت بوجھ تھا

سے کہہ دیں۔ جبکہ کلثوم اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے
مسکراتی رہی اور گھر جانے کی اجازت مانگتی رہی۔
نجمہ جب کلثوم کو اپنے پاس رہنے کے لیے مجبور کر
رہی تھی تو نجمہ کی ماں نوشین بیگم سن رہی تھیں۔ یہ بات
سن کر نوشین بیگم کو بھی اپنی سہیلی راشدہ کی شادی کی
رات یاد آگئی۔ نوشین بیگم ماضی کی یادوں کے جھروکوں
میں گہمیں کھو گئیں۔ آج پھر اُن کے غم ہرے ہو گئے
تھے۔ جس زخم کو انہوں نے ناسور بنا کر کئی برسوں تک
اُس کی تکلیف اور درد کو برداشت کیا تھا، آج وہ ایک

آج
رات تو تم میرے پاس رُک جاؤ۔
کچھ ہی دیر میں میری مہندی آنے
والی ہے۔ تم میری کیسی دوست ہو جو
میری شادی کے موقع پر بھی مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہی ہو۔
سہلیاں تو ایک دوسرے کا سہارا ہوتی ہیں۔ میری اپنے
والدین کے ہاں یہ آخری رات ہے۔ اس کے بعد تو میں
ماں باپ کے گھر ایک مہمان کی طرح آیا کروں گی۔
تمہارے ساتھ بھی ملاقات اب کبھی کبھار ہی ہوا کرے
گی۔ نجمہ نے ایک ہی سانس میں یہ ساری باتیں کلثوم

جان اور کل کائنات ہوں۔ اُن کی صبح اور شام میں ہوں۔ میرا شوہر تو مجھ کو دل کا چین اور راحت قرار دیتا ہے۔ میں تو اُس کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہوں۔ نوشین ان خیالات میں کھوئی تھی کہ راشدہ نے اُس کو آواز دی، میری جان کہاں کھو گئی ہو!

نوشین نے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا کہیں نہیں بس تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔ دونوں نے ساری رات باتیں کرتے ہوئے بسر کر دی۔ فجر کی اذان ہوئی تو دونوں نے نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام کیا۔ کیونکہ ہال کا وقت اربعے سے ۳ بجے تک تھا۔ ویسے شادی ہالوں کا رواج نیا نیا تھا۔ بڑے لوگ شادی ہال میں شادی کا اہتمام کر کے دوسروں پر اپنا رعب ڈالتے تھے۔

نوشین اور چند دوسری رشتہ دار لڑکیاں راشدہ کو لے کر بیوٹی پارلر چلی گئیں، جہاں سے انھوں نے تیار ہو کر سیدھا شادی ہال ہی پہنچنا تھا۔ موبائل سروس کا آغاز ہی ہوا تھا۔ خال خال لوگوں کے پاس موبائل ہوتا تھا۔ راشدہ کے موبائل پر مسلسل گھنٹی بج رہی تھی۔ مگر یہ سب تیار ہونے میں مصروف تھیں۔ کسی نے موبائل سنا تو اُس نے کہا جلدی کرو بارات ہال میں پہنچ چکی ہے۔ نوشین آج پھر راشدہ سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ اگرچہ اُس کے دو بیچے تھے مگر وہ دلہن سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ بیوٹی پارلر والیاں اُس کو چھیڑ رہی تھیں۔ دونوں سہلیاں بے حد خوش تھیں۔ ایک دوسرے کی تعریف سن کر دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ چہرے سرخ گلاب کی مانند کھل رہے تھے۔ ہر طرف خوشیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مستقبل سے بے نیاز نوشین اپنی سہیلی کی بارات میں شرکت کے لیے اور دولہا دیکھنے کو بے تاب تھی۔

دلہن کی گاڑی شادی ہال کے عقبی دروازہ پر آ کر رکی۔ نوشین دلہن کا لہنگا پکڑے اُس کو چلنے میں مدد دے رہی تھی۔ ہال میں ہر طرف شور اور ہنگامہ تھا۔ نوشین نے گن آنکھوں سے سٹیج پر بیٹھے ہوئے دولہا کو دیکھنے کی کوشش کی مگر چہرے پر پڑی پھولوں کے سہرا کی لڑیاں

حائل ہو گئیں۔

ہال میں شور مچ گیا دلہن آگئی دلہن آگئی۔ سب خواتین دلہن کے کمر کی طرف لپکی تھیں مگر دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔ باہر سے آوازیں آرہی تھیں۔ بعضی دروازہ کھولو ہم نے دلہن دیکھنی ہے۔ مگر دروازہ نہ کھلتا تھا نہ ہی کھلا۔ نوشین اور راشدہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھی تھیں کہ اچانک دروازہ پر آواز آئی کہ مولوی صاحب آئے ہیں دروازہ کھولیں۔ مولوی صاحب جب اندر آئے تو نوشین اپنے بچوں کا پتا کرنے کے لیے اپنی ماں کو فون کرنے چلی گئی۔ بچوں کی خیر خیریت پتا کرنے کے بعد جب وہ دلہن کے کمر میں آئی تو ہر طرف مبارک مبارک کی آوازیں آرہی تھیں۔

راشدہ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اُس کی بہنیں اور ماں اُس کو چپ کر رہی تھیں۔ نوشین نے آگے بڑھ کر راشدہ کو گلے سے لگایا اور آہستہ سے کان میں کہا، چپ ہو جاو ورنہ سارا میک اپ خراب ہو جائے گا۔ دلہن کا کمر سٹیج سے دائیں جانب تھا۔ اچانک دروازہ کھلا تو نوشین کی نظر سٹیج پر کھڑے دولہا پر پڑی۔ دولہا کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں پتھر کی ہو گئیں۔ نوشین پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

اُس سے پیار کرنے والا اُس کی وفا کی قسمیں کھاتے والا اُس کا پیارا شوہر اس کے سامنے سر پر سہرا باندھے کھڑا تھا۔ نوشین کو ایسے لگا جیسے اُس کا دل دھڑکنے بند ہو گیا۔ سانس حلق میں اٹک گئی۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر بہہ نکلا تھا۔ اب وہ راشدہ سے زیادہ شدت کے ساتھ رو رہی تھی۔ اُس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ اسی لمحہ لڑکیوں نے دلہن کو نوشین کی بانہوں سے جدا کیا اور اُس کو لے کر سٹیج کی طرف چل دیں۔ نوشین وہیں بت بنی کھڑی رہ گئی۔ اس کے پاؤں پتھر کے ہو گئے تھے۔ اُس کو اپنا وجود ختم ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اُس نے خود کو سنبھالا اور خاموشی سے اپنے والدین کے گھر آگئی۔

شام کو اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لے کر وہ اسلام آباد اپنے گھر آگئی۔ ماں اور بہن بھائیوں نے اُس کو بہت روکا مگر اُس نے کسی کی نہ سنی اور اپنے گھر آگئی۔ گھر واپس آتے گاڑی میں وہ سوچ رہی تھی، دو دن پہلے کرامت نے کتنے پیار سے کہا تھا، نوشین میری جان تمہارے لیے لاہور سے کیا لے کر آؤں؟ میں تو چاہتا ہوں کہ تم لوگوں کو بھی ساتھ لے کر جاؤں مگر سرکاری دورہ ہے۔ میں تو وہاں کام میں مصروف ہو جاؤں گا۔ تم لوگ اکیلے کیا کرو گے۔ بس یہ سوچ کر ہی تم سب کو ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں ورنہ ۱۵ دن تم لوگوں سے دور رہنا بڑا مشکل ہے مگر نوکری کی مجبوری ہے۔ خیر تم بتاؤ جانو! تمہارے لیے لاہور سے کیا لے کر آؤں؟ کچھ تو فرمائیں کرو۔

نوشین آنکھیں بند کیے پچھلی سیٹ پر ٹیک لگائے ہوئے تھی کہ ڈرائیور نے کہا بیگم صاحبہ گھر آگیا ہے۔ نوشین گاڑی سے باہر نکلی، عمران کو گود میں اٹھائے نجمہ کی انگلی پکڑے اندر چلی گئی۔ بستر پر اُس کو کسی پہلو بھی چین نہ مل رہا تھا۔ اُس کو صرف اپنے شوہر کرامت کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ پتا نہیں رات کو کب اس کی آنکھ لگی۔

کچھ دن کے بعد کرامت واپس آیا تو اُس کے پاس بیوی اور بچوں کے لیے کافی تحائف تھے۔ وہ بہت خوش تھا۔ نوشین نے بھی شوہر سے کسی ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ زندگی کا سفر جاری رہا۔ کرامت ہفتے میں دو یا تین دن سرکاری دورے کا کہہ کر چلا جاتا اور پھر خوشی خوشی واپس آجاتا۔ نوشین سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنی رہتی۔ نوشین نے شوہر کی وفا اور اطاعت کے ساتھ اپنے بچوں کی پرورش اور تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اُس نے اللہ کے حکم کو مانا کہ ایک شخص چار شادیاں کر سکتا ہے۔ شریعت مرد کو ایک وقت میں چار شادیوں کی اجازت دیتی ہے تو میں کیوں مخالفت کروں۔ شوہر میرے اور بچوں کے حقوق بھدے کرتا ہے پھر بلاوجہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ ان باتوں سے خود کو تسلی دیتی۔ بس دل پر زخموں کے نشان بنے جا رہے تھے۔

۱۶ برس کے بعد آج اُس نے اپنی بیٹی کے منہ سے راشدہ والے الفاظ سنے تو اُس کا دل بیٹھ سا گیا۔ اُس کے پیروں تلے سے زمین کھسکنے لگی۔ وہ دوڑ کر اپنے شوہر کے پاس آئی اور اپنا سر اُس کے سینے پر رکھ کر پوچھا کیا آپ نے نجمہ بیٹی کے رشتہ میں پوری جانچ پڑتال کی ہے نا! کرامت نے بڑی سوالیہ نظروں سے نوشین کی طرف دیکھا اور پوچھا کیا مطلب ہے؟ نوشین نے کہا ”آپ نے بیٹی کا رشتہ طے کیا ہے اور صبح اُس کی رخصتی ہے۔ میں نے کسی قسم کا کوئی سوال یا مطالبہ نہیں کیا۔ یہ سب آپ نے اپنی مرضی سے طے کیا ہے اور یہ آپ کا حق بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ بس میں ایک تسلی چاہتی ہوں کہ کیا آپ نے رشتہ طے کرتے وقت پوری طرح سے تسلی کی ہے کیونکہ اکثر ماں باپ کی کرنیوں کا اولاد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کو زندگی میں کسی دکھ یا تکلیف کا سامنا کرنا پڑے۔“

کرامت نے بیوی کی طرف متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ وفادار بیوی سے شوہر کی پریشانی دیکھی نہ گئی تو اُس نے کہا ”میرا مطلب ہے کہ آج کل کے لڑکوں کا کچھ پتا نہیں، بیویوں سے بے وفائی کرنا مشغلہ سمجھتے ہیں۔“ یہ سنتے ہی کرامت کی نظریں جھک گئیں۔ اُس کے چہرے پر شرمندگی اور ندامت کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ کرامت نے خود کو گہرائیوں میں گرتے ہوئے محسوس کیا کہ بیوی سے اتنی بڑی حقیقت چھپانے کی غلطی اسے مجرم ثابت کر رہی تھی۔ اسی لیے خاموش رہا۔ اتنے میں کسی کی آواز آئی نوشین کہاں ہو باہر لڑکے والے مہندی لے کر آگئے ہیں۔ دونوں میاں بیوی مہندی کے انتقال کے لیے کمرے سے باہر نکلے کہ اچانک کرامت کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ راشدہ آنے والی خواتین میں اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ کرامت نے اُس سے پوچھا، راشدہ تم یہاں کیسے؟ تو راشدہ نے بتایا کہ میں دلہا کی طرف سے نہیں بلکہ اپنے شوہر کی بیٹی کی شادی میں شریک ہونے آئی ہوں۔

سردیوں کی بیماریاں

بچوں کو عام طور پر سردی ناں کی ٹھنڈی گود اور ٹھنڈے دودھ سے لگتی ہے

کے باعث جسم اور سر کے بالوں کی قدرتی چکنائیت ضائع ہو جاتی ہے۔ جس سے خشکی اور سکری بڑھ جاتی ہے۔ کمر اور جوڑوں کے درد کا ایک سبب پنھوں اور جوڑوں کی بافتوں کا اکڑاؤ ہوتا ہے۔

خارش کا سبب ایک چھوٹا سا کیڑا ہے جو جلد میں داخل ہو کر خارش پیدا کرتا ہے یہ کیڑا خارش زدہ فرد کے بستر یا لباس وغیرہ استعمال کرنے سے صحت مند شخص کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ سردیوں میں دل کے امراض بڑھنے کی وجہ خون کے بہاؤ میں کمی اور ایسی غذا ہے جو کولیسٹرول بڑھا کر خون کے بہاؤ میں کمی کرتی ہے۔

احتیاطی تدابیر

سردی سے سب ہی متاثر ہوتے ہیں لیکن بچے اور بڑی عمر کے افراد جن میں قوت مدافعت کم ہوتی ہے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ سر، چہرہ، ناک، کان اور منہ کو ڈھانپ کر رکھنے سے نزلہ، زکام اور سانس کی کئی بیماریوں سے بچ سکتے ہیں۔ سڑک پر گاڑیوں کے دھوئیں سے بھی بچنا چاہیے۔ کمرے کو گرم اور ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے دروازے

موسم سرما میں کچھ بیماریاں بڑھ جاتی ہیں اور گھر کے چھوٹوں بڑوں سب کے لیے کئی طرح کی پریشانی کا باعث بنتی ہیں۔ ان سے کیسے نمٹا جائے، یہ جاننا بہت اہم ہے۔

نزلہ، زکام، کھانسی

نزلہ، زکام، کھانسی، ناک بند ہونا، ناک میں ریشہ کا جماؤ (Sinusits)، نمونیہ، الرجی (دمہ)، جسم اور بالوں کی خشکی، کمر درد اور جوڑوں کا درد، خارش اور دل کے امراض۔ سرد موسم میں جسم کا خود کار نظام اپنی حرارت بچانے کے لیے بیرونی اعضاء اور جلد کی طرف خون کے بہاؤ میں کمی کر دیتا ہے۔ اس طرح ہمارے بازو ٹانگیں ناک کان اور جلد ٹھنڈک کا شکار ہو کر مختلف تکالیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جب سردی کی وجہ سے ہمارا ناک گلہ اور نظام تنفس کا اوپری حصہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو بیرونی ٹھنڈی ہوا جس میں جراثیم اور الرجی پیدا کرنے والے ذرات ہوتے ہیں ہمارے نظام تنفس میں داخل ہو کر نزلہ، زکام اور کھانسی وغیرہ پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی ہمارے جلد اور سر کے بال خشک ہو جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ گرم پانی کے ساتھ نہانے

موسم سرما میں بڑوں سے زیادہ بچے متاثر ہوتے ہیں

نزلہ اور زکام

کہا جاتا ہے کہ ہر انسان سال میں دو یا تین بار نزلہ زکام کا شکار ہوتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر نزلہ زکام کا علاج نہ کیا جائے تو آرام آنے میں سات دن لگتے ہیں اور اگر علاج کیا جائے تو بھی ایک ہفتہ لیکن اگر کھانسی ریشہ کی شدت بخار اور جسم درد زیادہ ہو تو علاج کرنا چاہیے۔



زیادہ اینٹی باڈیز استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ مچھلی، بھنا ہوا گوشت، شہد ملا نیم گرم پانی، قبوہ فائدہ مند ہے۔

بچوں کا ناک نزلہ اور زکام کی وجہ سے بند ہو جاتا ہے جس وجہ سے ان کو لیٹنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ریشہ کی وجہ سے ان کے کان میں بھی درد شروع ہو جاتا ہے۔ جو بچوں کو مزید پریشان کرتا ہے۔ ایسے بچے جن کی ناک لہ رہی ہو ان کے ناک کا پانی یا ریشہ ”بے بی سکر“ کی مدد سے کھینچ کر صاف کرنے سے بچے کا ناک کھل جاتا ہے اور وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ بچے کے ناک کے اندر اگر خشک ریشہ ہو تو اس کو عام نمکین پانی کا ایک ایک قطرہ دونوں نچھوں میں ڈال کر نرم کر کے بے بی سکر سے نکالا جاسکتا ہے۔ یہ ”بے بی سکر“ میڈیکل سٹورز سے آسانی سے مل جاتا ہے۔ اس سے بچے اور اس کے گھر والے رات آرام سے گزار سکتے ہیں۔

بچے کو شروع ہی میں رات 11 سے صبح 5 بجے تک دودھ نہ پلانے کی عادت ڈال لینی چاہیے۔ ہر بچہ عام طور پر دودھ پینے کے آدھ گھنٹہ بعد پیشاب کرتا ہے۔ اس لیے کبھی

بند کر کے ان کے آگے پردہ ڈالنا چاہیے۔ اگر گرم کرنے کے لیے کونسلر، لکڑیاں وغیرہ جلانے کی بات ہو تو ان کو کمرے سے باہر اچھی طرح جلا کر کمرے لانا چاہیے ورنہ کاربن مونو آکسائیڈ گیس پیدا ہو کر کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ کسی بھی طرح سے جلائی ہوئی آگ کا دھواں اور ماحول میں ہوا کی نمی سے بھی کھانسی سانس کی تکالیف بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے دھوئیں کے دھواں کا انتظام ضرور کرنا چاہیے۔ کھانسی اور خاص طور پر بچوں کے مریضوں کو اپنا بگم بھینکنے میں احتیاط کرنی چاہیے، کمرے کو گرم رکھنے کے لیے اگر ہیٹر چلایا جائے تو اس پر بچوں کا برتن رکھنا چاہیے تاکہ اس سے نکلتی ہوئی بھاپ ہوا میں کمی نہ ہونے دے۔

کمرے میں بچھائے ہوئے کارپٹ یا قالین میں گرد و غبار جراثیم اور بہت سے انرجن موجود ہوتے ہیں۔ ان میں ایک بہت چھوٹا سا کیڑا (Mite) بھی ہو سکتا ہے۔ جس کا فضلہ سانس کی تکالیف کا باعث بنتا ہے اس لیے اگر قالین اور کارپٹ پر کوئی چادر وغیرہ بچھائی جائے تو یہ ایک اچھی حفاظتی تدبیر ہے۔ کمرے میں خوشبو کا استعمال بھی سانس کی تکالیف کا باعث بن سکتا ہے۔ کھانسی اور سانس کی تکالیف والے مریضوں کو پھول کبھی نہیں سونگھنا چاہیے پھولوں میں موجود پولن ایسے مریضوں کے لیے انتہائی پریشانی کا باعث بن سکتی ہے۔

سرد موسم میں جسم کو گرم رکھنے کے لیے زیادہ خوراک کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے میٹھی اشیاء خشک میوہ جات، انڈا، مچھلی اور گوشت کا استعمال کرنا چاہیے۔ مچھلی کے سرے گندے اور سیاہ چنے کا شوربہ کم خرچ اور بالا نشین سے اس سے پلاؤ بھی بنایا جاسکتا ہے۔

رات سوتے سے پہلے کشمیری قبوہ سردی اور تھکن کم کرتا ہے۔ گھریلو خواتین کو پانی میں کام کرتے ہوئے مناسب کپڑے پہننا چاہیے۔ بچوں کو سردی عام طور پر ماں کی ٹھنڈی گود اور ٹھنڈے دودھ سے لگتی ہے۔ اس لیے ماں کو بچے لینے سے پہلے گود گرم کر لینی چاہیے۔

وہ دودھ کے لیے روتا ہے اور کبھی گیلیا ہو کر روتا ہے اور ماں رات میں بار بار اس لیے اٹھتی رہتی ہے جس سے ماں کو سردی میں نزلہ یا زکام بھی ہو سکتا ہے اور سردی سے پٹھوں میں درد بھی۔ اگر بچہ رات کو دودھ کا فیڈر پینے کا عادی ہو تو اس کو فیڈر میں تھوڑا سا پانی ڈال کر دینے سے یہ عادت چھڑوائی جاسکتی ہے۔ رات کو چینی والے دودھ کا فیڈر منہ میں رکھ کر سونے والے بچوں کے اکثر دانت خراب ہو جاتے ہیں۔ بچوں اور بڑی عمر کے افراد میں چونکہ قوت مدافعت کم ہوتی ہے اس لیے وہ جلد نزلہ یا زکام کا شکار ہوتے ہیں۔

کھانسی

کچھ افراد سردی کے موسم میں کھانسی کا شکار ہو جاتے



ہیں ان میں زیادہ تر سگریٹ اور حقہ پینے والے ہوتے ہیں۔ ان کو بتائی گئی احتیاطی تدابیر پر اچھی طرح عمل کرنا چاہیے کیونکہ بار بار کھانسی میں پھیپھڑے کمزور ہو جاتے ہیں اور سانس پھولنے لگتا ہے۔ پندرہ دن سے زیادہ کھانسی کی صورت میں سینہ کا ایکسرے کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ بلغم کا معائنہ بھی کرا لینا چاہیے۔

جماؤ

ہمارے چہرے کی ہڈیاں اسٹینجی ساخت کی ہیں اور ان کے

درمیان ہوا کے لیے کوٹھڑیاں Sinuses بھی موجود ہیں۔ جس سے ہمارا سر اور چہرہ حجم کے مطابق وزن میں ہلکا ہے۔ بار بار نزلہ یا زکام کے اوپری طرف موجود پولیپ Polype کی وجہ سے ان کوٹھڑیوں کے سوراخ بند ہو جاتے ہیں اور ان کوٹھڑیوں میں رت بھر جاتا ہے جس وجہ سے ناک کے اوپر اور باہر کی طرف بھنوں کے اندر کی طرف بوجھ اور درد کا احساس رہتا ہے۔ اگر ان



کا بروقت علاج نہ کیا جائے تو یہ دائمی مرض بن جاتا ہے اس سے پیچھا چھوڑنا مشکل ہوتا ہے اور بار بار آپریشن پہ بات چلی جاتی ہے۔ اس لیے ناک کھولنے کے لیے Vicks یا نمک ڈال کر گرم پانی کی بھاپ لینی چاہیے تاکہ ناک کھل جائے۔ گرمیوں میں بھاپ نہیں لینی چاہیے بلکہ ناک کھولنے والے قطرے بھی کبھار استعمال کرنے چاہئیں۔ نیم گرم پانی سے دھو کرنا بھی سو مند ہے۔ بچوں کو گرم پانی کے برتن پر بھاپ نہ دیں ان کے لیے کاشن کا کپڑا گیلیا کر کے استری کر لیں اور اس کی بھاپ دیں۔ ایک محفوظ طریقہ ہے۔ بچوں میں اگر ناک بند ہو اور بو آرہی ہو تو دیکھنا چاہیے کہ کہیں بچے نے اپنی ناک میں ربڑ، موٹی، مہم کا ٹکڑا یا کوئی اور ایسی چیز تو نہیں پھنسا لی، میں نے ایک بچے کے ناک میں سے مٹی کا دانہ نکالا تھا جس میں ایک سنڈی بھی تھی۔

الرجی (دمہ)

سانس کی بیماریوں میں دمہ ایک تکلیف دہ بیماری ہے

بادام اور روغن زیتون بہترین قدرتی کنڈیشنرز ہیں



بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کو بہت پریشان کرتی ہے۔ سانس میں سیٹیوں کی آواز آتی ہے۔ سانس اندر لیتے وقت سینہ کی درمیانی ہڈی کے اوپر گڑھا بنتا ہے۔ ایسے بچوں اور بوڑھوں کو دھواں گرد وغبار، خوشبو دار کپڑے اور دواؤں کی بھار جھنکار سے بچنا چاہیے۔ موسم کی تبدیلی میں بھی احتیاط کرنی چاہیے۔ دمہ میں مبتلا مریض خواہ وہ بچہ ہی



ہو کے لیے انہیلر دوائی کھانے سے زیادہ بہتر ہے۔ انہیلر لینے کے بعد کئی ضرور کر لیں۔

نمونہ

کمزور بچے اور بڑی عمر کے افراد سردیوں میں نمونہ کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس میں تیز بخار ہوتا ہے، نٹھنے اور ہلکیاں جلتی ہیں، کھانسی بے چین کرتی اور بھوک کم ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں ماہر ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔

جسم اور بالوں کی خشکی

مردیوں میں جسم اور بالوں کی خشکی سے بچاؤ کے لیے

اگر نہانے سے آدھا گھنٹا پہلے خالص سرسوں یا زیتوں کا تیل جسم پر مل لیا جائے تو خشکی کم ہو جاتی ہے۔ ہفتے میں ایک یا دو بار دہی میں تیل ملا کر سر دھونے سے آدھا گھنٹا پہلے سر پر لگا لیا جائے تو بال نرم اور ان کی خشکی کم ہو جاتی ہے۔ سر دھونے اور نہانے کے لیے ایسا شیمپو اور صابن استعمال کرنا چاہیے جس میں قدرتی کنڈیشنرز ہوں۔ بادام روغن اور زیتون کا تیل بہترین قدرتی کنڈیشنرز ہیں۔ گاجر اور گاجر کا جوس کا روزانہ استعمال خشکی کا اچھا علاج ہے۔ زیادہ گرم پانی سے نہاننا چاہیے۔

کمر اور جوڑوں کا درد

سرد موسم میں کمر درد اور جوڑوں کی درد میں اضافے کی وجہ سے بھی پٹھوں اور جوڑوں کی بافتوں کا ٹھنڈک کی وجہ سے اکڑاؤ ہے۔ گرم ملبوسات مناسب ورزش اور خشک انجیر کا کھانا سردیوں میں فائدہ مند ہے۔

دل کے امراض

دل کے امراض والوں کو زیادہ سردی سے بچنا چاہیے۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد زیادہ پیدل چلنا اور جسمانی مشقت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ ٹھنڈی اور تیز ہوا



میں چلنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ زیادہ چکنائٹ کا استعمال ٹھیک نہیں۔ ان کے لیے بہترین چکنائٹ زیتون کا تیل اور خالص مکھن ہے۔ ایسی چکنائٹ جو ہاتھ اور منہ میں آسانی سے گھل جائے اس کا مناسب مقدار میں استعمال ٹھیک ہے۔

معذوری

کو علاج سے کم کرنا ممکن ہے؟

ذہنی معذوروں کی تعداد ایک کروڑ تک پہنچ چکی ہے

جس بچے کا آئی کیو ۷۰ سے کم ہو وہ ذہنی معذوری کا شکار ہوتا ہے

معذوری کو ہمارے معاشرے میں خدا کا قہر اور ایک سزا سمجھا جاتا ہے۔ معذور بچوں کے والدین بھی خود کو کسی حد تک قصور وار بلکہ کبھی کبھی تو معذور ہی سمجھتے اور اپنے ساتھ اپنے بچوں کو بھی احساس کمتری میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ پاکستان کی نصف سے زائد آبادی دیہات میں رہتی ہے وہاں صحت اور تعلیم کی سہولیات آج بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پاکستان کی کل آبادی کا تقریباً ۱۰ فیصد کسی نہ کسی قسم کی معذوری کا شکار ہے۔ اگر اس میں ذہنی معذور افراد کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد کروڑ افراد تک پہنچ جاتی ہے۔

محققوں کے مطابق ایسا بچہ جس کا مقیاس ذہانت (IQ) ۷۰ سے کم ہو، وہ ذہنی معذوری کا شکار ہے۔ پاکستان میں والدین کو کوئی خاص آگاہی حاصل نہیں۔ والدین کی اکثریت اس بات سے بھی ناواقف ہے کہ بچوں میں کوئی علامات ذہنی معذوری کی نشاندہی کرتی ہیں اور اس حوالے سے وہ اپنے بچوں کا IQ ٹیسٹ کہاں، کیسے اور کب کرا سکتے ہیں۔ لاہور جیسے بڑے شہر میں تقریباً سبھی بڑے ہسپتالوں میں سائیکیاٹرک (Psychiatric) وارڈز موجود ہیں مگر لا علمی کی وجہ سے ذہنی معذور افراد کی ایک کثیر تعداد ان سہولیات سے محروم رہ جاتی ہے۔

گزشتہ ماہ بہاولنگر جانے کا اتفاق ہوا تو گورنمنٹ سکول برائے سلو لرنرز (Govt. School for Slow Learners) کا نام یاد دل چاہا کہ میں اس سکول میں جاؤں۔ خلاف توقع اسکول کا تمام عملہ اسکول میں موجود تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ یہ عملہ ہی بہت دل جمعی اور محنت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ اس ادارے میں ۱۰۰ کے قریب ایسے بچے زیر تعلیم ہیں جن کو معاشرہ عام فہم میں "سائیں" کے لقب سے نوازتا ہے۔

حکومت کے ساتھ ساتھ بہت سے نجی فلاحی ادارے بھی اس خدمت میں پیش پیش ہیں اور اس حوالے سے اگر راننگ سن ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی کے زیر سایہ چلنے والے ادارے راننگ سن برائے خصوصی اطفال کا نام نہ لیا جائے تو یہ بات مکمل نہ ہو پائے۔ ڈاکٹر عبدالباق خان کی قیادت میں یہ ادارہ ۱۹۸۴ء سے ایسی کئی بنجر اور اداس زندگیوں کو جلا بخش رہا ہے جن کے لیے ایک کامیاب زندگی کبھی نہ پورا ہونے والا خواب تھی۔ راننگ سن آج اپنے دو کمپسوں میں ۶ سو کے قریب ذہنی و جسمانی معذور بچوں کی تعلیم و تربیت کر رہا ہے۔ اس ادارے نے رواں سال (یو ایس ایڈ) کے تعاون سے ایک نئے پروگرام کی تکمیل کی جس کے تحت انہوں نے فارمل سکولوں کے ۵۰ اساتذہ کو ذہنی و جسمانی معذور بچوں کی تشخیص کرنے، ان کی تعلیم و فہم بڑھانے کی تربیت دی۔ اب یہ تربیت یافتہ اساتذہ اپنے کمر اجتماعت میں ہی دیگر طلباء کے ساتھ معذور بچوں کی تعلیم و تربیت بھی کرتے ہیں جس سے شمولیاتی تعلیم (Inclusive Education) کا عالمی خواب اب پاکستان میں بھی کسی حد تک حقیقت بنتا جا رہا ہے۔

راننگ سن نے گزشتہ ماہ اپنی خدمت کے دائرے کو مزید وسعت دیتے ہوئے پنجاب سکلو ڈویلپمنٹ فنڈ (PSDF) کے اشتراک سے ضلع بہاولنگر کے خصوصی افراد کو بھی ہنرمند بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس پروگرام کے تحت تحصیل ہارون آباد، چشتیاں، فورٹ عباس اور بہاولنگر سے ۲۰ افراد کو لاہور لایا گیا۔ شروع میں تو یہ پراجیکٹ ایک خواب سا لگتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا میل کرنا تھا اور کرا دیا، اس نیک کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہاولنگر کے ایک ہر دل عزیز سینیئر ڈاکٹر محمد طاہر محمود کو چنا۔ انہوں نے رضا کارانہ طور پر اپنی مدد آپ کے تحت مقامی اخبارات و ریڈیو چینلوں کے ذریعے، اشتہارات کی تقسیم اور لوگوں پر سبزی لگوا کر لوگوں کو اس پراجیکٹ سے متعارف کروایا۔ انہوں نے علاقہ کے بااثر افراد اور مقامی پیرش ٹیچرز ایسوسی ایشن کی بھی مدد حاصل کی اور جب راننگ سن کی سلیکشن ٹیم گورنمنٹ سینٹرل ایجوکیشن سینیئر بہاولنگر پہنچی تو ۱۰۰ سے زائد مقامی طلباء، اسٹیشنل ایجوکیشن سینیئر بہاولنگر، چشتیاں، ہارون آباد اور فورٹ عباس کے ذمہ داران اور ۳۵ معذور طلباء اس ٹیم کے استقبال میں کھڑے تھے۔

۳۵ معذور افراد میں سے ۲۰ کا انتخاب کرنا بہت مشکل کام تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کام میں بھی اپنی مدد کو شامل حال کیا۔ میڈیکل، سائیکالوجیکل، موٹر سکلو اور نظر کے معائنے کے بعد ۲۳ افراد کا انتخاب کیا گیا جبکہ باقی افراد کو اگلے ٹرینینر کیمپ کے لئے ویننگ لسٹ میں شامل کر لیا گیا۔ اب لاہور میں بچوں کی کپڑا بنائی اور کشیدہ کاری کی تربیت جاری ہے۔ نا صرف تربیت بلکہ ان بچوں کی رہائش، کھانا پینا، تھیل، گود، آمد و رفت، یونیفارم، سکول بیگ، کتب اور ماہانہ جیب خرچ کا بھی انتظام کیا گیا۔ یہ ۲۰ طلباء DHA کے ایس بلاک میں رہائش پذیر ہیں جہاں ہاسٹل وارڈن کی نگرانی میں اپنے شب و روز گزار رہے ہیں۔ جب یہ بچے اپنا تربیتی کورس مکمل کر کے واپس جائیں گے تو یقیناً معاشرے کا مفید حصہ بن سکیں گے۔

اس کا علاج کرانے کی بجائے اس بات کو چھپاتے اور کوشش کرتے ہیں کہ ان کا بچہ خود بہ خود اس مسئلے کا حل نکالے اور ٹھیک ہو جائے جبکہ ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے معذوری کو تشخیص و علاج سے Manage ضرور کیا جاسکتا ہے۔

اکثر والدین کے پاس یہ سوچنے کا وقت بھی نہیں کہ ان کے بچے کو کسی قسم کی Learning Disability یعنی سیکھنے پڑھنے سے متعلق مشکلات کا سامنا تو نہیں؟ اور اگر ہاں ہے تو اسے کیسے حل کیا جائے؟

ہر سال 5 ہزار نئے مریض پیدا ہونے کا خطرہ سر پر کیوں منڈلا رہا ہے



تھیلسیمیا مریضوں کے لیے

پاکستان میں نوجوانوں کی پہلی میراتھن

ایکسپوسنٹر لاہور میں زیر و تھیلسیمیا میراتھن

خدمت خلق کے جذبے سے سرشار پاکستانی نوجوانوں کا بے مثال کارنامہ

تاہم یہ امر قابل ذکر ہے کہ تھیلسیمیا کو ۱۰۰ فیصد ختم کیا جاسکتا ہے۔ دراصل یہ ایک مورثی بیماری ہے یعنی زندگی کے کسی حصے میں لاحق نہیں ہوتی بلکہ ماں باپ سے بچوں میں منتقل ہوتی ہے۔ لہذا اگر نوجوان شادی سے پہلے اپنا ٹیسٹ کرا لیں اور یہ جان کر کہ وہ تھیلسیمیا مائز ہیں، کسی اور مریض سے شادی نہ کریں تو ان کی اولاد اس خطرناک بیماری کا نشانہ نہیں بنے گی۔ پاکستان میں تقریباً ۸۰ لاکھ لوگ تھیلسیمیا مائز ہیں۔ یعنی اگر وہ لوگ ٹیسٹ نہیں کراتے اور آپس میں شادیاں کرتے ہیں تو ہر سال ۵۰۰۰۰ نئے مریض پیدا ہونے کا خطرہ موجود رہے گا۔

بات انتہائی تشویش ناک ہے کہ ہماری لاعلمی کی بناء پر تقریباً ایک لاکھ پاکستانی تھیلسیمیا کے مرض میں مبتلا ہیں انھیں ہر ۷ دن بعد خون کا ایک بیگ درکار ہوتا ہے۔ بروقت خون نہ ملنے کی بناء پر ان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ بصورت دیگر خصوصاً مریض بچوں کے والدین اور وہ خود ساری عمر ایسی اذیت میں مبتلا رہتے ہیں جس کا بیان الفاظ میں کرنا ممکن نہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس مرض کا علاج دستیاب نہیں اور اس کے مریض ہر وقت کسی میچا کی تلاش میں رہتے ہیں۔

اسی آگاہی اور عملی طور پر شادی سے پہلے ٹیسٹ کے لیے آگاہی کا اہم ترین کام ”جہاد فار زیر و تھیلسیمیا سوسائٹی“ کر رہی ہے۔ لاہور کی اس فاؤنڈیشن کے اشتراک سے اب بے شمار مریضوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ سیکڑوں نوجوان طلباء و طالبات کا ٹیسٹ بھی کرایا جا چکا ہے۔ اس پروگرام کی ایک اور خوبصورتی یہ ہے کہ تھیلسیمیا کے مریضوں میں اُمید اور جذبہ پیدا کرنے کے لیے انھیں مختلف سرگرمیوں میں شریک کیا جاتا ہے تاکہ ان کا ٹیلنٹ باگروہ اور انھیں معاشرے میں جینے کا بھرپور حق مل سکے۔ پاکستانی نوجوانوں کے اس انوکھے اور ولولہ انگیز پروگرام کی ایک خوبصورتی یہ ہے کہ اپنے بانی غلام دستگیر کی معیت میں نوجوان لوگوں نے JZ Tvision 2016 بھی بنا رکھا ہے۔ اس کے تحت ان لوگوں نے تہیہ کیا ہے کہ سال ۲۰۱۶ء ان شاء اللہ پاکستان سے تھیلسیمیا کے خاتمے کا سال ثابت ہوگا۔

اسی آگاہی مہم کی ایک خوبصورت مثال حال ہی میں ہونے والی پہلی میراتھن ریس ہے جو ایکسپوسنٹر لاہور سے شوکت خانم ہسپتال تک منعقد ہوئی۔ تھیلسیمیا کے لیے ایسی میراتھن کا اعزاز پاکستان کو حاصل ہوا ہے۔ ”جہاد فار زیر و تھیلسیمیا“ کے رضا کاروں نے ضلعی انتظامیہ کے تعاون



سے اس عظیم الشان میراتھن کا انعقاد کیا جس میں ۱۲۰۰ طلباء و طالبات نے حصہ لیا۔ اس میں تقریباً ۴۰ یونیورسٹیوں کے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ ساتھ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، فاطمید فاؤنڈیشن اور دیگر اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر تھیلسیمیا کے مریض بھی موجود تھے جو اتنے بڑے مجمع کے اظہار یکجہتی سے انتہائی خوش ہوئے۔

کچھ قابل ذکر نوجوان رضا کار جن کی شب و روز کاوشوں سے قلیل عرصے میں یہ پروگرام اہم سنگ میل حاصل کرنے میں کامیاب ہوا، درج ذیل ہیں:

طلال احمد، مریم مظفر، رابعہ شاہد، احمد بلال، رابعہ بخاری، سعد احمد، مہرین شوکت، زائرہ زاہد، عمر سلیم، عمار ڈار، وقار حیدر، زید احمد خان، سعد خان، مظفر صائم افتخار، سر خالد، حماد نیازی، اسامہ علی، بلال نذیر، وقاص مخدوم، علی بخاری، نمرہ کلیم، شائلہ جمشید، اقصیٰ شہزاد، حنا حمید، شیزہ یزدانی اور طلال انور۔
ڈاکٹر تبریز اسلم شامی، پروفیسر رفیق ملک اور رشید خالد نے اس پورے پروگرام کی سرپرستی کی اور مشوروں سے نوازا۔

دینی و عصری تعلیم کی شمع

اسے مزید روشن کرنے میں ہمارا ساتھ دیں

محترمی و مکرمی جناب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

■ کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قاعدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی، ثواب آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ بھی ہے۔

■ اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے؟

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لا کر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمادیں۔ ہم تفاسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھجوا دیں گے ان شاء اللہ

■ دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی بھی وقت جس میں آپ کو آسانی ہو، ادارے کا وزٹ فرمائیں۔ ہمارے کام تعلیم القرآن و عصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام احسن طریقے سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم و کتب حدیث عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

■ نوٹ:

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ دقتی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں شکریہ۔ نیز ادارے کو دیے جانے والے عطیات انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں۔

رضیہ پروین

(ایم۔ اے عربی، ایم۔ اے اردو۔ وفاق المدارس)

آمنہ جنت فاؤنڈیشن گرلز ماڈل سکول رجسٹرڈ

چونیاں سٹی ضلع قصور (۵۵۲۲۰)

Ph: 0300-4735932 / 0333-4935205

امریکا اور پاکستان میں میڈیا کے

اردو خیز روم

ذمہ داریاں ایک سی مگر سہولتیں جدا جدا

اشٹلن

کتنے ہی سوال اور اندیشے لیے میں امریکا پہنچی۔ نہ جانتے ہوئے بھی موازنے کو دل چاہتا ہے۔ پاکستانی میڈیا میں اصول اور ضابطہ اخلاق جیسی باتیں دیوانے کا خواب کیوں لگتی ہیں۔

بعض

اوقات ایسا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے جو آپ کی زندگی کا رخ بدل دے۔

پاکستان چھوڑ کر امریکا آ بسنا میرے لیے ایک ایسا ہی مشکل فیصلہ تھا۔ اپنے

بہت سے اُن ہم وطنوں کے برعکس جن کے خواب امریکی

دیزے سے شروع ہو کر امریکا آمد پر ختم ہو جاتے ہیں، میرا

معاملہ مختلف تھا۔ میں نے کبھی بھی امریکا میں رہنے کی آرزو

نہیں کی تھی۔ مجھے یہ موقع قدرت نے فراہم کیا تھا۔

مجھے صحافت کے عملی میدان میں قدم رکھے سال دو سال

کا عرصہ ہی ہوا تھا کہ امریکا کے ایک معتبر صحافتی ادارے کی

جانب سے ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ اپنے کیریئر کے نسبتاً

ثابت ہوگا.....؟ ایسے ہی بہت سے سوالات اور اندیشے لیے

میں امریکا پہنچی، جہاں میری منزل تھی وائس آف

امریکا..... وائس آف امریکا، امریکی دارالحکومت واشنگٹن ڈی

سی میں کیپٹل ہل سے کچھ ہی فاصلے پر واقع ہے۔ اس کی وسیع

اور پرانی عمارت میں ۴۴ مختلف زبانوں کے دفاتر موجود

ہیں۔ وائس آف امریکا کی یہ تمام سروسز اپنی اپنی زبانوں میں

ریڈیو، ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ پر خبریں، تبصرے، تجزیے اور

مختلف پروگرامز پیش کرتی ہیں۔ موجودہ عالمی و سیاسی تناظر

میں اردو سروس یہاں کی ایک اہم سروس سمجھی جاتی ہے جہاں

معروف نیوز چینلز کے ساتھ بطور نیوز سنٹر اور نیوز رپورٹر وابستہ رہی تھی اور خبروں سے آگے کے ساتھ بھی گاہے بہ گاہے یہی ذمہ داریاں ادا کیں۔ پاکستان اور امریکا میں کام کی نوعیت زیادہ مختلف نہ ہونے کے باوجود کام کرنے کے انداز میں فرق بہر حال نمایاں تھا۔

ایک اور نمایاں فرق تھا پاکستان اور امریکا کے طرز معاشرت میں..... ایک پاکستانی لڑکی کا امریکا آنے، یہاں رہنے، کام کرنے اور اس معاشرے کے مشاہدے کا عمل میری توقعات سے بڑھ کر دلچسپ رہا بلکہ بہت ہی دلچسپ رہا۔ پاکستانی نیوز روم کے بعد امریکی نیوز روم میں کام کرنے کا تجربہ..... یوں تو امریکا اور پاکستان کے درمیان صحافت کا موازنہ درست نہیں کہ دونوں ممالک کے سماجی و اقتصادی حالات یکسر مختلف ہیں۔ امریکا میں الیکٹرانک میڈیا کی تاریخ پرانی ہے اور یہاں کا میڈیا بہت سے نشیب و فراز سے گزر کر اپنے لیے چند اصول و ضوابط مروج کر چکا جب کہ پاکستان میں الیکٹرانک میڈیا ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہا ہے۔ امریکا میں ایک صحافی کو پاکستانی صحافی کے برعکس ضروریات و سہولیات میسر ہیں اور اس کی پیشہ ورانہ زندگی بھی اتنی دشوار نہیں جتنی کہ پاکستان میں ہے۔ اس کے باوجود ایک ایسے پاکستانی ہونے کے ناطے جسے پاکستان اور امریکا میں صحافت کرنے کا موقع ملا ہو، میں خود کو یہ موازنہ کرنے سے روک نہیں سکی۔

ایک رپورٹر کی بنیادی ذمہ داری اپنے ملک اور دنیا بھر کا سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی منظر نامہ پیش کرنا ہے۔ یہاں امریکا میں کام کرنے والے صحافی کی بنیادی ذمہ داریاں بھی یہی ہیں..... واشنگٹن ڈی سی امریکی سیاست کا گڑھ ہے جہاں امریکا کے چوٹی کے سیاستدانوں کے علاوہ امریکا اور دنیا کے سیاسی منظر نامے پر نظر رکھنے والے بہت سے تھنک ٹینکس بھی ہیں۔ کسی امریکی سیاستدان یا پھر تھنک ٹینک سے منسلک کسی ماہر کا انٹرویو مقصود ہو، اس کا طریقہ پاکستان سے

قدرے مختلف ہے..... مجھے یاد ہے پارلیمنٹ کی رپورٹ کے دنوں میں جب بھی کوئی ایم این اے یا وزیر آتے تو نیوز چینلز کی یہی خواہش ہوتی تھی کہ ان سے بات کی جائے۔ یوں آپ کو ایسے مناظر عام نظر آتے تھے کہ کسی وزیر یا ایم این اے کو ایک طرف سے ایک چینل کا رپورٹر کھینچ رہا ہے تو دوسری طرف سے دوسرے چینل کا..... لیکن امریکا میں حکومتی نمائندے سے لے کر تھنک ٹینک سے منسلک ماہر یا پروفیسر کے پروفیسر سے لے کر میوزیم کے منتظم سے بات کرنے کے لیے بھی پیشگی تحریری اجازت درکار ہے۔ طریقہ آسان ہے۔ آپ جس کا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں اسے ای میل کیجئے۔ اپنے اور اپنے ادارے کے تعارف کے بعد انٹرویو کا مدعا بیان کیجئے اور وہ وقت اور دن بھی لکھیے جب آپ انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ انٹرویو کے دن مقررہ وقت اور جگہ پر آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیے۔ کیونکہ کیمبرہ مین "سیٹ اپ" (کیمبرہ اور لائٹس لگانا) کے لیے آدھ گھنٹہ درکار ہوتا ہے۔ آپ کا مہمان مین انٹرویو کے وقت کمرے میں داخل ہوتا ہے اور تمام مراحل سکون اور اطمینان سے طے ہو جاتے ہیں۔

دنیا بھر کی طرح امریکا اور پاکستان میں بھی صحافتی اداروں اور نیوز چینلز کی عمارات میں صحافیوں کا ٹھکانہ نیوز روم ہی ہوتا ہے۔ امریکا کے نیوز روم میں ایک صحافی کو اپنا الگ کیبن، کمپیوٹر اور کام کرنے کے لیے مختلف مشینری کے ساتھ ساتھ ایک انٹرنیشنل فون لائن بھی مہیا کی جاتی ہے تاکہ وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا کام کر سکے..... لیکن پاکستان کے نیوز روم کا ماحول اس کے برعکس ہے۔ یوں تو یہ ایک ایسا کمرہ ہے جو رپورٹرز اور کیمبرہ مین کے لیے مخصوص ہے لیکن اکثر آپ کو یہاں پر ملاقاتی بھی دکھائی دیں گے۔ اسی کمرے کے ایک کونے میں صحافیوں کے لیے چند میزیں اور کمپیوٹر لگے ہوتے ہیں۔ مختلف نیوز چینلز کو مانیٹر کرنے کے لیے سامنے پانچ یا چھ ٹیلی ویژن سیٹ بھی ہوتے ہیں۔ یہیں پر اسائنمنٹ ایڈیٹر

دنیا بھر کی طرح امریکا اور پاکستان میں بھی صحافتی اداروں اور نیوز چینلز کی عمارات میں صحافیوں کا ٹھکانہ نیوز روم ہی ہوتا ہے

ٹیلی فون پر نہ صرف ہیڈ آفس بلکہ رپورٹرز کو بھی مختلف انویسٹیشن کا انتظام کرنے کے لیے ڈرائیور حضرات سے مسلسل رابطے میں رہتا ہے۔ بریکنگ نیوز ہو، کسی سیاسی ایونٹ کی خبر بنائی ہو یا پھر فیچر رپورٹ پر کام کے لیے یکسوئی درکار ہو، آپ کو شور و غل کے اسی ماحول میں کام کرنا ہے۔ اکثر ساتھی رپورٹر سے کمپیوٹر مستعار لے کر خبر فائل کرنا پڑتی ہے۔ ایسے میں ایک بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ پاکستان کے وہ نیوز چینلز جن پر چلنے والے اشتہارات کی تعداد انٹرنیشنل چینلز پر چلنے والے اشتہارات سے بھی زیادہ ہے، صحافیوں کو ایک الگ کیبن یا کمپیوٹر کی سہولت کیوں نہیں فراہم کر سکتے؟

وکی پیڈیا کے مطابق اس وقت پاکستان میں سترہ کے قریب ۲۳ گھنٹے کے نمایاں نیوز چینلز کام کر رہے ہیں۔ پاکستان کے نیوز چینلز کی کامیابی ان محنتی صحافیوں کے مرہون منت ہے جو خوف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے فرائض کی بجا آوری کو مقدم رکھتے ہیں۔ یہاں امریکا میں رپورٹنگ کے دوران آپ کو یہ خدشہ نہیں ہوتا کہ ابھی بم پھٹ جائے گا یا گولیاں چل جائیں گی۔ لیکن پاکستان میں بڑے سیاسی جلوسوں سے لے کر خود کش دھماکوں کی کوریج یا نارگٹنگ کلنگ سے لے کر کسی حکومت مخالف تحریک کی رپورٹنگ تک، ایک صحافی اپنی جان پھینکی پر لیے پھرتا ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ نے جس تیزی سے ہماری دنیا بدلی ہے وہ ایک مثال ہے۔ گزرتے برسوں نے ثابت کیا کہ ٹیکنالوجی اور جدت کے اس دور میں انٹرنیٹ نے صحافت کی بھی ایک نئی سمت متعین کی ہے۔ پہلے جو خبر گھنٹوں میں آپ تک پہنچتی تھی، اب انٹرنیٹ کی بدولت چند لمحوں میں پوری دنیا میں پھیل جاتی ہے۔ یوں ہماری تیزی سے بدلتی، سکڑتی اور سمٹی دنیا میں کسی بھی شعبے سے وابستہ فرد کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کا بھرپور فائدہ اٹھائے..... نیوز چینل پر کام کرنے والے ہر صحافی کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کام انٹرنیٹ پر موجود ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھ سکیں۔ اس کی

بہ ایک نیوز رپورٹ یا فیچر رپورٹ پر کی جانے والی محنت

ہے۔ رپورٹ کی فلمنگ سے لے کر سکرپٹ لکھنے اور ایڈیٹنگ تک ہر مرحلہ محنت طلب ہے۔ اسی لیے ایک رپورٹر کے لیے ٹی وی پر اپنی رپورٹ چل جانے کے باوجود اسے سوشل میڈیا کے ذریعے نشر کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے پاکستان میں بہت سے نیوز چینلز پیشہ ورانہ اصول و ضوابط کے بجائے چینل کے مالک کی منشاء پر چلائے جاتے ہیں۔ پاکستان میں اب بھی چند نیوز چینلز کے مالکان کی سوچ یہ ہے کہ ٹی وی پر چلنے والی تمام رپورٹس اس نیوز چینل کی ملکیت ہوتی ہیں جس پر وہ نشر کی جانی ہیں اور رپورٹر کا اس پر کوئی حق نہیں ہوتا۔ اتنا بھی نہیں کہ وہ اپنی ہی بنائی نیوز رپورٹس، نیوز کلیپس یا فیچر رپورٹس کو انٹرنیٹ پر شائع کر سکے یا اپنے ذاتی ریکارڈ میں رکھ سکے۔ اس سلسلے میں امریکی اداروں کی پالیسی مختلف ہے۔ مثال کے طور پر یوٹیوب پر نہ صرف ہمارا آفشیل چینل اردو وی او اے کے نام سے موجود ہے بلکہ ہماری انتظامیہ تمام رپورٹرز کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ اپنی بنائی ہوئی رپورٹس سوشل میڈیا کی ویب سائٹس پر شائع کریں اور اپنا کام دنیا کے سامنے لائیں۔

پاکستان اور امریکا میں صحافت کا انداز مختلف ہونے کے باوجود دل میں کہیں نہ کہیں یہ خواہش ضرور ابھرتی ہے کہ کاش ہم پاکستان میں بھی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال رکھ کر صحافت کے شعبے میں عملاً بہتری لاسکیں۔ مشکل ترین حالات میں بھی اپنے فرائض نبھاتے اور پل پل کی خبر دیتے ہمارے وہ صحافی جو پاکستان میں صحافت کی ایک نئی تاریخ رقم کر رہے ہیں، انھیں چند ایسی بنیادی سہولیات تک رسائی دے سکیں جو ان کا حق ہیں..... لیکن انڈین گانوں سے نیوز پیچرز کو سجاتے، بریکنگ نیوز کی دوڑ میں بھاگتے، چٹ پٹی خبر کی بنیاد پر چینل کو ہونے والی آمدن کا حساب لگاتے اور ریٹنگ کے گرافس کے اوپر نیچے ہوتے پیمانوں پر خبر متعین کرنے والے ہمارے نیوز چینلز اور ان کے مالکان شاید اس منزل سے ابھی دور ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب میڈیا کا مقصد خبر دینے کی بجائے خبر بیچنا ہو تو اصول اور ضابطہ اخلاق جیسی باتیں دیوانے کا خواب ہی لگتی ہیں۔



اپنے ساتھی کی رہائی اور 10 لاکھ ڈالر کی خاطر

لاش کی چوری

عقل انسان کو دنگ کرنے والے ایک شیطانی منصوبے کا احوال
انہوں نے ایک مقبول صدر کی لاش چرا لے کر فیصلہ کیا تھا

جرائم

تھا۔ جعل سازی کے میدان میں یعنی جعلی نوٹ چھاپنے میں اس گروہ کو خاص مہارت حاصل تھی۔ ان کے تیار کردہ نوٹوں اور اصلی نوٹوں میں گہری مماثلت پائی جاتی تھی۔ کسی شخص کو شبہ تک نہ ہوتا تھا کہ اسے جعلی نوٹ دیا جاتا ہے۔

اس خطرناک گروہ کا سرغنہ بن بائیڈ تھا۔ چند ہی برسوں میں یہ لوگ اتنے دولت مند ہو گئے کہ انہوں نے اصل سے مشابہ نوٹ اتنی زیادہ تعداد میں تیار کر لیے کہ سرکاری خزانے اور بینک والوں کو اس بات کی پریشانی لاحق ہو گئی کہ سرکاری طور پر چھاپے جانے والے نوٹوں کے مقابلے میں اتنی بڑی تعداد میں نوٹ کہاں سے آ گئے۔ خفیہ تفتیشی ادارے نے

کی دنیا بڑی وسیع ہے۔ اس دنیا میں بڑے بڑے نامی گرامی مجرم گزرے ہیں جنہوں نے ایسے ایسے جرائم کیے ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور ان جرائم نے دنیا میں تہلکہ مچا دیا۔ امریکا میں جرائم پیشہ لوگوں کے ایک ایسے ہی گروہ کا نام ”بگ جم گروہ“ (Big Jimm Group) ہے۔ اس گروپ نے بڑی شہرت پائی۔ اس گروہ کے افراد جعل سازی میں بہت مشہور تھے۔ ”بگ جم نامی“ یہ گروہ ۱۸۷۶ء میں امریکا کی ریاست ”ایلی نوائے“ میں سرگرم تھا۔ یہ گروہ چھوٹے چھوٹے کام کرنا پسند نہیں کرتا

تحقیق کی تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ یہ نوٹ اصلی نہیں ہیں۔ یوں پولیس اور دیگر حکومتی ادارے سرگرم عمل ہو گئے۔ بالآخر مجرموں کا سراغ مل گیا اور گروہ کے سرغنہ بن بائیڈ کو عین اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ نوٹ بنانے میں مصروف تھا۔ بن بائیڈ کے باقی ساتھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ بن بائیڈ کو ۱۰ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور اسے جیل بھجوا دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ مجرم خواہ کتنا ہی چالاک کیوں نہ ہو، قانون کی پکڑ میں ایک نہ ایک روز آ ہی جاتا ہے۔ گروہ کے سرغنہ بن بائیڈ کی گرفتاری اور سزا کے بعد ”بگ جم گروہ“ کے دوسرے افراد بھی پریشانی کا شکار ہو گئے۔ ان کے پاس جو جعلی نوٹ تھے، انھیں بازار میں لانے سے وہ ہچکچانے لگے۔ آخر کام تو چلانا تھا چنانچہ بڑی احتیاط سے وہ بازار میں جعلی نوٹ چلاتے، آہستہ آہستہ ان جعلی نوٹوں کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا۔ چونکہ جعلی نوٹوں کے ہلاک بنانے میں بھی بن بائیڈ کو ہی مہارت حاصل تھی، اس لیے جعلی نوٹ بنانے اور چھانپنے کا دھندہ بھی ختم ہو گیا۔

”بگ جم گروہ“ کے باقی افراد جب مالی مشکلات کا شکار ہونے لگے تو انھوں نے سوچا کہ ان کی عیش و عشرت اسی صورت میں جاری رہ سکتی ہے کہ اپنے سربراہ بن بائیڈ کی جیل سے رہائی کو یقینی بنایا جائے۔ لیکن یہ تقریباً ناممکن تھا اور اس کی سزا بھی کافی سال باقی تھی۔ ”بگ جم گروہ“ کے افراد نے بہت سوچ بچار کی کہ کس طرح سے وہ اپنے پاس بن بائیڈ کو رہا کر سکتے ہیں۔ اس سوچ بچار کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ایسا شیطانی منصوبہ تیار ہوا جس کی مثال جرائم کی تاریخ میں تقریباً ناپید ہے۔

امریکا کے جتنے بھی صدور گزرے ہیں، ان میں ایک نام ایسا ہے جسے سب سے زیادہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ نام ہے..... ابراہام لنکن۔

ابراہام لنکن کے ساتھ امریکیوں کی محبت مختلف انداز کی ہے اور کیوں نہ ہو۔ ابراہام لنکن نے اپنے دور صدارت میں غلامی کے تصور کو ختم کیا تھا۔ حبشیوں یعنی سیاہ فام لوگوں کو پہلی بار انسانی حقوق ملے تھے۔ ملک میں جو بڑے پیمانے پر

خانہ جنگی شروع ہوئی تھی، اس میں بھی ابراہام لنکن سے اہم بے مثال قیادت میں ملک کو تباہی سے بچایا تھا۔ یہ تو تھے ابراہام لنکن..... اب ہم آتے ہیں ”بگ جم گروہ“ کے اس خطرناک منصوبے کی طرف۔ گروہ کے مجرموں نے منصوبہ بنایا کہ وہ ابراہام لنکن (جو کب کا مر چکا تھا) کی لاش کو تاج تابوت کے اس کے مدفن سے چوری کر لیں۔ منصوبے کی تفصیل یہ تھی کہ رات کو ابراہام لنکن کی لاش تابوت سے چوری کر کے ایک تیز رفتار گھوڑا گاڑی کے ذریعے شمالی انڈیانا میں مشی گن جھیل کے کنارے لے جا کر ریت کے ٹیلوں میں چھپا دیا جائے۔ گھوڑا گاڑی استعمال ہوگی تو اس کے نشانات جلد ہی ریت میں دب جائیں گے اور کسی کو سراغ نہیں مل سکے گا۔ ان جعل سازوں کو اس بات کا بھی علم تھا کہ ابراہام لنکن کی لاش کی چوری سے صرف امریکا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں ہلچل مچ جائے گی۔ امریکا کی بدنامی ہوگی۔ حکومت اور عوام ہر ممکنہ قیمت پر ابراہام لنکن کی لاش واپس لینے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ یہ وہ وقت ہوگا جب یہ لوگ حکومت سے ڈیل کریں گے اور یہ شرط رکھیں گے کہ حکومت ان کے ساتھی بن بائیڈ کو رہا کرے اور ۱۰ لاکھ ڈالر بھی ادا کرے۔ ان مجرموں کی ذہانت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انھیں علم تھا کہ امریکی قانون میں کسی کی لاش چرانا جرم نہیں سمجھا جاتا۔ اس لیے سزا بھی نہیں مل سکے گی۔ چنانچہ ساری منصوبہ بندی کے بعد بالآخر گروہ نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۶ نومبر ۱۸۷۶ء کے دن کا انتخاب ہوا۔ ۶ نومبر کی شام تک سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ گروہ کے افراد اس روز سپرنگ فیلڈ پہنچے جہاں ابراہام لنکن کا مقبرہ تھا۔ ۶ نومبر کا انتخاب اس لیے کیا گیا تھا کیونکہ اس روز ریاست میں عام انتخابات ہو رہے تھے۔ گروہ کے کارندے جانتے تھے کہ لوگ اور سرکاری عملہ و پولیس انتخابات میں مصروف ہوگی، اس لیے انھیں اپنا منصوبہ مکمل کرنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں ہوگا۔ ابراہام لنکن کا مقبرہ بھی آبادی سے تقریباً دو میل دور تھا۔ اس لیے منصوبہ سازوں نے اپنا کام آسانی سے کیا۔

سب سے پہلے انھوں نے مقبرے کے دروازے کو کاٹا، اندر داخل ہونے کے بعد قبر سے سنگ مرمر کا تختہ اٹھایا اور پھر وہاں موجود سبھی لوگ وہ تابوت کھینچ کر باہر نکالنے لگے جس میں ابراہام لنکن کی لاش مقفل تھی۔ اس گروہ میں شامل سو ایک لیز نامی شخص کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ اشارہ پاتے ہی اس گھوڑا گاڑی کو قریب لے آئے جسے مقبرے سے تقریباً دو سو گز دور ایک خشک نالے میں چھپایا گیا تھا۔ سو ایک لیز اس گروہ کا بالکل نیا کارکن تھا۔ جب تابوت نکالا جا رہا تھا تو سو ایک کو گھوڑا لانے کا اشارہ ملا۔ وہ مقبرے سے ذرا دور گیا۔ پھر اس نے سگار منہ میں رکھ کر اسے سلگانے کے لیے جیسے ہی دیا سلائی جلائی، پولیس کے ۸ آدمی جو کہیں چھپے بیٹھے تھے، دوڑے آئے۔ سو ایک لیز نے انھیں کہا ”واش“ (صاف کر دو یعنی پکڑ لو)۔ دیا سلائی کا جلنا دراصل چھپے ہوئے پولیس اہل کاروں کو اشارہ تھا کہ آ جاؤ۔

سو ایک جو ”بگ جم گروہ“ کا نیا کارکن تھا، درحقیقت پولیس کا آدمی تھا جو اس گروہ کو موقع پر پکڑنا چاہتا تھا۔ گروہ کے کسی بھی آدمی کو اس پر شک نہ ہوا۔ اشارہ ملتے ہی انھوں سپاہی پستول لیے مقبرے کے اندر داخل ہو گئے۔ سپاہیوں نے تاریکی کی وجہ سے لاکار..... لیکن وہاں کوئی آہٹ سنائی نہ دی تو انھوں نے روشنی کر کے دیکھا۔ وہ تابوت جس میں ابراہام لنکن کی لاش تھی، قبر سے باہر پڑا تھا۔ مجرم وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ شاید انھیں عین وقت پر خطرے کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ سپاہیوں کے آنے سے پہلے ہی نکل گئے تھے۔

اس واقعہ کے ۱۰ روز بعد اس گروہ کے ارکان کو ”شکاگو“ سے گرفتار کر لیا گیا جہاں وہ پناہ لیے ہوئے تھے۔ انھیں سپرنگ فیلڈ کی جیل میں بند کر دیا گیا جہاں ان پر دن رات کڑا پہرہ رہتا تھا۔ جیسے ہی لوگوں کو اس گروہ کے اس خوفناک منصوبے کا علم ہوا تو سارے امریکا میں غصہ دیدنی تھا۔ لوگ مطالبہ کر رہے تھے کہ ان کے محبوب کی لاش چوری کرنے والوں کو پھانسی دی جائے۔ ابراہام لنکن کے بیٹے رابرٹ لنکن، جس کی شادی ایک دولت مند خاندان میں ہوئی

تھی، نے اپنے باپ کی لاش کی بے حرمتی کرنے والوں کو تختہ دار تک پہنچانے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے امریکا کے قابل ترین وکیلوں کی خدمات حاصل کیں لیکن بالآخر یہ ساری کوششیں بیکار گئیں۔ دراصل مجرموں نے اپنا منصوبہ بڑی دانش مندی سے تیار کیا تھا۔ انھیں پہلے سے معلوم تھا کہ امریکی قانون میں لاش کی چوری کو جرم نہیں سمجھا جاتا اور قانون ایسے مجرم کو کوئی سزا بھی نہیں دیتا۔

یوں ان مجرموں کے خلاف صرف یہ جرم ثابت ہوا کہ انھوں نے ۵۷ لاکھ مالیت کے تابوت کو چرانے کی کوشش کی ہے اور اس میں انھیں ناکامی ہوئی ہے۔ مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو پہلی پیشی پر ہی بعض ججوں نے فیصلہ دیا کہ مقدمہ خارج کر دینا چاہیے کیونکہ امریکی قانون کے مطابق تابوت یا لاش چرانا سرے سے کوئی جرم ہی نہیں ہے لیکن جیوری کے بعض ممبروں اور دیگر ججوں کے اصرار پر بالآخر ”بگ جم گروہ“ کو کوئی سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ان مجرموں کو جنھوں نے اپنے ساتھی کو رہائی دلانے کے لیے ایک گھناؤنا منصوبہ تیار کیا اور امریکی صدر کی لاش چرانے کا منصوبہ بنایا، انھیں اس جرم کی بادشاہ میں صرف ایک سال کی سزا سنائی گئی۔ چونکہ لنکن کے دوستوں کو یہ خدشہ تھا کہ پھر کسی وقت چور اس کی لاش چرا کر لے جائیں گے۔ اس لیے لنکن کی یادگار کی ایسوسی ایشن نے اسے لوہے کے صندوق میں بند کر کے ایک غار میں جو ایک طرح کی کوٹھڑی تھی، چھپائے رکھا۔ اس عرصے میں ہزاروں لوگ صرف اس کے پتھر کے خالی تابوت ہی کو اس کی لاش سمجھ کر اس کی زیارت کے لیے جاتے رہے۔

کئی وجوہات کی بنا پر لنکن کی لاش کو ۱۷ دفعہ منتقل کیا گیا، لیکن پھر اسے مستقل طور پر ایک فولادی کمرے میں قبر سے نیچے ۶ فٹ تک پختہ زمین میں رکھ دیا گیا۔ اس کیس نے اس وقت بڑی شہرت حاصل کی تھی اور ظاہر ہے یہ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا واقعہ تھا جس میں عوام کے محبوب لیڈر اور سابق امریکی صدر ابراہام لنکن کی لاش چوری کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔



ذہن کے پردوں پر سوالیہ نشان چھوڑ جانے والے چند واقعات

وہ کون تھا؟

ایک بھرے پرے گھر کا ماجرا

ان کا واسطہ ایک بوڑھے جن سے پڑ گیا تھا جو تہجد کے وقت پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چلتا تھا

۱۹۸۵ء کا سن تھا۔ ہم چند ماہ قبل ہی سعودی عرب سے لاہور منتقل ہوئے تھے۔ لاہور چھاؤنی کے جس گھر میں رہائش پذیر ہوئے اس کا رقبہ ۵ کنال پر مشتمل تھا۔ ایک کنال پر گھر کی تعمیر تھی اور باقی رقبہ گھاس سے ڈھکے ہوئے بڑے بڑے قطعات پر مشتمل تھا۔ دسمبر کا مہینا تھا اور ان دنوں لاہور میں اس مہینے بھی سردی کا موسم سخت سرد اور شدید ہوا کرتا تھا۔ ہمارے دو ماموں بھی اپنے خاندان سمیت اسی گھر میں رہائش پذیر تھے۔ گھر کی طرز تعمیر و کوریئر طرز کی تھی، یہ گھر کسی انگریز نے برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے قبل تعمیر کرایا تھا۔ تقسیم پر جلدی میں فروخت کر کے انگلینڈ سدھار گیا تھا۔ ہم نے جس سے گھر خریدا، انھیں گھر فروخت کرنے کی بہت عجلت تھی۔ وہ کوئی مناسب توجہ تو پیش نہ کر سکے، بس یہی بتایا کہ وہ یہاں بے چینی محسوس کرتے ہیں۔

۱۹۸۵ء کا سن تھا۔ ہم چند ماہ قبل ہی سعودی عرب سے لاہور منتقل ہوئے تھے۔ لاہور چھاؤنی کے جس گھر میں رہائش پذیر ہوئے اس کا رقبہ ۵ کنال پر مشتمل تھا۔ ایک کنال پر گھر کی تعمیر تھی اور باقی رقبہ گھاس سے ڈھکے ہوئے بڑے بڑے قطعات پر مشتمل تھا۔ دسمبر کا مہینا تھا اور ان دنوں لاہور میں اس مہینے بھی سردی کا موسم سخت سرد اور شدید ہوا کرتا تھا۔ ہمارے دو

خبر۔ دسمبر کی سردیوں کی رات تھی۔ بجلی ان دنوں بھی جاتی تھی اور بجلی جانے کی صورت میں زیادہ تر عین استعمال کی جاتی۔ اس وقت بھی بجلی گئی ہوئی تھی اور گھر کے مرد حضرات بوجہ گھر سے باہر تھے۔ گھر کی تمام قوانین، بچوں سمیت گھر کے وسطی بڑے کمرے میں آتش دان کے گرد قالین پر منڈلی جمائے ہوئے تھیں۔ ان دنوں "تھوڑا گروپ" کی بہت دہشت تھی جو رات کی تاریکی میں ہتھوڑے سے سر کچل دیا کرتا تھا۔ اس وقت بھی یہی موضوع زیر بحث تھا۔

زیر بحث موضوع کے پیش نظر ماحول میں ایک عجیب پراسراریت اور خوف کی فضا سرایت کر گئی تھی جس سے قائف ہو کر میں اور میری ہم عمر ماموں زاد بڑوں کی نظر سے بچ کر باہر برآمدے میں آگئے۔ گھر کا نقشہ کچھ اس طرح کا تھا کہ رقبے کے ایک سرے پر داخلی گیٹ تھا اور دوسرے سرے پر گھر کی تعمیر تھی۔ چاند کی معمولی روشنی چار سو پچھلی تھی۔ ہم برآمدے میں دھری کرسیوں پر بیٹھ کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگے۔ ہمارا رخ داخلی دروازے سے آنے والے راستے کی طرف تھا۔ اچانک وہاں سے ہمیں کوئی شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس لیے کہ داخلی دروازہ لگا ہوں سے اوجھل تھا، فاصلے اور اندھیرے کی زیادتی کے باعث صرف اس کا سفید لباس نمایاں تھا جس میں وہ سرتاپا ملبوس تھا۔ لباس کی سفید رنگت میں عجیب سا اجلا پن تھا جو اتنی دوری کے باوجود بھی محسوس ہوتا۔

چند لمحے ہم اسے اپنی طرف آتا دیکھتے رہے پھر بچپن کے تجسس سے مجبور ہو کر یہ جاننے کے لیے کہ کون آ رہا ہے؟ ہم نے بھی اس کی طرف قدم اٹھائے لیکن اگلا لمحہ شدید حیرت لیے ہوئے تھا کہ وہ شخص رخ بدلے بغیر اٹنے پاؤں پیچھے کی جانب جانے لگا۔ میں اور میری کزن بے حد محفوظ ہوئے اور ہنستے ہوئے اس کی نقل میں خود بھی رخ بدلے بغیر پیچھے چلنے لگے۔

اسی لمحے وہ شخص پھر ہماری طرف بڑھنے لگا۔ ہم بھی اس کی طرف بڑھے۔ اب یوں ہوا کہ ہم آگے

جاتے تو وہ رخ بدلے بغیر پیچھے جاتا اور وہ آگے آتا تو ہم رخ بدلے بغیر پیچھے کی طرف جاتے۔ پانچ چھ دفعہ کے بعد ہمیں کچھ غیر معمولی پن کا احساس ہوا اور ہم خوفزدہ ہو کر اندر بھاگے۔ اندر جا کے بڑوں کو بتایا تو وہ بھاگے بھاگے باہر آئے کہ کوئی چور اچکا نہ ہو۔ لیکن باہر تاریکی کا راج تھا اور اس شخص کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

میں آج بھی جب اس واقعے کو یاد کرتی ہوں تو وہ اپنی جزئیات سمیت میری یادداشت کی تختی پہ ابھر آتا ہے۔ اس میں سب سے نمایاں آدمی کے سفید لباس کا اجلا پن تھا۔ اور میرے رگ و پے میں ویسی ہی سنسنی دوڑ جاتی ہے جیسے اس لمحے مجھے محسوس ہوئی تھی۔

معلوم نہیں وہ کون تھا؟؟

میرے والد کی سعودی عرب سے وطن واپسی ہوئی تو انھوں نے سیالکوٹ کے نواح میں پہلے سے خرید کر رکھی گئی زمین پر دو منزلہ گھر تعمیر کرایا۔ ڈیڑھ کنال کے رقبہ میں سے ۱۰۰ مربع پر گھر تعمیر شدہ تھا جب کہ بقیہ قطعہ زمین سبز یوں، پھلوں، پھلوں والے پودوں اور بیلوں سے مزین تھا۔ گھر کے نیچے والے حصے میں رہائش تھی جب کہ اس سے اوپر والا پورن خالی رہتا تھا۔ اس سے اوپر کھلی چھت تھی جس کے گرد چار دیواری تھی۔

اب یوں ہوا کہ عین تہجد کے وقت اوپر کی منزل سے ایسی آواز آتی گویا کوئی بے حد ضعیف شخص چلنے کی کوشش میں آہستہ آہستہ پاؤں گھسیٹ رہا ہے۔ یہ روز کا معمول ہو گیا، ادھر موذن تہجد کی اذان کے لیے آواز بلند کرتا ادھر پاؤں کے گھسٹ گھسٹ کر چلنے کی آواز آنا شروع ہو جاتی۔ ہم اپنے اپنے لحافوں میں مزید دبک جاتے۔ پاؤں گھسنے کی آواز کمرے سے شروع ہو کر اس سے ملحقہ غسل خانے پر جا کے ختم ہو جاتی۔ ہم نے خود ہی اخذ کر لیا کہ کوئی عمر رسیدہ "جن" ہیں جو تہجد کے وقت وضو کی غرض سے غسل خانے کا رخ کرتے ہیں اور ان کا نام "باباجی" رکھ دیا۔

کچھ دن ہوئے تو آواز کا رخ نیچے کی طرف آتی سیرھیوں کی طرف ہوا۔ ایک شام جب سب گھر والے



عمل پیہم کی داستان - ایک دیہی سکول کی ہیڈ ماسٹریس کی زبانی

ویرانے میں پھول

پھریں گی، میں ہی مڈل سے ہائی ہو جاتا ہوں۔ یوں قدرت نے یکم جولائی ۲۰۰۸ء کو محض ہمارے لیے اس سکول کو سینڈری (ثانوی) سکول بنا دیا۔ خاص میرے لیے کیونکہ جولائی ۲۰۱۱ء کو میں نے خانیوال سے میانوالی (میاں کی جائے تقرری کی وجہ سے) ٹرانسفر کرایا تو تب سے سکول ہیڈ ماسٹریس سے محروم ہے۔

۵ اگست ۲۰۰۸ء کی بادلوں بھری دوپہر میں موٹر سائیکل پر اونچے نیچے کچے کچے راستے سے گزر کر جب پہلی دفعہ نوزائیدہ ہیڈ ماسٹریس، نوزائیدہ ہائی سکول میں داخل ہوئی تو سکول کی چار دیواری کے اندر سکول ڈھونڈتی پھری۔ داخلی دروازے کے پاس سبز یوں کی چند بلیں، دو اطراف سکول کی عمارت، ذرا آگے بڑھے تو جڑی بوٹیوں

جون ۲۰۰۸ء کی وہ دوپہر گرم اور تپتی ہوئی لیکن روح تک کو شاد کرنے والی تھی۔ یہ میری تب تک کی زندگی کی خوبصورت ترین دوپہر تھی۔ اس روز پبلک سروس کمیشن پنجاب ہیڈ ماسٹریس بی بی ایس، ۱۷ کا نتیجہ منظر عام پر لایا تو مابعد دولت اس فہرست کے ایک کونے کھدے سے دستیاب ہوئی گئی اور یوں میرا پاکستان میں بھی میرٹ پالیسی ہے پر ایمان قائم رہا۔

منتخب ہونے کے بعد اگلا مرحلہ جائے تقرری کی تلاش تھی۔ تلاش سکول کے اعلان کے بعد بس باقاعدہ اشتہار دینے کی کسر باقی تھی جب ۹۳/۱۰R خانیوال کے محل سکول نے کہا ”میڈم صاحبہ آپ کہاں ماری ماری

۲۲

انھیں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا۔ میرے والد صوم و صلوة کے پابند اور تہجد گزار تھے۔ پیشے کے لحاظ سے وکیل، لیکن سچ بولنے پر اس قدر گارنڈ کہ سخت ضرورت کے وقت بھی ایسا کوئی کیس لینے سے انکاری ہو جاتے جس میں ہلکی سی بھی غلط بیانی کا شائبہ ہوتا۔ اس گھر میں ان کا معمول تھا کہ وہ گرمیوں کے موسم میں رات کا بستر سب سے اوپر والی چھت پہ لگاتے تھے۔ تہجد کے وقت اٹھ کر نیچے آتے اور وضو کرتے تھے۔ ایک رات والد صاحب کی آنکھ پائل بجنے کی آواز سے کھلی۔ چند دن سکون رہا۔۔۔۔۔ پھر ایک رات تہجد کے لیے اٹھے تو نظر کے سامنے ایک عجیب وجود تھا۔ والد صاحب کا بیان ہے کہ اس کا صرف دھڑ دھڑکا دیتا تھا جب کہ نچلا حصہ غائب تھا۔ رنگت بے حد سیاہ تھی، کونکے کی مانند۔۔۔۔۔ اور آنکھیں نیلی تھیں جن میں سے نیلگوں روشنی نکل کر سیدھی ان کی آنکھوں پر پڑتی تھی۔۔۔۔۔ والد صاحب چند ساعت اس کی طرف دیکھتے رہے پھر اطمینان سے اٹھے اور سیرھیاں اتر کر نیچے آگئے۔ اپنے اوپر گھبراہٹ بالکل نہ طاری ہونے دی۔

پے در پے پیش آنے والے واقعات کے بعد گھر میں قرآن خوانی اور اجتماعی دعا کرائی گئی۔۔۔۔۔ جس کے بعد ان عجیب و غریب پیش آنے والے واقعات کا سلسلہ یک لخت بند ہو گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ زمین قیام پاکستان سے قبل کسی ہندو کی ملکیت تھی جو قیام پاکستان کے بعد بھی کافی عرصہ غیر آباد رہی۔

ایک عام انسان کو اپنی روزمرہ زندگی کے معمولات میں کئی ایک محیر العقول واقعات پیش آتے ہیں۔ لیکن بچپن میں پیش آنے والے ایسے واقعات ذہن کے پردے پر کئی ان مٹ سوا لیاہ نشان چھوڑے جاتے ہیں۔ جو عمر رفتہ کی کئی منزلیں طے کرنے کے بعد بھی راز ہی رہتے ہیں۔۔۔۔۔

باہر باغیچے میں بیٹھے چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو میری بڑی ہمشیرہ اندرا کیلی بیٹھی پڑھائی میں مشغول تھیں۔ انھیں کوئی شخص لاؤنج سے کچن اور پھر کچن سے لاؤنج کی طرف جاتا محسوس ہوا۔ انھوں نے نظر انداز کر دیا کہ گھر کا کوئی فرد ہوگا۔ وہ سر جھکائے قالین پر کتابیں بکھرائے ان میں محو تھی کہ کوئی چلتا ہوا قالین کے قریب پہنچ کر ان سے چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ انھوں نے ذرا نظر اوپر اٹھائی تو وہاں کسی بھی قسم کا وجود ناپید تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر باہر آگئی اور اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ گوش گزار کیا۔

کچھ دنوں بعد والد صاحب کو رات کے وقت سیرھیاں سے کوئی اوپر جاتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے آواز دی لیکن جواب نہ آیا۔۔۔۔۔ چند دن بعد بات آئی گئی ہو گئی۔ رمضان کا بابرکت مہینا شروع ہوا تو والد صاحب اعتکاف میں بیٹھ گئے۔ رمضان میں ہمارا معمول ہو گیا کہ گھر کی روشنیاں گل کر کے پچھلے حصے میں ہی بیٹھک میں جمع ہو جاتے اور خوب گپ شپ لگاتے۔ دن مزے سے گزر رہے تھے۔ ایک رات میں افطاری کے بعد لاؤنج میں ٹی۔وی چلا کر بیٹھ گئی۔ لاؤنج سے سیرھیاں اوپر کی منزل کی طرف جاتی تھیں اور سیرھیاں کے بالکل سامنے ایک کمرہ تھا۔ میرے بڑے بھائی کچھ وقت ہوا اس کمرے میں گئے تھے اور اندر سے کمرے کی چٹخنی چڑھائی۔ میں اس زاویے سے بیٹھی تھی کہ وہاں سے اگر کسی کا بھی گزر ہوتا تو میری نگاہ سے ہو کے جاتا۔

اچانک میرے بھائی زور دار آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر آگئے۔ انھوں نے فوراً پوچھا ”یہاں کون تھا؟“ میں نے جواب دیا ”کوئی نہیں، میں اکیلی بیٹھی ہوں۔“

وہ کہنے لگے ”ابھی کسی نے دروازے کا ہینڈل نیچے کر کے پورے زور سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، لیکن چٹخنی کی وجہ سے دروازہ نہ کھل سکا۔ ان کی چھٹی حس نے کسی غیر معمولی پن کا احساس دلایا تو وہ دروازہ کھول کر باہر آگئے۔۔۔۔۔“ اب ہم خوفزدہ ہو گئے۔ والد صاحب اعتکاف سے واپس آئے تو

سے انا ایک ویرانہ! وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یا اللہ کس جرم کی سزا دی ہے جو گورنمنٹ گرلز سکول کچا کھوہ کے باغ باغیچوں، پکی روشوں اور اعلیٰ نظم و ضبط کے حامل تعلیمی ادارے سے نکال کر ان بنیادوں میں لا پھینکا؟ گلابوں سے مہکتے سبزہ زار کو چھوڑ کر ٹیکڑوں کے کانٹوں سے اٹے ویرانوں کو میرا نصیب بنا دیا ہے؟

پبلک سروس کمیشن پنجاب سے منتخب ہیڈ ماسٹریس ہونے کا فخر مایوسی میں ڈھل گیا۔ اس ظاہری حالت کے ساتھ اندرونی حالت خستہ تر تھی۔ عمارت کھنڈر کی صورت، اساتذہ نظم و ضبط سے نا آشنا اور طالبات منتشر ہجوم۔ پہلی استانی کی آمد کے ساتھ سکول کا آغاز ہوتا (خواہ وقت ۹ بجے ہوتا یا ۱۰ بجے کا) ایک استانی کلاس میں تب داخل ہوتی جب گھر اور اپنے بچوں کے تمام کاموں سے فارغ ہو چکی ہوتی۔ سارا دن اہل علاقہ اور اہل سکول کے درمیان طالبات کے ذریعے لین دین کا سلسلہ جاری رہتا۔ سائنس لیبارٹری کا سامان دیمک کھا گئی، فرنیچر کے نام پر ٹوٹی پھوٹی چند کرسیاں اور یک لمبا سا میز تھا۔ خزانے کے نام فقط ۱۱۰۰۰ روپے اور ماہانہ آمدن ۳۵۰ روپے کے ساتھ مسائل کے حل کا سوچنا دودھ کی نہر بہا دینے سے بھی زیادہ مشکل کام تھا۔ اہل علاقہ غریب ہی نہیں کنجوس بھی تھے۔ دو عدد ملازمین، ایک کمزور دوسرا کام چور۔ مدرسہ کیا تھا پاکستان کے حالات کی صحیح تصویر! ایسے میں پہلے ۱۰ اردن تو سمجھ ہی نہ آئی کہ سرائیوں سے پکڑا جائے؟ انگو بیٹر سے نکلی نوزائیدہ ہیڈ ماسٹریس کے لیے کونسا مسئلہ پہلے حل کرنا ضروری ہے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ بارگاہ الہی سے مدد کی طالب ہوئی۔ سابقہ سکول کی سینیئر ہیڈ ماسٹریس واجب الاحترام میڈم شہناز ملک صاحبہ نے راہنما کا فریضہ انجام دیا۔ والد صاحب نے کمر کئے کا حوصلہ بخشا تو شوہر اور بھائی نے شوہر کے فرائض انجام دینے کے ساتھ ساتھ اہل علاقہ کو جگانے کا فریضہ نبھایا۔ ایسے میں جو نیر کلرک شاہد محمود کی آمد کسی تائید غیبی سے کم نہ تھی۔ وہ بھی کلرک بن کر ریکارڈ ترتیب دیتا، کبھی وکیل بن کر دفتروں کے چکر لگاتا اور کبھی ملازم کی

صورت پھول پودوں کی آبیاری کرتا نظر آتا۔

وقت کی پابندی سے اصلاح احوال کا آغاز کیا تو اہل علاقہ نے فرمایا ”اے کوئی شہر دا سکول تان ناں کہ سوئی سے سوئی چڑھے اور استاد بچے سکول موجود تھیون“ (بہ کوئی شہر دا سکول تو نہیں کہ مقررہ وقت پر بچے اور استاد سکول پہنچ جائیں) اساتذہ نے کہا، آپ کی ہر بات مانیں گے بس وقت کی پابندی کا نہ کہیں۔ رہیں طالبات تو ان کو ایک عرصہ تک یہ بات سمجھ نہ آئی کہ سکول کا گیٹ کھلنے کے بعد بند بھی ہوتا ہے۔

لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ ۱۵۰ روپے میں اسپیشل سواری کرا کے خود وقت پر سکول پہنچتی اور شاف کو قائل کرتی۔ تقریباً تین ماہ کا عرصہ تو صرف سمجھانے پر صرف ہوا (پتا نہیں ہمارے بعض سیاستدان ۹۰ دن میں پاکستان کے مسائل حل کرنے کا دعویٰ کس طرح کرتے ہیں)۔ امریکا کی طرح گاجر اور چھڑی ساتھ ساتھ رکھی۔ حکمت و تدبیر، رعب و شفقت کے ساتھ اساتذہ کرام کے دلوں میں ایمان کو تازہ کیا۔ حکومت سے کیے گئے معاہدہ تقرری کا احساس دلایا۔ رزق حلال کے ثمرات سامنے رکھے۔ خود کو ہر کام کے لیے مثال بنایا۔ استاد بن کر کلاس پڑھائی، پی ٹی بن کر ڈسپلن قائم کیا، مالی بن کر پودے خریدے اور لگائے، خاکروب بن کر جھاڑو لگائی، اپنے ہاتھوں سے اینٹیں سینٹ لگا کر کیار یوں کو پختہ کرایا، چچی اور گھری بات خود کی اور دوسروں کو بھی سنائی۔ دوسروں کو فرائض منصبی کا احساس دلانے سے پہلے اپنے کے لیے کسی بھی قسم کا آرام، رعایت اور سہولت کا تصور تک ختم کر دیا۔ حکم جاری کرنے سے پہلے اپنی ذات پر جاری کیا۔ تعریف کا پہلا لفظ سنتے ہی سنانے والے کو کسی اور کام کی طرف متوجہ کر دیا۔ دوسروں کی خامیاں نمایاں کرنے والے کو محذور کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معجزے رقم ہونے لگے۔

اسی شاف، اہل علاقہ اور وسائل کے ساتھ صرف میر کارواں بدلنے سے ویرانے سبزہ زار میں بدل گئے۔ وہ ادارہ جہاں تعلیم ذاتی دلچسپی پر ہوتی تھی، وہاں سکول کے

وقت کار میں ایک منٹ ضائع کرنا بھی گناہ سمجھا جانے لگا۔ جہاں کی طالبات پنجم تا ہشتم کے امتحانوں میں بمشکل یا پاس ہوتی تھیں، وہاں میٹرک کی طالبات نے اے پلس (A+) گریڈ بھی حاصل کیے۔ چنانچہ شہر کے چند بہترین سکولوں کے ساتھ انتہائی پسماندہ علاقے کے ادارے کی ہیڈ ماسٹریس کے لیے سیکرٹری ایجوکیشن پنجاب کی طرف سے خصوصی توصیفی خط جاری ہوا۔

ڈسٹرکٹ ایجوکیشن سیکنڈری آفیسر رانا اکرم شاہد نے سکول کا دورہ کیا تو بے ساختہ کہہ اٹھے، ”آپ نے تو جنگل میں منگل بنا دیا۔“ ڈی۔ ایم۔ او اچانک تشریف لائے تو سکول کا معیار تعلیم اور ڈسپلن دیکھ کر وزٹ بک میں اسے علاقے کے چند بہترین اداروں میں سے ایک قرار دیا۔ میری حیثیت بے شک راہنما کی تھی مگر کمال تو اساتذہ، طالبات اور اہل علاقہ نے دکھایا۔ وہ اساتذہ جن کے لیے وقت پر سکول پہنچنا محال تھا، نہ صرف وقت سے پہلے تشریف لانے لگے بلکہ طالبات کو چھٹی کے بعد اضافی وقت بھی دینے لگے۔ وہ گرمیوں و سردیوں کی چھٹیوں میں فری سکریمپ کا حقیقی معنوں میں انعقاد کر کے میرے بہترین معاون ٹھہرے۔ ادارے کے ماحول کو محنتی، پُر امن اور بہترین بنانے میں مسز شمینہ، مسز خالدہ اور مسز عذرا نے کمال اور عمدہ حکمت عملی کا مظاہر کیا۔ کام کام اور صرف کام کی عملی تفسیر صحیح معنوں میں وہاں دکھائی دی۔ یہ سب کسی لاشی کے نتیجے میں نہیں بلکہ فرائض کے احساس کے ساتھ عمل پذیر ہوتا رہا۔ نیک نیت اور مخلص اساتذہ جب کام پر آمادہ ہوئے تو پتی دو پہریں موسم بہار کی خوشگوار ریت میں ڈھل گئیں۔

باقی رہے غریب اور کنجوس اہل علاقہ تو بڑی حکمت کے ساتھ ان میں جذبہ خیر پیدا کیا۔ ان میں سکول کے مالک ہونے کا احساس دلایا۔ ادارے کے کاموں میں ان کو شریک کیا، ان کی رائے کو اہمیت دی تو کنجوسی سخاوت میں ڈھل گئے۔ پہلے برس ۶۵ ہزار روپے، دوسرے سال تقریباً ایک لاکھ روپے اور تیسرے سال ایک لاکھ سے بھی زیادہ رقم کا

کام اپنی مدد آپ کے تحت کرایا۔ بس ابتداء اپنی ذات سے کی۔ ماہانہ ایک ہزار روپے پر ایک ٹیچر اپنی جیب سے رکھی اور پھر کسی سے کہنے، مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ کسی اہل ثروت نے پودے لگوا دیے، کسی نے سڑک مرمت کرا دی، اساتذہ اور اہل علاقہ نے مل کر خالی خزانہ لبالب بھر دیا۔ علاقے کے موثر ترین شخص، بریگیڈر رمضان شاہد نے ۱۲/۱۲/۸۰ کرسیوں اور ۵ میزوں کا گراں بہا تحفہ دے دیا۔

۲۰۰۸ء کے ویرانوں سے شروع ہونے والے اس سفر میں ادارہ ۲۰۱۱ء میں پوری شان و تقاخر کے ساتھ ممتاز تعلیمی اداروں کی صف میں کھڑا ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ اہل علاقہ کے پاس جب باہر سے کوئی مہمان آتا تو وہ سکول ضرور لے کر آتے اور کہتے، ہمارا سکول تو کسی پارک کی طرح خوبصورت ہے۔ اہل ثروت کی جو بچیاں شہر کے بہترین تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم تھیں، اسی ادارے میں داخلہ لینے کے لیے فخر سے آئیں۔ ۱۹۹۹ء طالبات سے اپنا سفر شروع کرنے والے نوزائیدہ ہائی سکول نے جب عمر رواں کے تین برس طے کیے تو طالبات کی تعداد ۴۰۰ ہو چکی تھی۔

عمل پیہم کی یہ مختصر داستان مس طاہرہ کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے جنہوں نے معذوری کے باوجود ہر طرح کی منصبی، مالی اور اخلاقی مدد کی اب میرے چلے آنے کے باوجود ادارے کی تمام تر روایات قائم و دائم رکھے ہوئے ہیں، وقت کی پابندی سے لے کر سکول کی خوبصورتی تک! ہم نصابی سرگرمیوں سے لے کر بہترین رزلٹ کے حصول تک ہر چیز میں اضافہ اس بات کی نوید ہے کہ انقلاب جب دلوں کی تبدیلی سے آتا ہے تو اس کے اثرات دیر پا ہوتے ہیں۔ کام نہ کرنے کے عادی لوگوں میں اگر فرض منصبی کا احساس پیدا کر دیا جائے تو وہی سب سے زیادہ کار آمد اور اہل ثابت ہوتے ہیں۔ محنت، خلوص اور کام کی لگن کا بیج ہر دلوں میں بو دیا جائے تو پھر ادارے زوال پذیر ہونے کی بجائے شجر ثمر بار کی طرح ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ مزید ثمر آور ہونے لگتے ہیں۔

☆☆☆☆



ایک صدر ایسا جو خود بھی غریب ہے

یوراگوئے کے صدر مملکت "خوسے موخیکا" کا ماجرا
وہ اپنی آمدنی کا 90 فیصد عوام پر کیوں خرچ کرتا ہے

کسی

ہی نہیں ہیں۔ انھیں اس بات کی قطعاً فکر نہیں کہ عوام کے پاس روزگار ہے یا اُن کے پاس سر چھپانے کے لیے چھت اور دو وقت کی روٹی بھی ہے یا نہیں؟ انھیں دن رات یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ اپنی جیبیں کیسے بھرنی ہیں۔ دنیا

بھی ملک کے سربراہ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے عوام کے فائدے کے لیے ترجیحی بنیادوں پر کام کرے۔ شاید ہمارے نصیب میں ایسے حکمران آئے



لچبی معلومات اور کچھ کرگزرنے کا جذبہ،
یہی ہے اس کوئز کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوئز

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

انچارج کوئز:
علامہ حباد

قصہ کوئز دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر آکسان اور زندگی کو با مقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔
لچبی معلومات اور کچھ کرگزرنے کا جذبہ، اس کی ۳ بنیادی خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو پڑھیں اور ہر قصے کے آخر میں دیے گئے ۲ سوالات سے اپنی ذہانت کو پرکھیں۔ درست جواب ہمیں بجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہونے تو قرعہ اندازی کی جائے گی اور خوش نصیبوں کو ”آرڈو ڈائجسٹ“ کے ۶ شماروں کی انعامی و اعزازی ترسیل کے علاوہ
اس شاہ کی شاعری کی ۲ خوبصورت کتابیں دی جائیں گی۔

جوابات بھیجنے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور**

قصہ کوئز ۱۔ (الف) احمد شاہ ابدالی (ب) ۷ (سات)

قصہ کوئز ۲۔ (الف) ابن بطوطہ (ب) سفر نامہ ابن بطوطہ، ۵۰۰۰ میل

قصہ کوئز ۳۔ (الف) ابن الہیثم (ب) تین اقسام: شفاف، نیم شفاف، غیر شفاف

درست جوابات دینے والوں کے نام

شعیب شاہد (لاہور)، شیر نواز گل (پشاور)، گلزار عثمانی (لاہور)، قرۃ العین ختی رشید اعوان (گوجرانوالہ)،
اللہ بخش سومرو (شکار پور)، عنبرین (لاہور)، محمد خلیل چوہدری (دینہ)، الفت حسین (شیخوپورہ)،
سید ظفر علی (حیدر آباد)، پروفیسر خان محمد حیات (پشاور)، عاطف ممتاز (چکوال)، محمد احمد (کراچی)،
آصف کریم (حیدر آباد)، طہ یسین (حیدر آباد)، مرز فرحان بیگ (حیدر آباد)، مرزا مسرت بیگ (حیدر آباد)،
عبدالسلیم (حیدر آباد)، عقیل احمد خان (کراچی)، منور سعید خانزادہ (بینظیر آباد)، سعد عبداللہ (ہری پور)،
انوشہ کرن (لاہور)، سلیم شہزاد عظیمی (لاہور)، سید محمد افضل (اسلام آباد)، رانا ذیشان گل (لاہور)،
غلام حسین قادری (حیدر آباد)

قرعہ اندازی میں
جیتنے والوں کے نام

۱۔ عاطف ممتاز پوسٹ آفس موگلہ تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال

۲۔ محمد احمد 24/14 سلمان فارسی ہاؤسنگ سوسائٹی ملیر ہالٹ کراچی

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھیج سکتے ہیں

یوراگوئے میں ایک قانون کے مطابق صدر کو ہر سال
اپنی سالانہ آمدنی ظاہر کرنا ہوتی ہے۔ ۲۰۱۰ء میں ان کی
سالانہ آمدنی ایک ہزار آٹھ سو ڈالر تھی۔ یہ رقم ان کی
۱۹۸۷ء میں خریدی گئی گاڑی کی قیمت کے برابر ہے۔ اس
برس انھوں نے اپنے ساتھ ساتھ اپنی اہلیہ کے اٹائے بھی
ظاہر کیے ہیں، جن میں زمین، ٹریکٹر اور ایک گھر شامل
ہے۔ ان سب چیزوں کی کل قیمت ۲ لاکھ ۱۵ ہزار ڈالر
کے قریب ہے۔

یوراگوئے کے محقق لگینوز وینسر کا کہنا ہے کہ کئی لوگ
صدر مونچیکا سے ان کے انداز رہائش کے باعث ہمدردی
کرتے ہیں لیکن اس کی وجہ سے ان کی حکومت کی کارکردگی
پر تنقید کم نہیں ہوتی۔ ۲۰۰۹ء کے انتخابات کے بعد صدر
مونچیکا کی شہرت میں ۵۰ فیصد کمی واقع ہوئی ہے۔ رواں

صدر مونچیکا کو غریب ترین صدر کہا جاتا ہے لیکن
انھوں نے کبھی اس کے بارے میں نہیں سوچا۔ اُن کا کہنا
ہے ”غریب تو وہ ہوتے ہیں جو مہنگا طرز زندگی اپنانے
کے لیے کام کرتے ہیں اور ہمیشہ مزید سے مزید کی
خواہش رکھتے ہیں۔ آزادی کا معاملہ ہے۔ اگر آپ کے
پاس بہت زیادہ املاک نہیں ہیں تو آپ کو اپنی تمام عمر
انھیں قائم رکھنے کے لیے کوشش نہیں کرنا پڑتی۔ اس طرح
آپ کے پاس اپنے لیے زیادہ وقت ہوتا ہے۔“

برس یوراگوئے کے صدر دو متنازع اقدامات کے باعث
تنقید کا نشانہ بنے۔

صدر مونچیکا کو اپنی مقبولیت کم ہونے پر زیادہ پریشانی
نہیں ہے کیونکہ وہ ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں دوبارہ حصہ
نہیں لے سکتے۔ ۷۰ سال کی عمر میں اب وہ سیاست سے
ریٹائر ہونے والے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں
ریاست کی جانب سے پنشن ملے گی اور اپنے محدود خرچ
کے باعث کسی سابق صدور کی طرح ان کی آمدنی میں اتنی
کمی نہیں ہوگی جس سے انھیں کسی مشکل کا سامنا کرنا
پڑے گا۔

میں ایسے حکمران بھی ہیں جو اپنی زیادہ تر آمدنی غریب عوام
پر خرچ کر دیتے ہیں۔ یوراگوئے کے صدر خو سے مونچیکا
بھی ایک ایسے ہی حکمران ہیں جو اپنی کل آمدنی کا ۹۰
فیصد عوام کی فلاح پر خرچ کر دیتے ہیں۔

صدر خو سے مونچیکا نے حکومت کی جانب سے
مراعات سے بھرپور رہائش گاہ کو رد کر دیا اور دارالحکومت کی

صدر مونچیکا ۲۰۰۹ء میں یوراگوئے کے صدر منتخب
ہوئے۔ ۷۰-۱۹۶۰ء کی دہائی میں یوراگوئے کی بائیں
پازو کے مسلح گروپ گوریلا نوویا سروس کا حصہ رہے۔
انھیں ۴ مرتبہ گولی لگ چکی اور وہ ۱۳ سال جیل میں
رہے۔ قید کے انہی برسوں نے ان کی زندگی کی حالیہ
شکل کو ترتیب دیا۔

ایک سڑک کے کنارے اپنی بیوی کے گھر میں رہنا پسند
کیا۔ صدر مونچیکا اور ان کی اہلیہ خود کھیتوں میں کام کر کے
پھول اگاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کپڑے دھونے کے
لیے گھر کے باہر جگہ بنا رکھی ہے۔ پینے والا پانی وہ قریبی
کنوئیں سے حاصل کرتے ہیں۔ اس کنوئیں کے ارد گرد
جنگلی پھول اگے ہوئے ہیں۔

یوراگوئے کے صدر خو سے مونچیکا کی طرز زندگی دنیا
کے دوسرے رہنماؤں سے یکسر مختلف ہے۔ ان کے گھر
کے باہر صرف دو پولیس اہل کار تعینات ہیں جنھوں نے
اپنے پاس تین کتے رکھے ہیں۔

صدر مونچیکا اپنی تنخواہ میں سے ۱۲ ہزار امریکی ڈالر
غریبوں میں خیرات کر دیتے اور اسی وجہ سے وہ دنیا میں
سب سے غریب صدر جانے جاتے ہیں۔

اُن کا کہنا ہے کہ میں نے اپنی زیادہ تر زندگی ایسے
ہی گزاری ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے، میں اُسی کے
ساتھ اچھی زندگی گزار سکتا ہوں۔ صدر مونچیکا کی تنخواہ کا بڑا
حصہ غریبوں اور چھوٹے تاجروں کی مدد کے لیے مختص
ہونے کے بعد ان کی بقیہ تنخواہ یوراگوئے کے ایک عام
آدمی کے برابر رہ جاتی ہے جو ۷۵ سو ۷ ڈالر ماہانہ ہے۔

تہذیبی، ثقافتی اور سماجی قدروں کا مرکز تھی۔

(الف) کس مسجد کا ذکر ہے؟

(ب) اس مسجد کو ہندوؤں نے کب شہید کیا؟

قصہ کوئٹہ ۲

بچپن میں اسے ترکستان سے نیشاپور لایا گیا اور حاکم نیشاپور نے اسے خرید کر اس کی تعلیم و تربیت کی۔ بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں وہ سلطان معز الدین غوری کے پاس غزنی میں آیا تو وہ زمانہ اس کی جوانی کا تھا۔ سلطان غوری نے اس کی قابلیت اور لیاقت دیکھ کر چھوٹے چھوٹے عہدے تفویض کیے۔ ترائین کی دوسری لڑائی کے بعد معز الدین سلطان غوری نے مملکت پاک و ہند کا نظم و نسق اور اس کی توسیع کا کام بڑی حد تک اس کے حوالے کر دیا۔ شمال مغربی سرحد پر خطرے کی وجہ سے اسے اکثر لاہور میں رہنا پڑا۔ ایک بار چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گرا اور زخمی ہو گیا اور چار سال بعد اس زخم سے وفات پا گیا۔ اس کا مقبرہ انارکلی بازار سے ملحقہ کلی میں ہے۔ ہندوستان کی بیشتر فتوحات اس کے ہاتھ یا اس کی سرپرستی میں ہوئیں۔ وہ لکھ بجنش کے لقب سے بھی مشہور تھا۔ اس نے بہت ساری تاریخی عمارتیں بھی تعمیر کرائیں۔ جن میں مسجد قوت الاسلام دہلی، مسجد جمیر شریف قابل ذکر ہیں۔ وہ خاندان غلاماں کا بانی کہلایا۔

(الف) کس بادشاہ کا ذکر ہے؟

(ب) اس نے ایک مینار تعمیر کرایا اس کا نام

بتائیں اور وہ کون سے شہر میں ہے؟

قصہ کوئٹہ ۱

لاہور میں واقع دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے جس کے صحن میں ایک لاکھ کے قریب افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔ عید کی نماز کے موقع پر یہاں تقریباً ۵۰ لاکھ افراد کا اجتماع ہوتا ہے جو ارد گرد کے باغات میں دور دور تک صفوں کی صورت میں پھیلا ہوتا ہے۔ مسجد لاہور کے اکبری دروازہ کے سامنے مغرب کی جانب سطح زمین سے ۱۵ فٹ بلند چبوترے پر واقع ہے۔ اس کے دروازے کے سامنے کچھ فاصلے پر لاہور کا شاہی قلعہ واقع ہے۔ قلعہ اور مسجد کے درمیان حضوری باغ اور رنجیت سنگھ کی بارہ دری ہے، جسے جلو خانہ بھی کہتے ہیں۔ اس پر مغلیہ دور کا ۶ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

(الف) یہ مسجد کس نے اور کب تعمیر کرائی؟

(ب) اس مسجد کا اصل نام کیا ہے؟

قصہ کوئٹہ ۲

مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر نے جب اچودھیا کا دورہ کیا تو فتح کی خوشی اور اس دورے کی یادگار کے طور پر فیض آباد سے کوئی ۵ کلومیٹر کے فاصلے پر اچودھیا کے مقام پر تین بڑے گنبدوں والی عالی شان مسجد تعمیر کرائی۔ تعمیر کی نگرانی بابر کے امیر، میر عبدالباقی کے سپرد تھی۔ چند سال پہلے بعض متعصب ہندو لیڈروں نے اچانک یہ دعویٰ کر کے عوام کو ورغلا دیا اور مسجد منہدم کر دی کہ اس مقام پر رام چندر جی کی جنم بھومی تھی جو پورے ہندو سماج کی تاریخی، مذہبی،

چمڑے کے کاروبار سے وابستہ شفیق فیملی کے ایک فرزند دل بند شیخ محمد نعیم کی آپ بیتی، قدرت ان پر اچانک مہربان نہیں ہوئی تھی

کبھی کبھی تو خود مجھے یقین نہیں آتا کہ

65 سال سے ہماری فیملی جڑی ہوئی ہے

خیر کا کام ہماری رگوں میں دوڑتے خون کی طرح ہے

پاکستان کے دس بڑے صنعتی گروپوں میں شمار ہونے والے اس گروپ کے بانیوں نے اپنے ہاتھوں سے کچے چمڑے پہ نمک لگایا

باہم جڑے، دیانت دار، خیر سے بھرے

ایک باکمال خاندان کی کامیابی کی کہانی، ایک بیٹے کی زبانی

تحریر: تہذیب: اختر عباس

خوبصورت اور معیاری کتب

منشورات ہیڈ آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

انعامات کے لیے تعاون

آپ بیتی سننے، پڑھنے میں جس قدر خوشی اور سہولت ملتی ہے، سچ کہوں تو لکھنے میں دوگنی توجہ اور توانائی کی مطالبہ ہوتی ہے۔ ایک آپ بیتی کے لیے عام طور پر ملاقاتوں کے کئی سیشن اور نشستیں ہوتی ہیں اور وہ بھی سوال جواباً۔ پھر ان کے صفحہ احباب اور خاندان کے کچھ افراد سے ضرورت بات کرنی ہوتی ہے۔ اس بار تو ڈرائیورز اور گھر معاون سے بھی معلومات لیں، ان کے اداروں میں جانے کا اتفاق ہوا تب ہی ایک شخصی تصویر مکمل ہو پاتی ہے۔

اس ماہ کے مہمان شیخ محمد نعیم ایک بھرپور کاروباری و سماجی شخصیت ہیں۔ شفیع میگزین سے لے کر شفیع ریزو تک، چنیوٹ کے عائشہ گرلز سکول سے مسجد شان اسلام گلبرگ کی ربع صدی تک صدارت، اقراء سکولز کے نام سے ماس لٹریسی کے کامیاب تجربے میں کہ ایک کمرہ، ایک استاد والے سکولوں میں ۲۵۰۰۰ سے زائد طلبہ ان کے اداروں میں زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہے ہیں۔ ان کے خاندان کے شفیع ٹرسٹ، صدیق شفیع ٹرسٹ کی فلاحی سرگرمیاں کراچی، لاہور سے بہاولنگر اور تھر تک پھیلی ہوئی ہیں۔

۱۲۰۰ روپے سے شروع ہونے والے میگزین (چمڑے) کے بزنس میں ان کے خاندان کے بڑوں نے ایسا کیا جادو کیا کہ آج وہ ملک کا دسواں بڑا صنعتی ادارہ مانا جاتا ہے۔ ان کے خاندانی اداروں کو کئی سال سے ”بہترین ایکسپورٹرز“ کی ٹرافیوں سے نوازا جا رہا ہے۔ ملکی سطح پر تجارتی تنظیموں کی بنیادوں اور سرگرمیوں میں ان کے بھائی تنویر ملکوں کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ یہ داستان اپنے اندر بہت سی حیرتیں، قدریں اصول اور خاندانی ضوابط رکھتی ہے۔ پڑھنے والوں کے لیے اس ماہ کا تحفہ خاص..... ایک خاندان قدروں کے ایک مجموعے سے یوں عروج پا سکتا ہے تو قدرت نے باقی انسانوں کو اسی طرح کے عزائم، محنت اور کردار اپنانے، ڈھالنے سے آگے نکلنے کا راستہ بھی کھلا رکھا ہے..... خیر لفظوں میں ہوا اعمال میں یا نیتوں میں ہمیشہ پھل پھول لاتی ہے۔ یہ آپ بیتی ایسے ہی ایک پھلدار انسان کی کہانی ہے۔

اپنے تعلیمی نظام میں کوشش کی ہے کہ بچوں کو پیسے کمانے والی مشین نہ بنائیں، ان کا اخلاق بھی بہتر ہو اور کردار بھی۔ یوں چٹائی سکول بنانے سے جس سفر کا آغاز کیا تھا۔ آج وہ خواب پودے کی طرح پھل پھول رہا ہے۔

چنیوٹ میں پیدائش

یہ ۱۹۳۶ء کا کوئی مہینا تھا۔ چنیوٹ میں میری پیدائش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، پھر کراچی منتقل ہو گئے جہاں ہمارا خاندان ٹینری (چمڑے) کے کاروبار سے منسلک تھا۔ کراچی جا کر میری خوش قسمتی دیکھیے کہ جس سکول میں داخلہ ملا وہ حضرت قائد اعظم کی درس گاہ تھی، سندھ مدرسۃ الاسلام، وہاں سے میٹرک کیا۔ آدم جی سائنس کالج سے بی ایس سی کرنے کے بعد جب میں اپنے والد کے ساتھ کاروبار میں شامل ہوا تو ۱۹۶۵ء کا سال تھا۔ تب والد صاحب کو اپنی ٹینری لگائے نو دس سال ہو چکے تھے۔ آنے والے برسوں میں خدا نے ہمارے کاروبار میں

کام کرو تو پھر اسے رکنے نہ دو، بہتر کرتے جاؤ، بہترین وہ خود ہو جائے گا۔ برسوں پہلے ایک بزرگ سے یہ بات سنی تھی، وہ دل میں کھب گئی۔ مجھے یاد ہے ۲۵،۲۰ سال قبل جب ہم نے گلبرگ میں پمفلٹ تقسیم کئے کہ مالی، ڈرائیور اور کام کرنے والی مایوں کے بچوں کو ہمارے پاس پڑھنے کے لیے بھیجیں۔ ہم فیس بھی خود دیں گے، یونیفارم بھی مگر حیرت کی بات ہے کہ کوئی ایک مالی چوکیدار بھی اپنے بچے کی انگلی پکڑے ہمارے پاس نہ آیا۔ آج پنجاب اور سندھ میں اس طرح کے ۲۵۰ سکول ہیں۔ چنیوٹ میں ہمارے آبائی گھر میں قائم سکول میں ۶۰۰ سے زائد بچے ہیں۔ ۶۱ ایکڑ پہ قائم گرلز سیکشن میں ۱۲۰۰ لڑکیاں اور ۲۵۰۰۰ سے زائد بچے ہیں جو ہمارے دیگر اداروں میں پڑھ رہے ہیں، ہمارا فیملی ٹرسٹ ہے جو ڈاکٹر، انجینئر بننے والے ذہین طلبہ کو وظائف دیتا ہے۔

اس قدر برکت ڈالی کہ اس کے احسانوں کا شمار مشکل ہے۔ اب ہم ۶۵ سے زائد ملکوں کو اپنی مصنوعات بھجواتے ہیں۔ ہم کیمیکل تیار کرتے ہیں جو چمڑہ سازی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ کیمیکل ہم دنیا کے کئی ممالک کو ایکسپورٹ کر رہے ہیں۔ میرے بیٹے نے برطانیہ سے کیمیکل انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تو بھائی نے شوٹیکنالوجی کی تعلیم پانی پھر ہم نے جرمنی اور اٹلی کے بڑے صنعت کاروں کے ساتھ مل کر مشترکہ کاروبار بھی کیا۔ عالمی منڈی میں ہم اپنے جوتے بھی سپلائی کر رہے ہیں۔

Pecer Caider ہمارا اپنا برانڈ ہے۔ باٹا سنور پر دستیاب ہونے کے علاوہ فرانس اور اٹلی میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ Urban Sole, SLW, MST نے دنیا میں الگ پہچان پائی ہے۔

ہمارے اصول ہی ہماری مضبوطی ہیں۔

(۱) کوالٹی پر کپیر و مائز نہیں کرنا۔

(۲) قیمت مناسب رکھنی ہے۔

(۳) جو کہا ہے وہی اور ویسا ہی بنایا ہے۔

(۴) وقت کے اندر تیار کرنا ہے۔

ہم قریباً ۴۰ ملکوں میں ایکسپورٹ کرتے ہیں اور کوالٹی پر اعتماد کا عالم یہ ہے کہ ۱/۲ فیصد سے زائد بھی کلیم (Claim) نہیں آتا۔

آج ہمارے خاندان کے دو گروپ معروف کاروباری باعزت نام ہیں، یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔

اس سارے کام کی بنیاد اگر کسی چیز پہ ہے تو وہ ۱۲۰۰ روپے تھے جو میرے دادا نے والد صاحب کو دے کر اندرون سندھ بھیجا۔ جہاں سے انہیں کھالوں کو خریدنا اور کراچی بھجوانا تھا۔ کراچی میں ان کچی کھالوں کو نمک لگایا جاتا۔ اللہ نے ہاتھ پکڑا اور کام بڑھا تو والد صاحب نے ۱۹۵۶ء میں کراچی میں اپنی ٹینری لگائی۔ دو سال خوب کام کیا وہ تختی بھی بڑے تھے۔ دادا کی راہنمائی میں انہوں نے دن رات ایک کر دیا مگر دو سال کے بعد ہی حالات نے ایسا پلٹا کھایا کراچی میں ایک انہونی ہو گئی۔ ۱۹۵۸ء کا سیلاب بہت



بندھائی۔ ہمیں پڑھائی لکھائی پر لگا دیا۔ انہوں نے تعلیم تھی کہ جس رب نے مشکل اور آزمائش دی ہے وہی آسانی کے دن دوبارہ لائے گا۔ وہی رب ہاتھ پکڑے گا اور محنت میں رنگ بھرے گا اور خدا کا کرنا بالکل ایسا ہی ہوا۔ اللہ پر ایمان اگر زندگی کے مشکل دنوں میں یقین نہیں بنتا اور ہمت نہیں دیتا تو ضرور اس میں کمی رہی ہوتی ہے۔

ہمارے دادا مرحوم میاں محمد شفیع بہت کمال آدمی تھے۔

ان کی زندگی کے سیدھے اصول تھے، جن پر انھوں نے عمر بھر عمل کیا۔ وہ اپنے والدین کے بہت خدمت گزار اور تابعدار تھے۔ اللہ نے ان کو بھی خدمت گزار اولاد دی۔ دادا بہت کھلے دل کے مالک تھے، درد دل رکھنے والے، دوسروں کی مدد کرنے والے۔ وہ دوسروں کی مدد کے لیے کسی حد تک چلے جاتے تھے۔

نرمی دادا کی وجہ سے

کراچی میں کاروبار کا نقصان اس قدر زیادہ ہوا کہ میرے والد ذہنی دباؤ کا شکار ہو گئے، ان کے دوست حافظ منظور بہت مخلص آدمی تھے۔ حیدر آباد سندھ کے رہنے والے تھے۔ ان مشکل دنوں میں انھوں نے بہت ہاتھ بٹایا۔ والد کو انھوں نے دو لاکھ روپے قرض دیے۔ یوں اس روپے کی مدد سے ہم نے دوبارہ اپنے کاروبار کو کھڑا کیا۔ ۱۹۵۹ء میں دوبارہ کراچی چلے گئے، بعد میں کاروبار میں نقصان کا صدمہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ میرے دادا بہت ہی Humble اور نرم مزاج تھے۔ میرا ان کے ساتھ بہت وقت گزرا، ان کا ایک اصول تھا جس سے پیسا لینا ہے، اس پر سختی نہ کرو۔ سختی سے مت مانگو، سچ کہوں تو میرے ہی نہیں ہمارے خاندان کے بزرگوں، بھائیوں اور بیٹوں میں جو عاجزی اور نرمی ہے یہ دادا کی وجہ سے ہے۔ دادا چنیوٹی کمیونٹی کے پہلے بیت المال کے بانی بھی تھے۔ اس بیت المال نے ضرورت مندوں کو بہت آسانی دی۔ میرے دادا ۱۹۷۳ء میں فوت ہوئے، ۱۹۴۰ء میں ان کے نام پہ بنے شفیع گروپ کا آج پاکستان کی صنعت اور کاروبار میں نمایاں مقام بھی ہے اور حیثیت بھی۔ ہمارے ہی خاندان کے دوسرے صدیق گروپ کی فلاجی اور کاروباری سرگرمیاں بھی نمایاں اور لائق تحسین ہیں۔ شفیع گروپ کا شفیع ٹرسٹ کراچی میں اور لاہور میں شفیع صدیق ٹرسٹ اپنی بساط پر فلاجی کاموں کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے۔

میرے والد نے ۷۴ء میں بھائیوں کو ملتان بھیجا۔ کراچی سے ملتان آنا بھرے شہر سے صحرا میں آنا ہی تھا۔

بھائیوں کو اچھا نہیں لگا مگر اس فیصلے نے بھی کاروبار میں بہت وسعت دی۔ بھائیوں کے بیٹے الحمد للہ پڑھ لکھ کر اپنے اپنے ادارے چلا رہے ہیں۔

بیوی کا شکر گزار

میرا اپنا بیٹا فہیم جو کیمیکل انجینئر ہے، وہ لاہور میں واقع کیمیکل فیکٹری کو لک آفٹر (Look after) کرتا ہے۔ بیٹا سکولوں کی بھی سرپرستی کرتا ہے۔ اللہ نے بہت اطمینان سے نوازا ہے۔ اس نے اپنی سن کالج سے تعلیم پائی۔ میں کبھی کبھی اس پر چھاپا مارا کرتا تھا مگر گھر اور خاندان کی عزت اور ماں کی تعلیم و تربیت کا بچے کی اٹھان میں بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ میں اپنی بیوی کا شکر گزار ہوں ایک تو وہ مجھ سے بھی زیادہ کھلے ہاتھ کی ہے۔ محیر اور دیندار، اس کے سامنے میں اپنے آپ کو بخیل سمجھتا ہوں۔ اس نے بچے میں بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پہ شفقت کو پروان چڑھایا۔ یہی خوبی میری بھابیوں اور خاندان کے دوسرے عزیزوں اور بزرگوں میں ہے۔

بیٹے کی تربیت

میں نے اپنے بیٹے کی تربیت شروع سے اپنے انداز سے کرنے کی کوشش کی اسے مسجد ساتھ لے کر جاتا، میٹنگز (Meeting) میں وہ ہمراہ ہوتا۔ چھوٹا تھا کبھی بیٹھا رہتا کبھی اٹھ کر گھومنے لگتا۔ میں نے مذہبی طور پر کبھی اس پر پریشر نہیں ڈالا۔ اس کے اپنے دو بچے ہیں۔ بچوں سے بھی اس کا دوستانہ رویہ ہے۔ اس کے بچے میرے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں۔ اپنے بیٹے سے میرا بہت دلی تعلق ہے۔ میں نے کبھی ذکر نہیں کیا مگر جب وہ ملک سے باہر پڑھنے کے لیے گیا ہوا تھا تو میں اکیلے میں روتا رہتا تھا۔ میری بیوی بہت مضبوط اعصاب اور دل کی مالک ہے۔ وہ تسلی دیتی تھی۔ وہاں موٹروے پہ جب وہ سفر کرتا اور بتاتا کہ تین چار سو کلومیٹر کے سفر پر ہوں تو میرا دل بہت پریشان ہوتا تھا۔ اپنے بیٹے کی وجہ سے مجھے اس کے دوست بھی بیٹوں کی

طرح عزیز ہیں۔ میں انھیں کھلانے پلانے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ وہ سارے ہی اچھی جگہوں پر سیٹ ہو گئے ہیں۔ مجھے نہیں یاد میں نے کبھی فہیم کو مارا ہوا یا سختی کی ہو۔ وہ ۷۳ء میں پیدا ہوا، تب سے میری محبت کا مرکز ہے۔ اب اس نے اٹالین کمپنی کے ساتھ جوائنٹ ونچر کیا ہے۔ یہ اس کے لیے ایک نئی شناخت اور کامیابی ہے۔ ہمارے خاندان کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ جب بچہ پڑھ رہا ہوتا ہے تو اس کے لیے سوچ لیا جاتا ہے جب وہ پڑھ کر آتا ہے تو اس کے لیے نیا بزنس تیار ہوتا ہے۔

۶۵ سال سے جڑا ہوا خاندان

آج ۶۵ سال بعد بھی یہ خاندان جڑا ہوا ہے۔ مضبوطی سے سماجی اور کاروباری زندگی میں ہم آہنگ ہے تو یہ اتفاق نہیں ہے۔ اللہ سے محبت اور اس کی رضا کے لیے خیر کا کام ہماری رگوں میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندان کے تمام بچے بڑے اسی سوچ اور عمل پر چل رہا ہے۔ میرے معاملے میں اگر یہ میری والدہ اور والد کی برکت ہے تو اس سے بڑھ کر دادا کو کریڈٹ جاتا ہے۔ انھوں نے ہمیں ذہنی طور پر غریب نہیں ہونے دیا۔ دینے والا ہاتھ بنانے میں اللہ کا ہم سب پر کرم ہے۔

ہمارے اداروں کی پہچان

ہمارے اداروں میں کچھ باتیں بہت اہم ہیں مثلاً ہم

عزت نفس پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ ہمارے رزق میں ہمارے ورکرز کا حصہ ہے۔ اسی لیے ان کی تنخواہوں، ترقی اور سکھنے کے عمل کو مسلسل زندہ رکھتے ہیں۔ ان کے لیے سوچتے ہیں تو اللہ بھی خوش ہوتا ہے اور وہ بھی راضی رہتے ہیں۔ ہم R&D پر بڑا خرچ کرتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ سرمایہ دار اگر اپنے مزدور کی خیر خواہی نہیں کرے گا تو کون کرے گا؟ کل مزدور کے لڑکے رزق کی کمی کی وجہ سے باغی ہو کر ملک و قوم کو نقصان پہنچائیں گے۔ تو کون ذمہ دار ہوگا؟ ان کی ضرورتیں خوش اور خوش دلی سے پوری کرنی چاہیے، ان کے لیے رزق حلال کمانے کے ذرائع بڑھانے چاہئیں۔

ہمارے ہاں کام ۸ گھنٹے نہیں ہوتا

ہمارے تمام اداروں میں مزدور ۸ گھنٹے کام نہیں کرتے۔ ہم ان سے آدھا گھنٹہ کام نہیں لیتے۔ تنخواہ پوری دیتے ہیں۔ ان کے لیے ہر فیکٹری میں استاد رکھے ہوئے ہیں۔ ۳۲، ۳۲ لوگوں کا گروپ ہوتا ہے۔ ۳ استاد ان کو قرآن پاک پڑھاتے ہیں۔ فیکٹری بھی ۸۰۰ مزدور ہیں تو کبھی اس عمل سے گزرتے ہیں۔ ہیڈ آفس کے لوگوں سے بھی کہا اللہ نے بے شک مجھے تمہارا حاکم بنایا ہے اور تمہیں میری رعایا، اس لیے میں اپنے وقت میں سے تمہیں وقت اور استاد دے رہا

ہمارے گھر کا ماحول

ہمارے گھروں کا ماحول ایسا ہے کہ بچے آہستہ آہستہ اس طرف مائل ہوتے ہیں۔ میری بیوی باقاعدہ نقاب پہن کر گاڑی چلاتی ہیں۔ یہ ماحول میں نے نہیں بلکہ میری بیوی نے بنایا ہے۔ میری بیوی نے اپنی نگرانی میں یہ مکان بنوایا۔ ساری نگرانی، رہنمائی اسی نے کی ڈیزائن سے تعمیر تک۔ ۱۹۹۲ء میں ہم یہاں ڈیفنس میں منتقل ہوئے اور ہم سب بھائی جس طرح کراچی میں اکٹھے تھے اسی طرح لاہور میں بھی اکٹھے ہیں۔

ہمارا خاندان جو ہے، ہمارے دادا، ان کے سارے بیٹے، ہم لوگ آگے سارے بچے، اکٹھے رہتے ہیں۔ ہم آپس میں بڑے سلوک اور عمدگی سے رہتے ہیں۔ پیسا تو کوئی چیز نہیں اصل میں اقدار کی بڑی بات ہے۔ یہی خاندان کا نشان اور طرہ امتیاز ہوتی ہیں۔ اللہ نے ہم پر کرم کیا ہے۔

ہوں تاکہ ہماری صرف جسمانی اور مالی ضرورتیں ہی پوری نہ ہو سکیں بلکہ روحانی اور دینی ضرورتیں بھی پوری ہوں۔

ورکر کی تربیت مالکوں پر فرض ہے

اللہ اسی بات کی مجھ سے پوچھ کرے گا تو یقیناً میں سرخرو ہوں گا کہ ہم نے اس معاملے میں کوتاہی نہیں کی۔ لیبر کا معاملہ ہوتا ہے کہ ساری عمر روٹی کے چکر میں رہنے سے وہ بیچارے قرآن، نماز سے رہ جاتے ہیں۔

ہمارے اداروں میں یہ نیکی بڑے بھائی تنویر گلوں کے مشورے اور تجویز سے شروع ہوئی۔ ہم سبھی کی یہ سوچ اور رائے ہے کہ ورکر کی تربیت مالکوں پر فرض ہے۔ ہمارا مزدور دنیا کا بہترین مزدور ہے۔ اس میں نہ کوئی شک ہے نہ دوسری رائے۔ میرا تجربہ بھی یہی کہتا ہے اور میری رائے بھی یہی ہے۔ ہم ان کی ضرورتوں کا احساس نہیں کرتے، ان کی تعلیم اور تربیت نہیں کرتے تو ان سے وہ بہترین نتائج نہیں لے پاتے جو با آسانی لیے جاسکتے ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں دھوکا دینے والوں، غلط بیانی سے کام لے کر آگے نکلنے کی کوشش کرنے والوں یا یوں کہیے کہ انگریزی میں جن کو چیٹرز (Cheaters) کہتے ہیں۔ ان کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھا۔ یہی بات سلیقے، طریقے سے اپنی لیبر کو سیکھا دی جائے۔ ان کا رزق حلال ہو جائے اور معاشی تنگی کا خوف نہ رہے تو وہ دل و جان سے آپ کے لیے کام کریں گے۔

ہمارے ورکر دنیا سے بہتر کیوں؟

جب جب بیرونی دنیا سے وفد آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ آپ کے ورکر ہمارے مزدوروں سے بہت بہتر ہیں۔ جب ہماری فیکٹریوں میں مزدوروں کی پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا تو ہم نے قرآن پاک ختم کرنے والوں کو انعام کے طور پر عمرے پر بھیجنا شروع کیا۔ ان کو باقاعدہ پگڑی پہنائی جاتی جسے دستار بندی کہتے ہیں۔ یہ عزت کی علامت ہوتی ہے۔ ایک ان پڑھ مزدور کو قرآن مل گیا، پڑھنا آ گیا۔ رزق کے ساتھ ساتھ آخرت سنورنے کا

بندوبست ہو گیا وہ خوش کیوں نہیں ہوگا۔ مجھے یاد ہے ایک بوڑھے مزدور نے روتے ہوئے مجھ سے کہا: ”میاں جی! آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں آپ نے قرآن پڑھا دیا۔ نماز پڑھنے ڈال دیا۔ جتنی عمر رہ گئی ہے، ساری عمر دعائیں دوں گا اور کام میں کبھی دھوکا نہیں دوں گا۔“

دیکھیں معاشی طور پر آسودگی کے لحاظ سے میں شاید ملک کے ۳ فیصد لوگوں میں سے ہوں مگر یہ جو دعائیں ملتی ہیں۔ غریب کی دعا تو سیدھی عرش تک جاتی ہے۔ یہی میرا اثاثہ ہے۔ کسی مظلوم کی دعا کسی مستحق کی دعا، جس کو ہماری وجہ سے کوئی آسانی مل جاتی ہے۔

غور کیوں نہیں آیا

میں ذاتی طور پر اللہ سے بہت ڈرنے والوں میں سے ہوں۔ رتی برابر غور نہیں ہے۔ زبان میں سختی نہیں ہے۔ افسر سے ناراض ہو جاؤں تو ہو جاؤں، کسی مزدور سے ناراض نہیں ہوتا۔ میرا رب مجھ سے راضی رہے یہی آرزو ہے۔ اس کی رضا اور خوشنودی کا اگر کوئی اظہار دیکھوں تو یہ اس نے میرا دل تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں کی طرف متوجہ رکھا ہوا ہے۔ میرے کاروبار اتنے سکون سے چل رہے ہیں کہ اللہ کے فضل سے آج تک یہ شکایت سامنے نہیں آئی کہ کسی نے غبن



کہا ہے یاد ہوکا دیا ہے۔ کبھی کسی فیکٹری میں ہڑتال نہیں جاتی۔ لوگ کام کرتے ہیں اور خوشی سے کرتے ہیں۔ محبت کرتے ہیں۔ کیا کروڑوں روپے خرچ کر کے کسی کا دل خریدا جاسکتا ہے۔ ہمارے بڑے خود مزدور تھے، مزدوروں کی طرح صبح ۵ بجے کام پہ جاتے میرے والد اور چچا نے کراچی میں خود اپنے ہاتھوں سے چمڑے چھیلے۔ میں چھوٹا تھا۔ انہوں نے کلاس میں جب لیاری میں سیلاب آیا، ۶ ماہ بہن بھائی تھے اور گھر میں خرچ کے لیے پیسے نہیں تھے۔ آج ہمارے مام ماازم کی تنخواہ ۱۵ سے ۲۰ ہزار ہے۔ آپ دیکھ لیں والدہ نے کیسے سارے گھر کا خرچ چلایا۔ ہم بچے سو جاتے تو وہ پنکھا بند کر دیتیں کہ بجلی کا بل نہ آئے۔ اٹھ جاتے تو پھر چلا دیتیں۔ اس ۱۰ منٹ کی بچت بھولتی نہیں ہے۔

لیڈر سے ہم فنش گڈز میں آئے پھر ٹیکسٹائل میں گئے

پھر کیمیکل کے کارخانے لگائے۔ چاول، گلوکوز، فارما سویٹکل میں گئے۔ اس سے پروٹین بنتا ہے۔ مڑ کو جاتا ہے۔

جوڑنے والی اصل طاقت

میرے گھر اور کارخانے میں اصل طاقت اور جوڑنے والی چیز Values ہیں۔ گھر میں عورتوں کو عزت اور احترام دیا ہے۔ یہ ملے کیا انھوں نے بزنس میں دخل نہیں دینا۔ بڑوں نے جو اصول بنا دیے۔ سب مردوں نے اس پر چلنا ہے۔ ایک نے اعلیٰ درجے کی گاڑی لے لی تو دوسرے کے اندر حسرت نہیں ہوتی کہ میں بھی ویسی لے لوں۔ منع نہیں ہے جب جی چاہے لے لے۔ میں اپنے پر خرچ کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ میری بہو نے گھڑی مانگی ۳ لاکھ کی تھی۔ اس کو لے کر دے دی۔ اپنے لیے نہیں لی۔ پھر بیوی

شفیع گروپ کا شمار پاکستان کے ۱۰ بڑے صنعتی اداروں میں ہوتا ہے۔ اس گروپ کی سربراہی محمد نسیم شفیع کر رہے ہیں۔ مرحوم میاں محمد شفیع نے یہ گروپ اپنے بیٹوں میاں محمد صدیق، میاں محمد حفیظ کے ساتھ مل کر ۱۹۳۰ء میں بنایا تھا۔ اس گروپ کے زیر اہتمام:

محمد شفیع اینڈ کمپنی

صدیق لیڈر ورکس

موقوف لیڈر ورکس

عائشہ سزگار منٹ یونٹ

شفیع پرائیویٹ لمیٹڈ (اسپورٹس آئٹمز)

شفیع ریزو کیمیکل (لیڈر انڈسٹری کے لیے کیمیکل کی تیاری)

شفیع گلوکوکیمیکل (رائس سیرپ اور رائس پروٹین)

ایور فرفیش فارمز (ڈیری پراڈکٹس)

زوہیب جاوید کمپنی

صدیق لیڈر ایکسپورٹ (بٹیلو لیڈر)

محمد شفیع مینریز (گوٹ سکن فنش لیڈر)

سالانہ ۲۲ ملین سکوائر فٹ چمڑا پیدا کر رہی ہے۔ اس کمپنی کا شمار دنیا کی Light Leather بنانے والی بڑی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ گروپ کا سالانہ ٹرن اوور ۳۵۰ ملین ڈالر ہے۔ ہمارے اداروں میں چمڑے کا ریمیل، گارمنٹس کے لیے لیڈر، جوتوں کے اپر کے لیے لیڈر، مختلف اشیاء کے لیے لیڈر تیار ہوتا ہے۔ یہ صدیق لیڈر کے نام سے ۱۹۷۴ء سے کام ہو رہا ہے۔ صدیق گروپ کی برآمدات کا حجم ۶ مارب روپے سالانہ اور شفیع گروپ کی برآمدات کا حجم ۸ مارب روپے کے لگ بھگ ہے۔

کو بھی ۳ لاکھ دے دیے کہ وہ بھی لے لے۔ اس نے گھڑی نہیں لی۔ اللہ کی راہ میں چیرٹی کر دیے۔ پیسے اور چیزوں کے لیے خاندان میں کوئی مقابلہ نہیں۔ اس بات پر جہاں مجھے خوشی اور فخر ہے وہاں حیرت بھی ہوتی ہے کہ ۶۰، ۶۵ سال سے یہ کیسے ممکن ہو رہا ہے؟ میرے چچا مجھ سے ۴ سال بڑے ہیں۔ وہی خاندان کے سربراہ ہیں۔ کبھی دل و جان سے ان کی مانتے ہیں۔

۶ ماہ دفتر نہ جاؤں تو

اگر میں ۶ ماہ دفتر نہ جاؤں تو یقیناً مائیں بزنس کا سارا سلسلہ اتنی خوبی سے چلتا رہے گا۔ میرا بزنس بے شک میری پہلی ترجیح ہے۔ اسی کے لیے سوچتا اور سفر کرتا ہوں۔ اپنے لوگوں کی تربیت کرتا، نظام کھڑا کرتا ہوں اور اس کو سنبھالتا اور بہتر بناتا ہوں۔ شفیع ٹینرز پاکستان ہی میں نہیں دنیا میں بھی معروف ہے۔

جان کوشا، پرتگال میں ہمارا ایجنٹ ہے ۴۰ سال سے۔ میں اسے ملا، باتیں ایسے کرے جیسے خاندانی لوگ کرتے ہیں۔ میں نے اس کی بیوی کو بتایا کہ آج تک اس کو ایک بھی کلیم (Claim) نہیں دیا۔ ایکسپورٹ مارکیٹ میں ہمارا جو نام ہے اس کی وجہ سے ہے۔ انڈیا ٹینرز میں ۲۰۰ سال سے ہے۔ ہم تو صرف ۴۰ سال سے ہیں۔ ۶۰، ۶۵ ملکوں میں ہمارا مال جا رہا ہے۔ یہ سب کو پتا ہے کہ نہ مال میں فرق ہو گا نہ زبان اور معاہدے میں۔ جو وقت دیا ہے اس پر کام ہو جائے گا۔ مارکیٹ میں عزت، کریڈٹ یا ورتھ اسی بات کی تو ہوتی ہے۔ ہم نے طے کیا

تھا کہ کبھی انڈر بینڈ کام نہیں کرنا اس کا فائدہ ہی ہوتا ہے۔

۱۰ کروڑ کی ایل سی

سوڈن میں ایک فیملی تھی جس سے ہم کام کرتے تھے۔ مارکیٹ ایک دم ہائی چلی گئی ہمیں بہت نقصان ہوا۔ اس نے کہا میں قیمت بڑھا دیتا ہوں۔ والد صاحب نے کہا کہ جب قیمت کم ہوگی تو ہم تو کم نہیں کریں گے۔ اسی لیے جو طے تھا وہی ہوگا۔ یہ واقعہ ہمارا مضبوط حوالہ بنا۔

میں نے فرنیچر لیڈر کا کام سیکھا اور اس میں بہت کمایا بزنس کی دنیا میں کام ہوتا ہی Reputation پر ہے۔ سوڈن والوں کے لیے پاکستان کی محمد شفیع ٹینرز ہی معیار اور اعتبار کا نام بن گیا۔ ایک بار ۱۰ کروڑ کی ایل سی آئی تو بینک والے پریشان ہو گئے۔ ان کا کہنا تھا چاہے کوئی مال کی جگہ گند ڈال کر بھیج دے۔ ہمارے ہاں بعض لوگوں نے ایسا کیا بھی اور ملک کو بدنام کیا۔ ناجائز مال بن جاتا ہے مگر ہضم نہیں ہوتا۔ کہیں نہ کہیں سے نکل جاتا ہے میں نے گزشتہ ۴۰ برسوں میں یہی ہوتے دیکھا ہے۔

خرابی کی وجہ اور حل

ملک میں خرابی کی بہت بڑی وجہ ہمارا تعلیمی نظام ہے۔ موجودہ نظام نہ تعلیم دے رہا ہے نہ اہلیت پیدا کر رہا ہے۔ اخلاقی تربیت کا تو نام مت لیں۔ کمانے والی مشینوں میں دین کا شعور تو دور کی بات دین سے تعلق بھی باقی نہیں رہتا۔ جہاں پیسا ہو گا وہ سورج کبھی کے پھول کی طرح اس کے ہو جائیں گے۔

ہم نے اپنے تعلیمی اداروں میں اچھی تعلیم اور تربیت

جیب کی وسعت قدرت بہت سے لوگوں کو عطا کرتی ہے۔ لیکن دل کی وسعت ہر ایک کو نہیں ملتی۔ شیخ صاحب کو یہ وسعت بھی قدرت نے نہایت فراوانی سے دے رکھی ہے۔ کافی عرصہ قبل شان اسلام کے زیر اہتمام چلنے والے اقراء سکول کو ہائی لیول تک ترقی دینے کا وقت آیا تو سکول کے لئے ایک باقاعدہ عمارت کی ضرورت پڑی۔ مسجد کے قریب میاں نعیم احمد کی کوٹھی 9-B/3 تھی۔ ایک برائے نام علامتی کرایہ مقرر کرنے کے بعد سکول کو دے دی گئی۔ جب رجسٹریشن کا مرحلہ آیا تو سرکاری طور پر کہا گیا کہ مسجد کے سکول کی اپنی عمارت ہونا ضروری ہے۔ مسجد کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی، اس میں یہ معاملہ اٹھایا گیا۔ ان کے علم میں آیا تو کہنے لگے کہ آج سے یہ کوٹھی سکول کے لئے مسجد کو وقف کرتا ہوں۔ (راوی۔ عظمت شیخ)

ساتھ ساتھ ماس لٹریسی کا بھی اہتمام کیا ہے۔

اگر انڈسٹری کے لوگ ہم سے رابطہ کریں تو ہم ان کو سہم بنا کر دیں گے۔ جس میں وہ اپنے ورکرز کو تعلیم، ہیلتھ اور اچھا روزگار دے سکیں گے جس سے آجر اور روزدو نوں خوشحال ہوں گے۔

ویشنل سنٹر

ویشنل ویلفیئر سوسائٹی کی ہیومنٹ میں ایک ویشنل سنٹر قائم کیا ہے۔ جہاں مختلف فنی علوم کی تربیت دی جاتی ہے۔ پھر یہاں سیکھ کر بچیاں برسر روزگار ہو جاتی ہیں۔ ایک روز مجھے خیال آیا کہ اس کے لیے ایک انڈومنٹ فنڈ ہونا چاہیے۔ اب ماشاء اللہ ۵۰ لاکھ روپے جمع ہو چکے ہیں جس میں میرا اعلان کردہ کچھ حصہ بھی موجود ہے۔

میرے بھائی تنویر ملکوں کو تعلیم کا بہت شوق ہے۔ ان کے صاحبزادے ابرار نے آفاق کو ایک باکمال ادارہ بنا دیا ہے۔ اس قدر عمدہ سلیبس تیار کیا ہے کہ بہت سے سکولوں نے انٹرنیٹ بند کر کے ان کی کتابیں لے لی ہیں کیونکہ ان میں دُرر ہے ان میں ویلیوز ہیں۔ چنیوٹ میں ہمارا جو سکول ہے، وہاں ایک ہزار بچے ہیں۔ ۴۰ عمارتیں ہیں۔ لڑکیوں کا سیکشن ملکہ ہے اور لڑکوں کا غلغلہ ہے۔ نرسری سے لے کر میٹرک تک۔ یہ اللہ کا احسان ہے، انعام ہے کہ ہمارا کوئی بچہ خاندانی ایلات کے طے شدہ راستے سے ہٹا نہیں ہے۔

سکولوں کا خیال

پہلے ایک مکتب سکول تھا جس میں استاد کبھی آتا اور کبھی نہیں آتا تھا۔ اس سکول میں ایک صاحب مسعود الرحمان تھے جو مسجد میں جھاڑو لگاتے تھے، ہم نے ان سے کہا کہ یہ سکول بند کر دیں لیکن انھوں نے کہا کہ نہیں، ہمارا اچھی چیز شروع ہو چکی ہے اسے بند نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے بہتر بنانا ہے۔ پھر ہم نے کہا کہ اس مسجد کی ہیومنٹ میں سکول بنائیں گے۔ یہ سکول اب بھی موجود ہے۔ میں نے پھر فیصلہ کر لیا کہ جو پیسا آئے گا اسے تعلیم پر لگائیں

سخت لفظ

ڈرائیور نے کہا اتنے برسوں سے ان کے ساتھ وابستہ ہوں۔ غلطی بھی ہوئی اور گاڑی کا حادثہ بھی مگر مجال ہے کبھی سخت لفظ کہے ہوں۔ مجھے پلاٹ ہی لے کر نہیں دیا گھر بھی بنا کر دیا۔ میرے تو جسم کا رواں رواں میاں صاحب کو دعائیں دیتا ہے، انھوں نے میری ماں کو میرے ساتھ رہنے کے لیے گھر کا آسرا دیا۔ فیکٹری یا ہیڈ آفس کے ورکر جب قرآن پاک ختم کر لیتے ہیں تو ان کی خوشی دیکھنے والی ہوتی ہے۔ (سلطان، ڈرائیور)

گے۔ اس طرح اقراء سکول کا سلسلہ شروع ہوا۔

اقراء سکول کا سلسلہ

اسے شروع ہوئے ۲۰ سال ہو چکے ہیں۔ یہ ایک ماس لٹریسی پروگرام تھا جس کا تصور بنگلہ دیش سے لیا گیا۔ اس کے تحت ۲۰۰ سے زائد سکول قائم ہو چکے ہیں انھیں مسجد سکول بھی کہا جاتا ہے۔ ان سکولوں میں ۳ سال میں تعلیمی سیشن مکمل ہوتا ہے۔ ایک کمر، ایک استاد اور ۳۵ طلبہ۔ کتابیں مفت اور فیس کوئی نہیں۔ لاہور کلسٹر میں ۷۰ سکول ہیں، بہاول نگر میں ۱۸ سکول اور چنیوٹ میں ۱۰ سکول ہیں۔ ٹیلی فون، کمپیوٹر اور لائبریری ہر جگہ ہے۔ ایک اقراء سکول پر ماہانہ ۶ ہزار سے زائد خرچ آتے ہیں جو صدیق شفیع ٹرسٹ ادا کرتا ہے۔ محیر دوست بھی اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ اس سے پہلے بنگلہ دیش میں سکولوں کا ایک سلسلہ تھا، جہاں پڑھاتے بھی تھے اور وہاں رقص بھی سکھاتے تھے۔ ہم نے کہا کہ ہمارا سکول اسلامی طرز کا ہوگا۔ ہم اپنے بچوں کو اسلامی پڑھائی کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر لٹریسی کا مضمون بھی پڑھاتے ہیں۔ مزید برآں ایک گاؤں میں ایک ہسپتال بھی قائم کیا گیا ہے،

جہاں آنکھوں کے آپریشن کا اہتمام ہے، زچہ بچہ سفر ہے، اوپی ڈی ہے۔ ہمارے ایک دوست نے چار سہہ میں ڈھائی تین سو گھر بنا کر دیے۔ میں نے ان کے رابطے بیرونی مسلمان انجمنوں کے ساتھ کرائے۔ وہاں سے بھی انھیں عطیات آتے ہیں۔

مسجد شان اسلام میں لٹکا ہوا ڈبا

یہ سچ ہے کہ مسجد شان اسلام میں ایک ڈبا پڑا ہوتا تھا۔ جس میں لوگ اپنی اپنی مشکلات کی درخواستیں ڈال دیتے اور میرا پی اے (PA) انھیں نکال لیتا تھا اور مکمل تفتیش کر کے پھر ان کی پوری عزت نفس کے ساتھ ان

ہوتے ہیں، ان میں باقاعدہ ہمارے اسٹینڈ ہوتے ہیں۔ یہ Fare، اٹلی، پیرس، ہانگ کانگ، سنگھائی میں ہوتے ہیں۔ پہلے میں جاتا تھا، اب میرے بھائی جاتے ہیں یا میرے دوست جاتے ہیں وہ جاتے ہیں۔ ہماری کمپنی کی پراڈکٹس بے حد پسند کی جاتی ہیں۔

چھٹیاں گزارنے کے لیے پسندیدہ جگہ

درحقیقت پاکستان دنیا کا بہترین ملک ہے۔ میں ۱۹۹۸ء کے بعد سے سیر کے لیے باہر نہیں جا رہا۔ اب تو صرف چھٹیاں گزارنے دینی وغیرہ جاتا ہوں۔ باہر کے



ممالک میں سے مجھے سب سے زیادہ پسند ملائیشیا ہے۔ اس کی وجہ اس کا اسلامی کلچر ہے۔ وہاں نماز کا بہت معیار ہے۔ میں نے غیر ممالک کا بہت سفر کیا ہے۔ ماسکو، پورا چین، دیوار چین بھی دیکھی۔ ایک دفعہ ہم نے کھانا کھانا تھا لیکن ہوٹل بند ہو چکا تھا۔ لیکن ہماری آمد پر ہمارے ساتھ موجود چینی ترجمان کے کہنے پر ہوٹل کھلایا اور ہمارے لیے خاص طور پر کھانا تیار کرایا۔ ہر جگہ جو عزت و احترام ملتا ہے، اسے دیکھ کر فخر کا احساس ہوتا ہے مگر عاجزی کا اظہار کرتے ہیں۔

دنیا بھر کے لیڈر رفیق

اب تو برسوں سے یہ ہو گیا کہ دنیا میں جو Fare 252 | urdudigest.pk | جنوری - 2013

خدمتِ خلق پہ آمادہ

ہم انسان گوشت پوست کی کمزوری مخلوق ہیں اور اپنی ضروریات خواہشات میں الجھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہماری پسپاں اور ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم ہر وقت خدمتِ خلق کے موڈ میں نہیں رہ سکتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کے مسئلے کو دیکھ کر انسان چاہتا ہے کہ خود ادھر ادھر ہو جائے یا وہ کسی دوسری طرف نکل جائے۔ کبھی یہ کوشش کرتا ہے کہ ایسے شخص کو کس نہ کسی طرح ٹال دے۔ شیخ نعیم صاحب کی خوبی یہ ہے کہ ان کا موڈ ہر وقت خدمتِ خلق کے لیے آمادہ اور مائل رہتا ہے۔ یوں بھی ہوا کہ میں نے انہیں کوئی ایسا ہی کام کہا مگر اتفاق سے بیرون ملک چلے گئے۔ وہاں سے مجھے فون کر کے بتایا کہ شیخ صاحب..... میں نے اپنے ملازم کو فون کر دیا ہے۔ انشاء اللہ یہ کام ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ ہوا کہ میں نے انہیں کسی کا کوئی کام بتایا۔ کہنے لگے میں آ رہا ہوں۔ چنانچہ آئے اور کام کر کے چلے گئے۔ شام کو کسی نے ان کو لیا کہ شیخ نعیم صاحب کا آپریشن ہوا ہے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا: ”کب؟ صبح تو وہ میرے پاس تھے۔“ جواب دیا: ”ہاں آپ کے ہاں سے نکل کر سیدھے ہسپتال گئے تھے۔“

کئی دوست خدمت کا کام کر رہے ہیں وہ خبر سے خوش نہیں ہوتے بلکہ بہت سے کام پردہ میں رکھتے ہیں کہ کسی کو علم نہ ہو۔ وہ صرف اور صرف خدا کی خوشنودی کے لئے کام کر رہے ہیں۔ لیکن ان میں سے کچھ لوگوں کے اچھے کاموں کا ذکر کرنا اس لئے مناسب لگتا ہے کہ اس سے متاثر ہو کر کسی اور شخص کے دل میں بھی ایسے کام کرنے کا شوق پیدا ہو سکتا ہے۔ (عظمت شیخ --- عکاس حرمین شریفین)

کسی سے ذکر نہ کیجیے

جامع مسجد شان اسلام گلبرگ کے لیے چٹائیوں کی ضرورت پڑی۔ مسجد کمیٹی نے رقم شیخ نعیم صاحب کے سپرد کی اور یاد داری کا کام انھیں سونپا۔ شیخ صاحب نے بازار کے لیے نکلتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے لیا۔ ہم بازار گئے، چٹائیاں نہیں، سچی بات یہ ہے کہ میرے دل کو ذرا نہ بھائیں۔ میں کویت کی مساجد میں قالینی جائے نماز بچھے دیکھتا رہا تھا۔ مجھے یہاں ان قالینی جائے نمازوں کا خیال آ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ ہماری مسجد ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے، یہ چٹائیاں یہاں اچھی نہیں لگیں گی۔ مجھے خاموش پا کر شیخ صاحب بولے کیا بات ہے؟ آپ کو چٹائیاں پسند نہیں آئیں۔ میں نے کہا کہ اصل میں میرا تو دل چاہتا ہے کہ وہاں پر قالین بچھے ہوں لیکن میری جیب اجازت نہیں دیتی۔ اس لیے خاموش رہا۔ کہنے لگے کہاں سے ملیں گے؟ میں نے فیکٹری کا بتایا فوراً تیار ہو گئے کہ چلیں چلتے ہیں..... ہم فیکٹری میں چلے گئے۔ فیکٹری دیکھی، جی خوش ہوا۔ قیمت معلوم کی تو وہ ہمارے پاس موجود رقم سے کم از کم چار پانچ گنا بڑھ کر تھی۔ میں نے کہا: ”یہ ہم نہیں لے سکتے۔“ بولے: ”آپ کو پسند ہیں؟“ میں بولا: ”ہاں پسند تو ہیں.....“ شیخ صاحب گویا ہوئے ”خرید لیں، مگر کسی سے ذکر نہ کیجیے گا.....“ وہ قالین ہم خرید لائے۔ میں نے کسی سے ذکر نہ کیا مگر اس بات کو ذہن و دل سے محو نہ کر سکا۔ شیخ صاحب کا درد مند دل ہر کسی کے بھلے کا آرزو مند رہتا ہے۔ ایک روز کچھ بات ہو رہی تھی۔ اصل میں مجھے بہت سی باتیں وہ پیار ہی میں کر جاتے ہیں۔ انھیں یہ خبر نہیں ہوتی کہ میں فوٹو گرافر ہوں اور ان کی تصویریں لے رہا ہوں۔ ایک روز دوران گفتگو کہنے لگے: ”جس طرح لوگوں کو اپنی فیکٹریوں کا غم ہوتا ہے، اس طرح اپنے ورکرز اور دیگر لوگوں کا خیال بھی ہونا چاہیے۔“ (عظمت شیخ کی کتاب ”دعا دیتا ہوں رہزن کو“)

سب سے بڑی چیز

اس عمر میں اب تو روپے پیسے کی ضرورت نہیں، اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ وہ ہمیں بخش دے۔ یہ سب سے بڑی چیز ہے۔

ایک دور تھا جب ہم پر بہت مشکلات پڑیں لیکن اس وقت بھی ہمارا خاندان اکٹھا اور متحد رہا۔ اگر خوشحالی ہو تب بھی اکٹھے ہیں اور اگر کچھ مسائل آ جائیں تب بھی ہم اکٹھے ہوتے ہیں۔ ہم خوش حال ہیں مگر مصیبت میں صبر کرتے ہیں۔

ہمارے چچا کہتے تھے کہ جب آپ اللہ کی راہ میں دیں تو آپ کو محسوس ہو کہ آپ نے بس دے دیا ہے۔ اس کو نہ گناہ ہے نہ محسوس کرنا ہے۔ ہمارے ہاں سے یتیموں اور بیواؤں کے لیے باقاعدہ وظائف جاتے ہیں۔ اس وقت بہت خوشی ہوتی ہے کہ میں ایسے لوگوں کے کام آ رہا ہوں جو واقعی ضرورت مند ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے ہاں ایک باقاعدہ نظام موجود ہے کہ ہم انکوائری کراتے ہیں۔ بعض اوقات تو پتا چل جاتا ہے کہ لوگ ضرورت مند نہیں۔ ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ صحیح مستحق افراد کی مدد کی جائے۔

۱۹۵۸ء میں جب سیلاب آیا، بارہ گیارہ فٹ پانی چڑھ آیا تو دادا نے متاثرین کے لیے کیمپ بنائے۔ پھر ہم تو چینیوٹ آ گئے۔ والد صاحب کہتے تھے کہ میں ریل گاڑی پر بیٹھ کر آؤں گا۔

تب ہم کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتے تھے کہ

گواہی

گلبرگ ۱۱ میں واقع ایک خوبصورت مسجد ہے، کبھی یہ اس علاقے کی سب سے بڑی مسجد تھی، مسجد کی انتظامی کمیٹی کی صدارت گزشتہ بیس پچیس سال سے شیخ نعیم احمد کے ذمے رہی۔ ہر پانچ سال کے بعد الیکشن ہوتے ہیں ان کی بار بار کی معذرت کے باوجود دوست اس خدمت کے لیے چن لیتے ہیں۔

ہمیں ایسے گھر نصیب ہوں گے۔ ہمارا تو ایک کمرہ تھا جس میں ۶ بھائی اور ایک بہن رہتے تھے۔ اس وقت پاکستان کے جو ٹاپ ٹین صنعتی گروپ ہیں، ان میں ہمارا نام ہے۔ یہ کتنے بڑے شکر کا مقام ہے۔

ایک مسلم بزنس مین میں خوبیاں

سب سے اہم بات یہ ہے جو مال خریدار کو دکھائیں وہی ان کو دیں۔ وقت کی پابندی کریں، حالات کچھ بھی ہو جائیں، معاہدہ پر عمل کریں۔ یہ سارے اصول مسلمانوں کے تھے لیکن اب غیر مسلموں نے یہ اصول اپنا لیے ہیں جس کی وجہ سے یورپ والے کاروباری دنیا میں کامیاب ہیں۔ جن مسلمان کاروباری افراد نے ان اصولوں کو ابھی تک اپنا رکھا ہے، وہ آگے بڑھ رہے ہیں کیونکہ یہ اصول کامیابی کے گرو ہیں۔

آنحضورؐ کی سیرت میں جو سب سے اہم چیز محسوس ہوتی ہے وہ اللہ کی محبت اور رضا ہے۔ پھر لوگوں کے کام آنے کا جذبہ ہے۔ آپؐ جیسا انسان نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ پیدا ہوگا۔ آپؐ معاہدوں کے بڑے پکے تھے زبان کے بڑے سچے تھے۔

میرے معمول

میرے دوست زیادہ تر خاندان کے ہیں۔ خالہ زادہ چچا زاد وغیرہ۔ یہی زیادہ آتے ہیں۔ ۱۱ بجے تک سو جاتا ہوں۔ اس سے پہلے ٹی وی کے اچھے پروگرام، ٹاک شو وغیرہ دیکھتا ہوں۔

اینگلر کا مران خان کا پروگرام دیکھتا ہوں۔ بکریہ ناؤن والے واقعہ کے بعد ٹاک شو کا تاثر اور اعتبار بہت خراب ہوا ہے۔ طلعت (اینگلر) کا پروگرام مجھے بہت اچھا لگا ہے۔ اس پر اعتبار بھی ہے۔ صبح اٹھ کر پہلا معمول یہ ہوتا ہے کہ موقع مل جائے تو نماز پڑھ لی۔ بھائیوں کے پاس گئے، واپسی پر ناشتہ کیا۔ ۱۰ بجے فیکٹری جانے کی تیاری کی۔ کبھی مغرب کی نماز پڑھ لی یا گھر آ کر پڑھی۔

ایک مقابلہ صرف نوجوانوں کے لیے

بوجھیں توجہ جانیں

بلیٹنٹ کرٹ (ر) میجر احمد (دوالیال، چکوال) (جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ سے ۲۸ سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ دسمبر میں دیے گئے اسلامی کونز کے صحیح جوابات

کونز نمبر ۱ (الف) حضرت علی بن حسینؑ (ب) سید الساجدین، زین العابدین کونز نمبر ۲ (الف) ابوسفیانؑ (ب) ہرقل

درست جوابات دینے والوں کے نام

جویریہ شیر نواز (پشاور)، محمد احمد (کراچی)، مرزا فرحال بیگ (حیدر آباد)، آصف کریم (حیدر آباد)، طہ حسین (حیدر آباد)، مدثرہ خلیل (دینہ)، محمد حسان ضیاء (سیالکوٹ)، صالح بشیر بخاری (یو۔ کے)، پاپوس احمد (سیالکوٹ)، مصباح العین بنی رشید اعوان (گوجرانوالہ)، عرفان عثمانی (لاہور)، ذوالفقار شاہ، الفت حسین (شیخوپورہ)، عاطف ممتاز (چکوال)، حافظ محمد باقر (سرگودھا)، عبدالسلیم (حیدر آباد)، مرزا مسرت بیگ (حیدر آباد)، گوہر رحمن (ڈیرہ اسماعیل خان)، انشراح رحمان عقیل (کراچی)، محمد یونس جاوید (قصور)، مصطفی الرحمن (ہزارہ)، محمد فکیل عباس جنجوعہ (سرگودھا)، محمد عمیر مغل (لاہور)، وقاص احمد (لاہور)، سید انس ارشد (ننڈو محمد خان)، سید زید ارشد (ننڈو محمد خان)، سید محمد اسد مدنی (اسلام آباد)، منورہ واحد (ہری پور)، شہر بانو (میانوالی)، محمد یاسین رندوری (حیدر آباد)، محمد بلال مقصود (لاہور)، فرح بتول (خوشاب)، محمد احمد خان (بھکر)، عبدالغفار راجپوت (رحیم یار خان)، محمد اسعد خان (بھکر)، محمد بن نعیم (بھکر)، فہما احمد بنت ضیاء الدین احمد (ہری پور ہزارہ)، محمد فاروق عثمان خان (بھکر)، محمد احمد خان (بھکر)، محمد فیضان فرید (لاہور)، ڈاکٹر مسابینہ حیات (ننڈو محمد خان)، راؤ انیس العظیم عظمیٰ (نیاری، سندھ)، عائشہ حبیب بنت حبیب الرحمن فریدی (لاہور)

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

گوہر رحمن (ڈیرہ اسماعیل خان)، ۲۔ پاپوس احمد (سیالکوٹ)، ۳۔ حمزہ گلگتی (کراچی)، ۴۔ فرح بتول (خوشاب)

اسلامی کونز ۱

آنحضرتؐ کے جاں نثار صحابی، قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کے چچرے بھائی تھے۔ ہجرت سے قبل مشرف بہ اسلام ہوئے۔ جنگ احد میں آنحضورؐ کی شمشیران کے سپرد ہوئی اور انھوں نے بہادری کے جوہر دکھائے۔ جب لشکر اسلام مسلمہ کذاب سے تہر دارنما ہوا اور وہ باغ میں گھس گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ انہی کو باغ کے اندر پھینکا گیا گو کہ ان کا پاؤں ٹوٹ گیا مگر انھوں نے دروازہ کھول دیا اور اسلامی فوج باغ میں داخل ہو گئی۔

(۱)۔ کس صحابی کا ذکر ہے نام بتائیں؟ (۲)۔ وہ کون سی لڑائی میں شہید ہوئے؟

اسلامی کونز ۲

نعمت کریمؑ کے صحابی، قبول اسلام سے قبل ان کا نام جندب بن جنادہ بیان کیا جاتا ہے۔ انھیں جب حضرت محمدؐ کی بعثت کی خبر ملی تو مکہ کے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ غزوہ خندق تک آپؐ اپنے قبیلہ میں رہے۔ اس کے بعد مدینہ چلے آئے اور سوائے غزوہ جہاد کے کسی جنگ میں شرکت نہیں کیا۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں آپؐ شام میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں آپؐ کو امراء کا طرز زندگی پسند نہ آیا۔ آپؐ کی تنقید سے انھوں نے بھی نہ بچ سکے۔ حضرت عثمانؓ کو اس امر کی اطلاع ملی تو انھوں نے آپؐ کو مدینہ واپس بلا لیا اور یہیں پر ہی آپؐ کا انتقال ہوا۔

(۱)۔ اس صحابی کا اسلام قبول کرنے کے بعد کا نام بتائیں؟ (۲)۔ انھوں نے کس شہر میں وفات پائی؟

العامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

۴۰۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور

آپ کے جوابات ہمیں ۱۵ تاریخ تک مل جانے چاہئیں

مدیر اردو ڈائجسٹ

325۔ جی ۱۱، جوہر ٹاؤن لاہور

یارانِ وطن دیارِ غیر میں

(مصروفیات-مشاغل-کارنامے)

ماہ نور فیصل

پاکستانی ہیں۔ یہی ہے ہماری پہلی اور آخری پہچان دنیا کے سامنے۔ چاہے ہم دنیا کے بہت بڑے ادیب، کھلاڑی، بزنس مین، آرٹسٹ یا سیاست دان کیوں نہ ہوں، ہر پہچان سے پہلے ہماری بنیادی پہچان ایک پاکستانی کی ہوتی ہے۔ ہم ۳۰ سال، سے زیادہ بھی کیوں نہ انگلیٹڈ یا امریکا میں مقیم ہوں، گھر خاندان، بزنس زندگی وہیں کی چیزوں سے کیوں نہ جڑی ہوں پھر بھی جب ہم کوئی خبر بناتے ہیں تو ہمارے نام سے پہلے لکھا جاتا ہے ”پاکستان سے تعلق رکھنے والے امریکا میں مقیم“، یعنی ہم کچھ بھی بن جائیں، ہم سب سے پہلے پاکستانی ہیں اور رہیں گے۔ ہمیں فخر ہے اپنے پاکستانی ہونے پر کیونکہ پاکستانی باصلاحیت قوم ہے اور یہ ہم ان گنت بار ثابت کر چکے ہیں۔

بنارکھا ہے، ایک آسان سے مسئلے کا حل آج تک نہ کوئی امریکی سوچ سکا نہ کوئی پروڈیسی، شاباش احمد خٹک۔ سید جاوید حسن صاحب سے ملیں، آپ آج کل سنگاپور میں سفیر پاکستان ہیں۔ اس سے پہلے دس سال

آئیے سب سے پہلے ایک پاکستانی نوجوان احمد خٹک سے ملاقات کرتے ہیں جس نے کولمبس کی طرح براعظم امریکہ پر قدم رکھا اور وہاں مقیم لوگوں کی کمزوری پکڑ لی، اُس نے جان لیا کہ ایک سادہ سے کام کو امریکیوں نے بلاوجہ پیچیدہ



پاجی! مجھے ڈینگلی چھتر نہ سمجھنا۔
میں ڈنگ نہیں مارتا کاٹ کر دکھاتا ہوں



لے آشاباش!
جو تھوڑی جان بچ گئی ہے
وہ میں نکالتا ہوں۔



تو بین عدالت کیس! الطاف حسین کو عدالت نے ۷ جنوری ۲۰۱۳ کو طلب کر



عمران سہیل بونی کی
سکراتی
لکیریں





میں ایک تھی موبائل فون سروس حاصل کرنا۔ امریکا میں ہر شخص کا ایک آئی ڈی نمبر ہوتا ہے جسے سوشل سیکورٹی نمبر کہا جاتا ہے، جس سے اس شخص کی زندگی کی ہر فائنل ہسٹری جڑی ہوتی ہے۔ کہیں بھی آپ گاڑی، گھر یا کسی بھی طرح کا قرضہ (loan) لینے جائیں تو لینڈ (Lender) فوراً آپ کی کریڈٹ ہسٹری نکال کر تصدیق کرتا ہے کہ اس شخص کی قسط کی ادائی کی کتنی استعداد ہے اور اسے کتنا کریڈٹ دینا چاہیے۔ کریڈٹ ہسٹری امریکا میں موجود تمام پوسٹ موبائل کمپنیاں بھی چیک کرتی ہیں یہی احمد کا مسئلہ تھا کیونکہ وہ امریکا میں نیا تھا اور اس کا اسٹیٹس ”اسٹوڈنٹ“ تھا۔ احمد کے پاس سوشل سیکورٹی نمبر اور نہ ہی کوئی کریڈٹ ہسٹری تھی۔ احمد اپنے گھر والوں کو پاکستان فون کرنے کے لیے موبائل سروس لینا چاہتا تھا لیکن وہ حیران رہ گیا جب اسے معلوم ہوا کہ امریکا جیسے ترقی یافتہ ملک میں کوئی بھی اسے موبائل سروس نہیں فراہم کرے گا کیونکہ اس کی کوئی کریڈٹ ہسٹری نہیں ہے، احمد نے کئی موبائل کمپنیوں سے رابطہ کیا لیکن اسے کوئی مثبت جواب نہیں ملا۔ بالآخر احمد کے روم میٹ نے Co-sign کر کے اسے موبائل سروس دلوادی۔ لیکن کالج میں رہتے احمد کو تمام عرصے یہ بات سناتی رہی کہ امریکا میں ان لوگوں کے لیے موبائل سروس کیوں نہیں جن کے پاس کریڈٹ نہیں۔ کوئی بھی لڑکا ہوتا تو وہ موبائل سروس مل جانے کے کچھ عرصے بعد یہ بات بھول جاتا لیکن پاکستانیوں کی ایک خاص بات ہے ان کے اندر کا نیچرل بزنس مائنڈ۔ یہی پاکستانی خصوصیات احمد خٹک میں بھی تھیں۔ ۲۰۰۷ء میں انٹرن شپ کر کے احمد لندن گیا، جہاں اسے لندن ایئر پورٹ پر ہی ایک کمپنی بنانے کا خیال آیا۔ اس نے ایئر پورٹ کی وینڈنگ مشین سے ۱۵ پاؤنڈ کا ایک سیم کارڈ خریدا، اپنے ان لاک فون سے اسے استعمال کر کے وہ انٹرنیشنل اور لوکل کالز بھی کافی سستی کر سکتا تھا۔ امریکا میں فون کیریئر لاکڈ ہوتے ہیں یعنی اگر آپ Verizon سے آئی فون خریدتے ہیں تو وہ صرف اسی کے نیٹ ورک پر استعمال کر سکتا ہے بغیر Verizon کی سروس کے بغیر وہ فون بے کار ہے۔ احمد کو امریکا میں ایسی کمپنی بنانے

آپ چین میں رہے۔ آپ نے وقت کو پردیس میں ضائع کرنے کے بجائے چینی زبان سیکھنے کے لیے اپنا آرام قربان کر دیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا، چینی زبان سیکھنے کے خواہش مند اہل وطن کے لیے ایک کتاب بھی تحریر کی۔ رضیہ سلطانہ صاحبہ جو خدمتِ خلق کو انسانیت کی بنیاد سمجھتی ہیں، اہل مغرب کا دلچسپ قصہ سن رہی ہیں کہ وہ مدد کرنے سے پہلے آدمی کی ذات اور رنگ پوچھتے ہیں۔ یہ مضمون ان لوگوں کی آنکھیں یقیناً کھولے گا جو مغرب کو جنتِ ارضی قرار دیتے ہیں۔

پھر آپ پڑھیں گے ہادیہ تاجک کے بارے میں چند سطور جو ناروے میں وزیرِ ثقافت مقرر ہوئی ہیں اور آخر میں ہم امریکا میں مقیم پاکستانی انجینئروں کے بارے میں بتائیں گے جنہوں نے حب الوطنی کا ایک زبردست مظاہرہ کیا ہے۔

☆☆☆☆

☆ احمد خٹک: ۵۰ ملین ڈالر تک اس کا بزنس پہنچ چکا ہے احمد خٹک ۲۶ سالہ پاکستانی نوجوان ہے۔ ہر لڑکے کی طرح اس کو بھی اسپورٹس کا شوق تھا۔ احمد اسکاوش بہت اچھا کھیلتا ہے اور اسی بنا پر احمد کو ۲۰۰۴ء میں امریکا کی Yab University سے فل اسکا لرشپ ملی۔ ہرنے آنے والے کی طرح احمد کو بھی امریکا مختلف لگا پاکستان سے! رہن سہن نیا، طور طریقے نئے، امریکا کے ان نئے انداز سیکھنے کی مشکلات



(وجاہت علی عباسی)

☆☆☆☆

☆ سید جاوید حسن نے چینی زبان کی اہمیت سمجھی، زبان سیکھی اور اہل وطن کے لیے کتاب تحریر کی۔ بات یہاں سے شروع کرتے ہیں، چین میں ہونے والی اقتصادی اور سماجی ترقی دنیا بھر کی توجہ کا مرکز ہے۔ مستقبل پر نظر رکھنے والے ممالک چین میں اپنی لابیوں مضبوط بنا رہے ہیں۔ دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ ہمیں حکومت اور نجی دونوں سطحوں پر اس حوالے سے

ایک حکمت عملی تیار کرنی چاہیے۔ چین میں پاکستانی افرادی قوت کے لیے روزگار اور کاروبار کے وسیع مواقع موجود ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ پاکستانی قوم چینی زبان سیکھنے کا اہتمام کرے۔ زبان کے اس بیرئیر (barrier) کی وجہ سے پاکستانیوں کی اکثریت چین کی نسبت یورپی ممالک کا رخ کرتی ہے۔ اگر ہمارے ہائی سکولز اور کالجز میں چینی زبانوں کو پڑھانے کا اہتمام ہو اور اسے پڑھنے کی ترغیب بھی دی جائے تو پاکستان اور چین کے درمیان ان مٹ روابط قائم ہو سکتے ہیں۔ ایک تجزیے کے مطابق ایسے افراد جن کی تعلیم اچھی ہوگی اور وہ چینی زبان سے بھی شناسا ہوں گے۔ انہیں مستقبل قریب میں چین کی immigration بھی مل جائے گی۔ اسی طرح ہمیں چین کی یونیورسٹیوں اور کالجز میں اپنے طالب علموں کو پڑھنے کے لیے بھی بھیجنا چاہیے۔ چینی زبان کو سیکھنا آسان کام نہیں، چینی زبان کے حروف، رسم الخط اور لب و لہجہ ہم سے بہت مختلف ہے۔ اس زبان کو سیکھنے کے لیے یا تو خاص عرصے تک چینی عوام میں رہ کر اسے بتدریج سیکھا جاسکتا ہے یا پھر چینی زبان کا لینگویج کورس کر کے اسے بولنا اور لکھنا آسکتا ہے۔ پاکستان میں بھی کچھ ادارے چینی زبان سیکھانے کے کورس کراتے ہیں جن میں اسلام آباد میں قائم نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجس سب سے نمایاں ہے۔

سید جاوید حسن پاک چین دوستی کی ایک نمایاں علامت

تصور کیے جاتے ہیں۔ جاوید صاحب فارن سروس میں ہیں، وہ دس سال تک چین میں تعینات رہے جہاں انہوں نے چینی زبان کو سیکھا، سمجھا اور اب اس کی ترویج میں سرگرم ہیں۔ وہ آج کل سنگاپور میں پاکستانی سفیر کے طور پر متعین ہیں۔ وہ اپنے وقت کو ضائع نہیں کرتے۔ چینی زبان سیکھنے کے لیے انہوں نے بہت محنت کی اور بہت وقت دیا۔ پھر ان کو خیال آیا کہ اپنے اہل وطن کے لیے ایک کتاب لکھی جائے جس پر انہوں نے دو سال بھر پور محنت کی۔

سید جاوید حسن صاحب کی کتاب پاکستان میں شائع ہوئی ہے، اور اس کا نام "Chinese Made Easy" ہے۔ اس کتاب میں سفیر موصوف نے آسان فہم انداز میں چینی زبان سیکھنے کے لیے ایک سوا سبق ترتیب دیے ہیں۔ یہ اسباق چینی، انگریزی اور اردو زبان میں ہیں۔ فی الحقیقت یہ کتاب Self Help Kit Book ہے۔

(سرور منیر راول)

☆☆☆☆☆

☆ رضیہ سلطانہ دیارِ مغرب کی اصلی تصویر دکھا رہی ہیں ہم دیارِ مغرب کو جنت سمجھے بیٹھے ہیں، آپ کو اس جنت کی حقیقت رضیہ سلطانہ صاحبہ بتا رہی ہیں۔

دریا کے شمالی کنارے کام کرتے ہوئے آج پہلی بار میں نے سٹی بزنس ڈسٹرکٹ کی طرف پیدل جانے کا فیصلہ کیا۔ افق پر شہر کی بلند ترین عمارتوں کا مرعوب کر دینے والا منظر ہے جو مغرب کے جدید کارپوریٹ کلچر کی عکاس ہیں۔ رات کے وقت ان عمارتوں کے عکس دریا کے گہرے نیلگوں پانی میں لرزتے رہتے ہیں۔ موسمِ بہار کی آمد پر، شام کی چہل قدمی میں ملحقہ رہائشی علاقے سے گزرتے ہوئے، سڑک کے دونوں جانب خود رو پھول فرحت کا بے کراں احساسِ جنم دیتے ہیں۔ چہل قدمی سے میں بہت محفوظ ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی پیشکش سستی آڑے آجاتی ہے۔ ساتھیوں کی پیشکش میں قبول کر لیتی ہوں اور واپسی کا سفر گاڑی میں طے ہوتا ہے۔

شاندار رہائش گاہیں اور ہر شعبے کی مشاورتی کمپنیوں کے دفاتر جدید فن تعمیر کے شاہکار ہیں۔ ان کے سائے میں

پیدل چلتے ہوئے میں نے اسٹیشن جانے کے لیے ایک خوبصورت اور پرسکون سڑک کا انتخاب کیا۔ ابھی آدھا راستہ طے کیا ہوگا کہ مخالف سمت سے ایک شخص کو آتے دیکھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ چند لمحوں کے بعد مجھے لگا کہ کوئی چیز اسے آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔ کیا اس کی ٹانگوں پر فانی کا حملہ ہو رہا ہے؟ میں نے سوچا، ہو سکتا ہے اس نے پیار کی ہو۔ ابھی میں یہ گتھی سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ شخص قریب آ پہنچا۔ ارفٹ کے فاصلے سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ بوڑھا تھا نہ جوان، ایک ادھیڑ عمر آدمی۔ نشے میں نہیں تھا۔ غالباً وہ بخار میں مبتلا تھا۔ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ کھلی سڑک پر، ایک بے پناہ ہجوم کے درمیان وہ ایک کرب ناک صورت حال سے دوچار تھا۔

پیدل چلنے والوں کے لیے اشارے کی بتی سبز ہونے کا انتظار کرتے ہوئے میں نے سوچا، اس آدمی کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ مزید چل پائے گا؟ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا میں صحیح سمت میں چل رہی ہوں، میں نے اوپر دیکھا اور اس سے پہلے کہ میں اس کی طرف مڑتی، اجنبی کا سر بائیں طرف ایک دیوار سے ٹکرایا، اور وہ گر پڑا۔ میں نے دوبار اس کے چہرے کی آواز سنی۔ اب وہ بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے گھبراہٹ میں ارد گرد دیکھا تاکہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکوں، وہاں کوئی نہ تھا۔ بس ٹریفک سگنلز کے آر پار، سڑک پر رواں دواں گاڑیوں کی لمبی قطاریں تھیں، جہاں پیدل چلنے والوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فون کروں؟ ہاں، کسی کو فون کرتی ہوں، مگر کس کو؟ پولیس، ایمبولنس..... ایمر جنسی..... کس کو؟ میں نے اپنا موبائل جیب سے نکالا اور پولیس ایمر جنسی کو فون ملا یا۔ ایک خاتون پولیس افسر کی آواز ابھری۔ میں نے صورت حال بتائی اور مدد کی درخواست کی۔ اس نے مجھے ہولڈ کر لیا اور پھر کسی اور کو ملا دیا۔ ایک اور خاتون پولیس افسر نے مجھ اس مقام کے متعلق پوچھا، جہاں سے میں بول رہی تھی۔ پھر فوراً ہی سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔

”متاثرہ آدمی کی عمر کیا ہے؟“
”میرا خیال ہے ۴۵ سے ۵۰ کے درمیان ہوگی۔“
”۴۵ یا ۵۰؟“

”شاید پچاس، ٹھیک ٹھیک میں کیسے بتا سکتی ہوں؟“
”کس رخ پر گرا ہے؟“
”سر کے بل زمین پر“

”اس کا سارا جسم زمین پر ہے یا صرف سر؟“
”صرف اس کا سر“

”کیا وہ سانس لے رہا ہے؟“
”یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔“

”کیا اس کے جسم سے خون بہہ رہا ہے؟“
”کہہ نہیں سکتی، وہ اوندھے منہ گرا ہے، چہرہ دکھائی

نہیں دیتا۔“

”وہ کس نسل سے تعلق رکھتا ہے؟“
”سوری، کیا کہا آپ نے؟“

”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کس نسلی گروہ سے تعلق رکھتا ہے؟ اس کا رنگ کالا ہے یا گورا؟“

غم و غصے کی ملی جلی کیفیت میں، میں نے کہا ”معاف کیجیے، شاید آپ کو سمجھ نہیں آرہی کہ میں نے کس لیے آپ کو فون کیا ہے اور اس کے جواب میں آپ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں؟ ہم ایک زخمی کے بارے میں بات کر رہے تھے جسے فوراً امداد کی ضرورت ہے۔“

”سوری، لیکن ہمیں یہ سب سوال پوچھنے ہوتے ہیں، یہ ہماری پالیسی ہے۔“ خاتون افسر نے کہا۔

”شام گہری ہوگئی ہے اور میں آپ کو اس کا رنگ نہیں بتا سکتی، میں اس کی نسلی وابستگی نہیں جانتی، میں کیسے آپ کو بتاؤں؟“

”اوکے، جتنی جلدی ممکن ہوا، ہم بندوبست کرتے ہیں۔“ نسلی تعلق؟ جب کوئی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہو تو نسلی تعلق کا کیا سوال؟ کیا یہ کافی نہیں کہ انسان کو زندگی

بچانے کے لیے مدد کی ضرورت ہے۔ حیرت سے میں نے سوچا: کیا یہ وہی مغرب ہے جہاں آزادی اور انصاف کی عکرائی ہے۔ خاتون افسر لیکن یہ فرماتی ہیں کہ یہ استفسار

پالیسی کا حصہ ہے۔ مجھے اچانک ایک خیال آیا، اگر میں اس شخص کی جگہ ہوتی، کوئی راگبیر مدد کے لیے ایمر جنسی پولیس کو فون کرتا۔ اس سے میری نسلی وابستگی کے بارے میں پوچھا جاتا تو وہ کیا جواب دیتا۔ ایشیائی؟ اگر ان کے لیے ایمر جنسی کی سہولت نہ ہو تو پھر کیا ہوگا؟ میرا دل ڈوب رہا تھا۔ میں نے آسمان کی جانب دیکھا اور سوچا، اگر میرا اللہ مجھے تنہا چھوڑ دے تو کیسی بے بسی ہو۔ مساوات اور انصاف کہاں ہے؟ وہ سب اصول کہاں گئے جو تہذیب یافتہ قومیں زمین کے دوسرے سرے پر ہمیں سمجھانے آتی ہیں۔ یادوں کا سلسلہ وہاں جا پہنچا، جہاں ایک مقامی سکول کے آخری سال میں نے طالب علمی کے دن بیتائے تھے۔ اچھی شہرت رکھنے والی تمام کمپنیوں کی شرط یہ تھی کہ صرف مقامی شہری اور مستقل رہائش رکھنے والے ہی ملازمت کی درخواست دے سکتے ہیں۔ کوئی غیر مستقل رہائشی طالب علم ہرگز نہیں۔

کیا یہ لوگ غیر ملکی ذہانت سے خوف زدہ ہیں؟ میں نے اپنے استاد سے پوچھا، غیر ملکی طلبا کیوں نہیں۔ انہوں نے جواب دیا: یہ قومی پالیسی ہے اور اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں بتا سکتے کیونکہ وہ سرکاری ملازم ہیں۔ مجھے دھچکا لگا۔ عام خیال یہ ہے کہ اعلیٰ مغربی معاشرے نسلی، ثقافتی، جنسی اور مذہبی عصبیتوں سے پاک ہیں۔ مغربی ممالک تیسری دنیا کے غریب، گنوار اور غیر متوازن معاشروں کو تعلیم دینے آتے ہیں کہ اقلیتوں، عورتوں اور چھوٹے نسلی گروہوں سے حسن سلوک چاہیے۔ دنیا پر مغرب کی حکمرانی ہے، دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے کیا اسے اپنا گھر درست نہ کرنا چاہیے؟ کیا ان لوگوں نے آدمی کو پتھر کے زمانے میں واپس نہیں دھکیل دیا؟

پولیس کار کا سائرن سنائی دیا اور اس کے پیچھے ایمبولنس تھی۔ تارکی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تھکاوٹ اب بہت تھی میں نے اپنے ذہن کی کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی اور بھاگ کر بس کو جا پکڑا۔

(رضیہ سلطانہ)

☆☆☆☆☆

مشورہ حاضرہ

اُردو ڈائجسٹ
کا مقبول سلسلہ



آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے
مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

صغیرہ بانو شیریں

سگریٹ

گزشتہ دنوں ایک محترم دفتر میں تشریف لائے۔ پرانا ڈائجسٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔ سگریٹ اور نشہ چھڑانے کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ نیند نہ آنے کی شکایت اور دوسرے عوارض بھی لاحق ہیں جو بڑھاپے میں عموماً پیش آتے ہیں۔ میرے ذہن میں اس وقت درود شریف کا خیال آیا مگر مجھے سورہ الاحزاب کی آیت ۵۶ کا دھیان تھا۔ بتایا کہ ”ان اللہ سے لے کر تسلیم“ تک رات کو پڑھتے ہوئے سو جائیں۔ درود شریف کی فضیلت سے شفاء ہوتی ہے۔ قوت ارادی کو بروئے کار لاتے ہوئے سگریٹ چھوڑ دیے۔ اللہ ان کو استقامت دے۔ ان کو ڈاکٹر کا فون نمبر بھی دے دیا تھا اور وہ ان سے مل کر دوا بھی لے گئے۔

جسم پر خارش

س: میرا بیٹا ماشاء اللہ صحت مند اور ۲۰ سال کا ہے۔ مگر سردی کے موسم کی شروعات میں جیسے ہی دھوپ میں نکلتا ہے، جسم میں سونیاں چھبنی شروع ہو جاتی ہیں اور پھر مارچ تک یہی مسئلہ رہتا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گی؟
ج: سردی کے ساتھ ساتھ نکالیف کا آغاز ہوتا ہے جو موسم بدلنے پر خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ حکیم لوگ اسے فساد خون کہتے ہیں، کچھ اسے جگر کا مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ بہر حال یہ بھی ایک تکلیف دہ مسئلہ ہے۔ اب اسے الرجی کہا جاتا ہے۔ آپ کا جوانی لفافہ میرے پاس ہے، میں آپ کو خط لکھوں گی۔
میتھی دانہ ہوتا ہے جس کو ہم اچار میں استعمال کرتے ہیں۔ پنجابی میں اسے میتھرے کہتے ہیں۔ میتھی دانے

ایک پاکستانی نژاد خاتون ناروے میں وزیر ثقافت مقرر ہوئی ہے۔ پاکستانی جہاں بھی ہیں اپنی قابلیت اور صلاحیت کی وجہ سے نظروں میں آ جاتے ہیں۔ ناروے کے



وزیر اعظم اسٹولٹن برگ نے پاکستانی نژاد ہادیہ تاجک کو وزیر ثقافت مقرر کر دیا ہے، جن کی عمر ۲۹ سال ہے اور وہ کابینہ کی سب سے کم عمر خاتون وزیر ہوں گی۔ ناروے کے وزیر اعظم نے اپنی لیبر پارٹی کی قسمت جگانے کے لیے اپنی کابینہ تبدیل کر دی ہے۔ انہوں نے خارجہ، دفاع، صحت اور ثقافت کے وزراء تبدیل کر دیئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

امریکا میں مقیم پاکستانی انجینئرز نے جب الوطنی کا مظاہرہ کیا ہے۔ انہوں نے پاکستان میں زیر تعلیم انجینئرنگ کے ضرورت مند اور ذہین طلبہ کے لیے اسکالرز شپ اور انجینئرنگ کی جدید کتب اور ٹیکنالوجی کے لیے ایک مستقل فنڈ قائم کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبہ کو امریکا اور غیر ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں بھی تعاون کیا جائے گا۔

یہ اعلان این ای ڈی انجینئرنگ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل گریجویٹس کی المنائی ایسوسی ایشن کے کنونشن میں کیا گیا۔ امریکا و کینیڈا میں ۲۲ سال قبل قائم ہونے والی این ای ڈی المنائی ایسوسی ایشن کے اعداد و شمار کے مطابق پانچ ہزار سے زائد این ای ڈی کے گریجویٹ انجینئرز امریکا میں آباد ہیں اور ان کی اوسطاً فی انجینئر ایک لاکھ ڈالر سالانہ آمدنی ہے، ابھی تک یہ انجینئر چھوٹے گروپوں کی شکل میں اپنی مادر درسگاہ میں تعلیم اور ترقی کے لیے وظائف، جدید کتب اور دیگر طریقوں سے تعاون کرتے رہے ہیں لیکن اب شمالی امریکہ میں المنائی تنظیم کے ذریعے این ای ڈی یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے وظائف اور دیگر سہولتوں کے مستقل انتظامات کریں گے۔



کی کھجوری سردی کو کم کرتی ہے۔ ڈھیر سارا اصلی گھی لے کر پیاز کا بگھار کیا جاتا ہے اور اسے صبح ناشتہ میں لیجے ہیں۔ سردی کے موسم میں آدھا چائے کا چھچھہ صاف کی ہوئی میتھی دانے کی خوراک کھانے سے سردی کے موسم اور تکالیف میں افادہ ہوتا ہے۔ میتھی دانہ منگوائیے، اسے اچھی طرح صاف کریں ہاون دستہ میں موٹا موٹا کوٹ کر بوتل میں بھر لیجئے، تقریباً چھ ۷ گرام کا اندازہ کر لیجئے۔ ایک بڑا کپ پانی لے کر اس میں ڈال کر پکائیے۔ میتھی دانے کی چائے بن جائے گی، صبح شام پینے سے فرق پڑتا ہے۔ ۳ ہفتہ چائے پینی پڑتی ہے۔ اسے آپ چھان کر تھوڑا سا شہد بھی ملا سکتی ہیں۔

عناں کے دانے اچھے ہوتے ہیں۔ چار پانچ عناب توڑ کر رات کو بھگو کر صبح چھان کر پانی پی سکتے ہیں۔

شوگر ٹھیک ہوگئی

س: ہمارے محترم قاری منصور احمد صادق آباد سے لکھتے ہیں: آپ نے مجھے شوگر کے متعلق مشورہ دیا تھا کہ دارچینی توڑے پر بھون کر پیس لیں اور کھائیں۔ میں نے تقریباً آدھی پیمانی کھائی۔ میری شوگر الحمد للہ اب ٹھیک ہے۔ اب مجھے کدو کے بیج کا بتائیے، کون سا کدو ہے؟ میں پروٹیٹ کے لیے کھانا چاہ رہا ہوں۔

ج: یہ بیج پیٹھا کدو کے ہوتے ہیں۔ چھیل کر مٹھی میں جتنے آئیں کھا لیتے ہیں۔ یہ مکمل علاج نہیں مگر فائدہ مند ہے۔ محترم حکیم محمد سعید شہید کے مطب میں بھی پراسٹیٹ کے لیے جڑی بوٹیوں پر مشتمل دوا بنی، جس سے فائدہ ہوا۔ آپ کے شہر صادق آباد میں ہمدرد مطب ہو تو رابطہ کریں۔

پراسٹیٹ کا مسئلہ

کوئٹہ سے ہمارے قاری ظفر اقبال پراسٹیٹ کے لیے پوچھ رہے ہیں۔ وہ آپریشن نہیں کرانا چاہتے، حکمت کا علاج پوچھ رہے ہیں۔ آپ بھی کوئٹہ میں ہمدرد مطب سے رابطہ کریں۔ مہینا بھر دوا کھا کر دیکھیے، فرق پڑتا ہے یا نہیں۔ دفتر سے فون نمبر لے کر شام کے وقت مجھ سے رابطہ کریں۔ پراسٹیٹ کا مسئلہ دیر سے حل ہوتا ہے۔

بادام اور بزرگ

س: گزشتہ دنوں میں گاؤں گیا تو دیکھا، صبح میرے تایا جی، چاچا جی بیٹھے ہیں۔ سامنے کونڈی ڈنڈے سے ایک ملازم بادام گھوٹ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد بادام کی سردائی تیار ہوئی۔ مجھے بھی ایک گلاس ملا، مزیدار تھا۔ میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ بادام بوڑھے لوگ کیوں استعمال کرتے ہیں، یہ تو بچوں اور نوجوانوں کی غذا ہے۔ کیا بادام بوڑھے لوگوں کے لیے بہت فائدہ مند ہیں؟ (سعید اللہ خان)

ج: اللہ تعالیٰ نے ان میوہ جات میں بہت فوائد رکھے ہیں۔ بوڑھے بچے سب کھا سکتے ہیں۔ بادام میں نہ جینے والی چکنائی ہے۔ اس کے کھانے سے وزن نہیں بڑھتا بلکہ دل کو طاقت ملتی ہے۔ کوئی شہدول کم ہوتا ہے، آنکھوں کے لیے دماغ کے لیے صدیوں سے مفید مانا جاتا ہے۔ بادام اور دوسرے مغزیات سردی کے موسم میں ضرور کھانے چاہئیں۔ ان میں مونگ پھلی، چلغوزے، اخروٹ، تل، چہار مغز وغیرہ شامل ہیں۔ اس طرح پانچ سات بادام بہت ہیں، اس سے زیادہ نہیں۔ آپ بھی کھائیے، فائدہ ہوگا۔

تین ماہ کا بچہ

س: میرا بچہ تین ماہ کا ہے۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے کچھ کھلانا چاہتی ہوں۔ جیسے ہی چاول کے دو تین دانے مسل کر منہ میں رکھتی ہوں، وہ فوراً قے کر دیتا ہے۔ اسی طرح حلوہ کھلانا چاہا وہ بھی نکال دیا۔ میں اسے کس طرح غذا کھلاؤں؟ (مسر جلیل)

ج: غذا شیر خوار بچوں کی زبان کے آگے والے حصہ میں لگتی ہے۔ وہ اسے عادتاً نکال دیتے ہیں۔ ننھے بچے شروع کے چار ماہ میں دودھ کے علاوہ کچھ پسند نہیں کرتے۔ آپ بچے کو کچھ دینا چاہتی ہیں تو چچ سے زبان دبا کر منہ میں ڈال لے تاکہ وہ اگلے حصے پر نہ لگے اور بچہ اس کا ذائقہ محسوس نہ کر سکے۔ عموماً پانچ ماہ کی عمر میں بچے کھانے لگتے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ بچے سے زبردستی مت کریں۔

دیہات میں بچے کو اصلی گھی میں روٹی مسل کر شکر ملا کر دیتے ہیں۔ گاؤں والوں کی یہ سوچ ہے کہ اصلی گھی سے بچہ موٹا ہوتا ہے اور اسے قبض نہیں رہتا۔ ان کے بچے بھی اچھے ہاضمہ کے ہوتے ہیں۔ ان کو گھی ہضم ہو جاتا ہے۔ وہ بچے کو دودھ میں ایک چمچ اصلی گھی ڈال کر پلاتے ہیں۔ شہر کے بچے نازک مزاج ہوتے ہیں۔ بہر حال آپ بچے کو سیریلیک، ساگودانہ کی کھیر، حلوہ، کھجوری وغیرہ ایک ماہ بعد کھلا سکتی ہیں۔ اسی طرح کبھی ابلّا ہوا آلودے دیا، انڈے کی زردی کھلا دی۔ پھر آپ اسے ٹھوس غذا پر لے آئیں۔ ماشاء اللہ بچہ ٹھیک رہے گا۔

حمل کے دوران ورزش

س: میں دو ماہ بعد ماں بننے والی ہوں۔ میں نے ایک بات نوٹ کی ہے، بچہ ہونے کے بعد خواتین کا جسم بڑھ جاتا ہے۔ میں اپنے جسم کو مناسب رکھنا چاہتی ہوں۔ کیا میں ہلکی پھلکی ورزش کر سکتی ہوں؟ (ص۔۱)

ج: پہلے زمانے میں حاملہ خواتین کی بہت احتیاط کی جاتی تھی حتیٰ کہ ان کو بعض دفعہ بستر پر آرام کرنے کے لیے کہا جاتا تھا۔ اب تو افراتفری کا عالم ہے۔ مشترکہ خاندان بھی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اب تو خواتین جیسے ہی بچہ لے کر گھر آتی ہیں تو ذمہ داری سنبھالنی پڑتی ہے۔ گھر کے ہلکے پھلکے کام ہی ورزش کے زمرے میں آ جاتے ہیں۔ دیہات کی جفاکش اور پہاڑی علاقے کی خواتین حسب معمول سارے کام انجام دیتی ہیں اور بعض اوقات تو ان کے بچے کی ولادت بھی کام کے دوران ہو جاتی ہے۔ کام کاج کرنے سے صحت بھی بہتر رہتی ہے اور زچگی کے مراحل بھی آسان ہو جاتے ہیں۔ آپ اپنے کام کرتی رہیں، زیادہ بوجھ نہ اٹھائیے۔ اپنی ڈاکٹر سے پوچھ کر ہلکی پھلکی ورزش کر سکتی ہیں۔ حمل کے دوران سب سے بہتر ورزش تو صبح شام پیدل چلنا ہے۔ اس سے صحت بہتر رہتی ہے۔ پیٹ پر بھی اضافی بوجھ نہیں پڑتا۔ جن خواتین کے جڑواں بچے ہیں، درد اور خون کا اخراج ہونے لگے تو انھیں فوری طور پر ڈاکٹر سے رابطہ کرنا چاہیے اور ورزش نہیں کرنی چاہیے تاکہ بچے محفوظ رہیں۔ آپ زچگی کے بعد اپنے ڈاکٹر سے جسم مناسب رکھنے کے لیے مشورہ کر کے ورزش کر سکتی ہیں۔

مٹر

س: مٹر مجھے پسند ہیں۔ ان کے کھانے کا کوئی فائدہ ہے یا ذائقہ کے لیے کھائے جاتے ہیں؟ مٹر سے ہم کیا بنا سکتے ہیں؟ ضرور بتائیے۔

ج: کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اللہ نے اپنی قدرت کاملہ سے ہر سبزی، پھل حتیٰ کہ گھاس پھوس

میں بھی فائدہ رکھا ہے۔ مٹر ایک اعلیٰ قسم کی سبزی ہے۔ اس کے کھانے سے پیشاب بھی کھل کر آتا ہے۔ فاسد رطوبات خارج ہو جاتی ہیں۔ جن لوگوں کو پیشاب کی تکلیف ہو، تھوڑا تھوڑا آتا ہو، ان کو بھی مٹر کھانے سے فائدہ ہوتا ہے۔ کمزور بچوں کے لیے بہت مفید سبزی ہے۔ اس سے خون بنتا ہے اور جسم بھی موٹا ہوتا ہے۔ ایک بات کا دھیان رکھیے، اسے زیادہ مقدار میں نہ کھائیے۔ زیادہ کھانے سے پیٹ میں درد ہو سکتا ہے اور قبض بھی۔ مٹر خشک اور گرم ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں کو قبض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ مٹر دودھ پلاتی ماؤں کے لیے بہت مفید ہیں اور ان کے کھانے سے دودھ میں اضافہ ہوتا ہے۔ بچہ بھی صحت مند رہتا ہے۔ مٹر گوشت، مٹر قیمہ، آلو مٹر، آلو گا جر مٹر میٹھی، آلو مٹر کے کباب اور کنکلس بنتے ہیں۔ کچے مٹر ٹٹھے ہوتے ہیں۔ ان کو ویسے بھی کھا لیا جاتا ہے۔ تھوڑے سے مکھن یا گھی میں مٹر کے دانے فراہی کر کے نمک کالی مرچ چھڑک کے کھائے جاتے ہیں۔ مٹر کے دانے بھون کر نمک میں بھی شامل کرتے ہیں۔ مٹر کے نرم نرم چھلکے لے کر خاص طریقے سے چھری کے ساتھ چھیلا جاتا ہے۔ پھر کاٹ کر آلو یا قیمہ کے ساتھ یہ نرم چھلکے پکائے جاتے ہیں۔ آپ مٹر ضرور کھائیے۔ اعتدال کے ساتھ!

نمک کا زیادہ استعمال

س: ہمارے گھر میں نمک کا بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے کھانے سے بلڈ پریشر کے مریضوں کو نقصان ہوتا ہے۔ میری والدہ دل کی بھی مریضہ ہیں۔ بڑھاپے کی بیماریاں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ مگر میں ان کو روک نہیں سکتا۔ نمک کا استعمال کیسے کم کیا جائے۔ (سلیم وقاص)

ج: بہت سارے گھرانوں میں یہی حال ہے بلکہ کچھ لوگ تو چائے میں بھی نمک ڈال کر پیتے ہیں۔ تمام دن میں زیادہ سے زیادہ چائے کا ایک چمچ برابر کر کے نمک لینا چاہیے، اس سے زیادہ نہیں۔ ہم لوگ انڈے پر بھی نمک چھڑک کر کھاتے ہیں۔ انڈے میں پہلے ہی نمک ہوتا ہے۔ پھل کھاتے ہیں تو اس پر بھی نمک لگا لیتے ہیں۔ نمک کھائیے ضرور مگر اعتدال کے ساتھ۔ چالیس سال کی عمر کے بعد آہستہ آہستہ اپنی صحت کی خاطر آپ نمک کی مقدار گھٹاتے جائیں۔ آپ کو بلڈ پریشر ہے تو ذرا ہاتھ روک کے نمک کا استعمال کریں۔ آپ کی صحت کے لیے بہتر ہے۔ آپ اپنی والدہ کو بتائیے کہ جب بلڈ پریشر خدا نہ کرے زیادہ رہنے لگے تو صحت کے کئی مسئلے درپیش آسکتے ہیں۔ بچوں کو بھی آپ اس بارے میں شروع سے بتائیے۔ نمک کا زیادہ استعمال صحت کے لیے اچھا نہیں۔ اپنی صحت کا خود دھیان رکھنا چاہیے۔

پیشاب کا مسئلہ

س: سردی آرہی ہے اور والد صاحب کا مسئلہ اس موسم میں بڑھ جاتا ہے۔ ان کو پیشاب بہت آتا ہے۔ بار بار جانا پڑتا ہے۔ وہ چند گھنٹوں کا سفر بھی نہیں کر سکتے۔ پیشاب روکنا ان کے لیے مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر سے معائنہ کرایا، وہ کہتے ہیں مثلاً کمزور ہے۔ پراسٹیٹ کا مسئلہ بھی نہیں۔ ان کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ (احمد رضا)

ج: بڑھاپے میں ایسے مسائل ہو جاتے ہیں۔ اکثر خواتین بھی اس مسئلہ کا شکار ہوتی ہیں۔ حکیم لوگ ایک خاص دوا بناتے ہیں جو پیشاب بار بار آنے کو روکتی ہے۔ آپ وہ لے کر والد صاحب کو دیجئے۔ مغرب کے بعد ان کو پانی، جوس، دودھ نہ دیں۔ تل کے لڈو بڑے مزے کے بنتے ہیں۔ پہلے سردی کے موسم میں سو جی، اصلی گھی میں بھون کر برابر کے تل اور مغزیات گڑ کے ساتھ ملا کر لڈو بناتے تھے۔ ان کے کھانے سے بھی پیشاب میں کمی ہوتی تھی۔ ان کو پراسٹیٹ کی تکلیف نہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ ہو میو پیٹھک ادویہ بھی پیشاب کو روکتی ہیں۔

آئیے.....! کت ابوں کی صحت میں کچھ وقت گزارئیے

کتابوں کی کہکشاں

یہ کالم آپ کو کت ابوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا
اس میں کت اب اور صاحب کت اب دونوں کا تذکرہ رہے گا

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ ایک انتہائی دقیق موضوع پر عام فہم انداز میں غیر ضروری بحثوں سے احتراز کرتے ہوئے اسے مرتب کیا گیا ہے۔



مصنف: ڈاکٹر محمد باقر خان خاکوانی

ملنے کا پتہ: ادارہ مطبوعات سلیمانی، رحمان مارکیٹ،

غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

فون نمبر: 042-37232788

قیمت: دو سو روپے

☆☆☆

کتا بیں اور رسائل مسرت و شادمانی، فہم و فراست اور علم و دانش حاصل کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہیں۔ فکشن ہمیں جینے کا حوصلہ دیتا ہے۔ اچھی شاعری ہمارے جذبات کی گرہیں کھولتی ہے۔ سفر نامے گھر بیٹھے ہمیں دنیا کی سیر کراتے اور ہماری معلومات میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں۔ جو ادارے اس دور میں کتابیں شائع کر رہے ہیں یقیناً وہ قوم کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہم چند نئی شائع شدہ کتب سے آپ کا تعارف کر رہے ہیں۔

☆☆☆

علوم الحدیث

مسلمانوں کے عظیم علمی سرمایہ میں علم حدیث ایک بنیادی اور سب سے اہم سرمایہ ہے۔ اگر اس سرمایہ کو مکافہ اہمیت نہ دی جائے تو اسلام کی عظیم الشان عمارت کمزوری کا شکار ہو سکتی ہے۔ اس لیے جو شخص، تحریک، فرقہ، جماعت یا گروہ دین اسلام کو مٹانے کے درپے ہوتا ہے تو وہ پہلا حملہ حدیث نبویؐ پر کرتا ہے۔ اسے ایک ناقص سرمایہ قرار دیتا ہے اور ناقابل اعتبار بنانے کے لئے کئی اداری کوڑیاں دلائل کے طور پر لاتا ہے۔ حفاظت حدیث کے مختلف طریقوں میں سے ایک اہم طریقہ اس موضوع پر ہر دور میں متواتر علوم حدیث پر کتب کی تصنیف ہے۔



ہو رہی ہے۔ یہ کتاب بڑی توجہ سے شائع کی گئی ہے۔
ملنے کا پتہ: بک کارنر شوروم بالمقابل اقبال لائبریری، بک
سٹریٹ، جہلم

فون نمبر: 0544-614977
قیمت: ۳۹۵ روپے

☆☆☆

حمید اختر

حمید اختر مرحوم ایک اچھے ادیب، کہانی کار، افسانہ نویس
ہونے کے ساتھ ساتھ ایک منجھے ہوئے صحافی بھی تھے۔ شروع
میں وہ اخبارات کی ادارہ نویسی کرتے رہے، زندگی کے
آخری دور میں مختلف اخبارات میں کالم لکھتے رہے۔
تاحیات قلم کی مزدوری کر کے اپنا اور اپنے بچوں کا
پیٹ پالتے رہے۔ ان کی دنیا داری اور مال و متاع سے
بے نیازی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب وہ
ہجرت کر کے پاکستان تشریف لائے تو دیگر مہاجرین کی
طرح کلیموں کے چکر میں پڑ کر اپنے لیے مکان اور
جائیدادیں حاصل کرنے کی کوئی تگ و دو نہ کی بلکہ عوام کو
سیاسی شعور اور آگاہی دینے کے لیے سیاسی کاموں میں
مصروف رہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ انہوں نے نہ تو
تقسیم کے وقت کوئی جائیداد بنائی اور نہ ہی بعد میں۔ تا دم

میں بھی فعال رہے۔ ایک محبت وطن پاکستانی اور دانشور کی
ہیئت سے ملک میں صحت مند صحافتی اقدار کے فروغ کے
لیے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ضیاء
الاسلام انصاری کی شخصیت پر مضامین کو ایک خصوصی گوشہ
میں جمع کر دیا گیا۔ دوسرے حصہ میں انصاری صاحب کے وہ
لکچرز جمع ہیں جو انہوں نے ۱۹۸۱ء میں اسٹیٹ لائف
انشورنس کے ادارے میں دیئے تھے۔ ان لکچرز میں کی گئی
نصیحتیں اور اصول آفاقی ہیں، عزم و عمل کی ایسی روشن مثالیں
ہیں جو ہر شخص کو زندگی کے سفر میں ترقی اور کامیابی کے
حصول کے لیے راہ عمل تلاش کرنے میں مدد دے سکتی ہیں۔
یہ کتاب پڑھ کر بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ خاص طور پر نئی
نسل کے لیے یہ کتاب ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔

ملنے کا پتہ: مکتبہ راحت الاسلام، مکان نمبر 26، گلی
نمبر 48، سیکٹر 4/F-8، اسلام آباد،
فون نمبر: 051-2256656
قیمت: ۳۰۰ روپے

☆☆☆

غازی علم الدین شہید

ایک عظیم شخصیت جس نے غلامی کی سیاہ رات میں
اپنی قربانی دے کر رسول پاک کی شان اقدس میں گستاخی
کرنے والے مردود کو جہنم واصل کر کے، ایک ایسا اجالا
کروا جس سے سارا عالم منور ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس
قربانی کے صلے میں مسلمانان ہند کو گہری نیند سے جگا دیا اور
آزاد کار آزادی کا سورج طلوع ہوا۔ آج دنیا بھر میں شیطانی
قوتیں ناموس مصطفیٰ پر پہلے سے زیادہ شدید حملے کر رہی
ہیں، ضرورت ہے کہ قوم کے بچے بچے کے ذہن میں یہ
بات بٹھائی جائے کہ ہم جان دے سکتے ہیں لیکن حضور پُر
نور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کر سکتے۔

بک کارنر نے جہلم جیسے غیر ادبی شہر میں علم کی جوشع
روشن کی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ زیادہ روشن

مُلج ہو گیا تھا، اس لیے کہ اللہ کے تصور کے بارے میں
میرے پاس چند معقول اعتراضات تھے۔ اگلے دس برس
تک میں ملج رہا۔ پھر میں نے ۲۸ برس کی عمر میں قرآن
پاک کی ایک تشریح اور ترجمہ پڑھا۔ قرآن میں نہ صرف
مجھے اپنے اعتراضات کے مربوط جوابات مل گئے تھے بلکہ
اس کے مطالعہ کی وجہ سے میں اللہ پر ایمان لے آیا تھا۔
یوں میں مسلمان ہو گیا۔“

ملنے کا پتہ: زمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، کمیٹی
چوک، راولپنڈی

فون نمبر: 051-5551519

قیمت: ۳۰۰ روپے

☆☆☆☆

منزل مراد

ضیاء الاسلام انصاری اردو صحافت میں ایک بڑا نام
ہے، وہ ۳۰ سال سے زائد عرصہ صحافت کے پیشے سے
منسلک رہے۔ رپورٹر کے طور پر صحافتی میدان میں قدم رکھا۔
نیوز ایڈیٹر پھر ایڈیٹر اور پھر چیف ایڈیٹر بنے۔ شگفتہ کالم لکھے
اور ادارہ نویسی میں اپنا آپ منوایا۔ بعد ازاں جب وہ کارکن
صحافی کی سطح سے اٹھ کر روزنامہ مشرق کے چیف ایڈیٹر اور
چیف ایگزیکٹو بنے تو دیران جرائد اور مالکان اخبار کی تنظیموں



امریکا میں اسلام تک کا سفر

یہ کتاب ڈاکٹر جفرے لینگ کی کتاب Even the
Angels Ask کا اردو ترجمہ ہے۔ مصنف درس و تدریس
کے پیشے سے وابستہ ہیں اور ریاضی کے ایسوسی ایٹ
پروفیسر کے طور پر کینساس یونیورسٹی میں خدمات انجام
دے رہے ہیں۔ اس کتاب میں ڈاکٹر لینگ نے امریکا
میں اشاعت اسلام کی موجودہ صورت حال اور نو مسلموں
کے مسائل پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور مسلمانوں



کی نوجوان نسل کو دین کی طرف مائل کرنے کے لیے کئی
تجاویز بھی پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر جفرے ۱۹۹۱ء میں یونیورسٹی آف ٹیکساس سے
چھٹی لے کر یونیورسٹی آف پٹرولیم اینڈ منرلز، دہران
(سعودی عرب) میں بھی پڑھاتے رہے۔ یہاں قیام کے
دوران انہوں نے حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔
ڈاکٹر صاحب قاری کو یوں ساتھ لے کر چلتے
ہیں کہ قدم بہ قدم موضوعات کے تنوع میں قرآن اور
احادیث نبوی کی رہنمائی بھی ساتھ ساتھ رہے۔ ڈاکٹر
صاحب نے اپنے قبول اسلام کی داستان مختصر آیوں
بیان کی ہے:

”میں پیدا عیسائی ہوا تھا، میں اٹھارہ برس کی عمر میں

باقی دانش کی

علی عباس قادر

کہا امام ابو حنیفہ نے!

- ۱۔ جب اذان کی آواز سنو تو فوراً نماز کے لیے تیار ہو جاؤ اور نماز ہمیشہ اول وقت میں ہی پڑھا کرو۔
- ۲۔ ہمسائے کے ساتھ اچھے سلوک سے پیش آؤ اور اسے کبھی تنگ نہ کرو۔
- ۳۔ ہر مہینے میں دو چار روزے ضرور رکھا کرو۔
- ۴۔ لہو و لعب سے پرہیز کرو، قبرستان بھی جایا کرو تا کہ دل دنیا کی طرف زیادہ مائل نہ ہو۔
- ۵۔ علم بغیر عمل کے ایسا ہے جیسے جسم بغیر روح کے۔
- ۶۔ تعلقات دنیا کو کم کرنا یہ ہے کہ آدمی دنیا سے ضروری چیزیں لے اور غیر ضروری چھوڑ دے۔
- ۷۔ جو علم کو دنیا کمانے کے لیے حاصل کرتا ہے، علم اس کے قلب میں جگہ نہیں پاتا۔

امام ابو حنیفہ کا اصل نام نعمان بن ثابت بن زوطا بن مرزبان تھا۔ فقہ کے ”سنی حنفی سکول“ کے بانی تھے۔ وہ تابعی بھی تھے کیونکہ انھوں نے کئی صحابہ کرامؓ سے تعلیم پائی تھی۔ امام ابو حنیفہ عراق کے شہر کوفہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم ثابت بن زوطا افغانستان کے علاقے کابل میں تجارت کیا کرتے تھے۔

ابو حنیفہ حضرت محمد ﷺ کی وفات کے ۶۷ سال بعد پیدا ہوئے، کافی روایات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے کچھ صحابہ کرامؓ سے احادیث بھی سنی تھیں۔ جب ابو حنیفہ پیدا ہوئے تو اس وقت عراق کے گورنر حجاج بن یوسف تھے۔ بچپن میں ابو حنیفہ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہے۔ انھوں نے ریشم بنے کا کاروبار بھی کیا۔ عمر بن عبدالعزیز نے تعلیم کی طرف اتنی توجہ دی کہ ہر گھر مدرسہ بن گیا۔ تب ابو حنیفہ نے بھی تعلیم کی طرف دلچسپی لی۔

۶۳ء میں المنصور نے ابو حنیفہ کو ریاست کا چیف جج بنانے کی پیشکش کی مگر ابو حنیفہ نے یہ کہتے ہوئے پیشکش ٹھکرا دی کہ وہ اس عہدے کے قابل نہیں۔ المنصور کو برا لگا اور اس نے الزام لگایا کہ ابو حنیفہ جھوٹا شخص ہے۔ اس پر ابو حنیفہ نے جواب دیا کہ اگر میں جھوٹا ہوں تو پھر وہ ایک جھوٹے شخص کو چیف جج کیوں بنانا چاہتا ہے؟ اس پر منصور نے ابو حنیفہ کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا۔ ۷۷ء میں ابو حنیفہ جیل میں ہی وفات پا گئے تاہم ان کی وفات کی وجہ کا پتا نہیں چل سکا۔

زیر نظر تصنیف آپ کی موضوع سے جذباتی تعلق کی ایک مثال ہے۔ ”فریڈم فلوٹا“ کے امدادی قافلے کے ساتھ جو سلوک اسرائیل نے روا رکھا، اُس کا درد محسوس کرتے ہوئے فاضل مصنف نے اسرائیل کے ظلم و ستم کی داستانیں ملکی اور غیر ملکی رسائل و جرائد کو کھنگال کر بہت دیدہ ریزی سے جمع کی ہیں۔

اس کتاب میں یہودیوں کے نسلی تفاخر، ان کے مذہبی تعصب، انتہا پسندی، توسیع پسندانہ اور جارحانہ عزائم کا اظہار کرتے ہوئے فلسطینی مسلمانوں پر لرزہ خیز مظالم کی عہد بہ عہد تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ یوں یہ کتاب ایک سیاسی اور تاریخی دستاویز بن گئی ہے۔ اس میں بیان کردہ



اہم رپورٹس، تجزیوں، چشم کشا تاریخی حقائق، اظہار حقیقت کے اعتراف پر مبنی بیانات نے کتاب کو ایک آئینہ بنا دیا ہے جس میں اسرائیل کے اصل چہرے کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اسرائیل کے معاملے میں موجودہ دور کے مسلم حکمرانوں کے مایوس کن کردار کو بھی تفصیل سے زیر بحث لایا گیا ہے۔

ملنے کا پتہ: توکل اکیڈمی، کاشانہ خلیل، بالقابل کالج برائے خواتین، اردو بازار، کراچی۔

فون: 0321-8762213

قیمت: ۳۹۰ روپے



مرگ بغیر مکان کے ہی رہے، آخری دنوں میں وہ اپنی بیٹی کے گھر میں قیام پذیر تھے۔

انہوں نے کینسر کی بیماری کا بہت جرأت اور بہادری سے مقابلہ کیا اور جب تک ممکن ہوا اُس کے سامنے ہار نہیں مانی اور اپنا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اُن کی ہمت اور حوصلہ دیکھ کر انگریزی مقولہ 'Courage without hope' یاد آ جاتا ہے۔

اس کتاب میں عبدالستار عاصم نے حمید اختر کی چنیدہ تحریریں، مختلف حضرات کے ان کی شخصیت پر لکھے گئے مضامین اور ان کے منتخب افسانے بھی شامل کیے ہیں۔

ناشر: رضویہ ٹرسٹ

ملنے کا پتہ: مقبول اکیڈمی، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور۔

فون نمبر: 042-36175173

قیمت: ۲۰۰۰ روپے

☆☆☆

اسرائیل - آغاز سے انجام کی طرف

میر بابر مشتاق ایک کہنہ مشق لکھاری ہیں۔ ابتدائی دور میں بچوں کے مشہور مختلف رسائل میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ ۱۹۹۶ء میں آپ کی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہفت روزہ ”الحدید“ گجرات کے مدیر کی حیثیت سے ہوا۔



وزن
کم کریں مگر
صحت
نہیں

صحت سے دوری کی بڑی وجہ

ناقص غذا

اُس بچے کو دیکھیں جسے صرف ۳ سال کی عمر سے انسولین لگ رہی ہے۔ ماں کی تکلیف کو دیکھیں جو ہر وقت اپنے بچے کی شوگر چیک کرتی ہے۔ اس بچے کی حسرت دیکھیں جو عام بچوں کی طرح کوئی ٹافی کیا، امی کے ہاتھ کی بنی کھیر بھی نہیں کھا سکتا۔ ایسی ہزاروں حسرتیں ہمارے ارد گرد بکھری پڑی ہیں۔ ایسے میں خود کو بُرا بھلا کہنے کا مطلب ہے، ہم اللہ کی نعمت اور احسان کو بُرا کہتے ہیں۔ ہم اپنے طرز زندگی کی برائیاں ختم کرنے کے بجائے اللہ کو الزام دینے لگتے ہیں۔ لمحہ بھر کو سوچئے، احسان کرنے والا رب کیا سوچتا ہوگا۔ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں، وہ رحمن ہے، وہ آپ کو کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ ۲۰ دسمبر کو ایک ۱۷-۱۶ سالہ مریضہ کو اس کی بہن روتے ہوئے میرے پاس لائی۔ بلیک کروالا سے اتر کر کلینک کے اندر میرے میبل کے سامنے رکھے صوفے پر بیٹھنے تک وہ سب کے سامنے ہچکیوں سے روتی آئی تھی۔ خدیجہ کو ایک نہیں کئی ناسمجھ اور کم عقل دوستوں، رشتہ داروں کی طرف سے تیج آیا کہ ۲۱ دسمبر کو قیامت آرہی ہے۔ بقول

اللہ نے دنیا والے ہی نہیں یہ دنیا بھی بہت خوبصورت بنائی ہے۔ اس نے کبھی کسی کو بد صورت نہیں بنایا۔ ہم پیدا انہی طور پر بد صورت اور موٹے نہیں ہوتے۔ پچھلے دنوں میرے پاس ایک مریضہ آئیں اور روتے ہوئے بتانے لگیں ”اللہ نے اس کو بنایا ہی بد صورت ہے۔ موٹا اور بھدا جسم دے کر لوگوں کی ہنسی کا ذریعہ بنا دیا ہے۔“ میں نے اسے بڑے پیار سے سمجھایا ”اللہ جی نہیں ہم خود کو ہنسی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ بیٹھ کر کھاتے ہوئے ہمیں کبھی احساس نہیں ہوتا کہ جسمانی طور پر ہمیں اللہ نے کیا کچھ دے رکھا ہے۔ صحت جیسی جس عظیم نعمت سے نوازا ہے اُس کا احساس بھی نہیں کر پاتے، ہم چل سکتے ہیں، ہمارے سارے اعضاء کام کرتے ہیں اور ہم کسی کے محتاج نہیں۔“ ذرا بستر پر لیٹے اس معذور کی پیاس کا سوچیں جو آواز دے کر پانی بھی نہیں مانگ سکتا ہے۔ فالج زدہ لڑکی کی بے بسی دیکھیں جو چل کر خود غسل خانے نہیں جاسکتی۔ ۹ رسال کے

کہا حکیم لقمان نے!

- ۱۔ اے فرزند خاموشی کی عادت ڈالتا کہ زبان کے شر سے بچے رہو۔
- ۲۔ اگر کوئی تمھاری جھوٹی تعریف کرے تو تم خوش نہ ہونا کیونکہ جاہل کی تعریف سے خرف گو ہر نہیں بن سکتا۔
- ۳۔ بڑوں سے ٹکر نہ لینا اور چھوٹوں کو ذلیل نہ سمجھنا۔
- ۴۔ اگر تم اپنے لیے ہزار دوست بنا لو تو یہ کم ہے اور اپنا ایک دشمن بنا لو تو یہ بہت زیادہ ہے۔
- ۵۔ خدا کے رازق ہونے پر یقین رکھو، جس نے بطن مادر میں، آغوش مادر میں اور بچپن میں روزی دی، وہی آخر تک دے گا۔
- ۶۔ عورت ٹیڑھی ہڈی کی مانند ہے، اگر سیدھی کرنے کی کوشش کرو گے تو ٹوٹ جائے گی۔
- ۷۔ تم جو نہیں جانتے اسے علماء سے پوچھو اور جو جانتے ہو اسے جہلاء تک پہنچاؤ۔
- ۸۔ چار چیزوں کی جواب دہی کے لیے تیار رہو۔ تم سے قیامت میں پوچھا جائے گا کہ جوانی میں کیا کیا؟ حیات کہاں صرف کی؟ مال کہاں سے حاصل کیا اور اسے کہاں صرف کیا؟
- ۹۔ اے فرزند، اپنی زوجہ کو راز دار نہ بناؤ۔
- ۱۰۔ سفر بڑا طویل ہے۔ اس کے لیے زادِ راہ بہت زیادہ فراہم کرو اور عمل میں کمال خلوص پیدا کرو کیونکہ قبول کرنے والا بڑا دانا و پینا ہے۔

حکیم لقمان وہی شخصیت ہیں جن کا تذکرہ قرآن مجید کی سورہ لقمان میں آیا ہے۔ وہ بہت ہی دانا آدمی تھے۔ بہت سی حکایات ان سے منسوب ہیں۔ اپنی حکمت کی وجہ سے وہ بہت مشہور ہیں، ایک مشہور مثل ہے کہ وہم کی دوا تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھی۔ ان کو حکمت کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ حکیم لقمان نبی خدا حضرت ایوب علیہ السلام کے عزیز خاص تھے۔ آپ نے بڑی طویل عمر پائی۔ اللہ نے آپ کو جس علم و حکمت سے مالا مال کیا تھا آپ نے اُسے اپنے تجربے کی روشنی میں نصیحتوں میں ڈھال دیا اور آپ نے اپنی نصیحتوں میں خاص طور پر اپنے بیٹے کو مخاطب رکھا۔ آپ کی نصیحتوں کے شمار میں اختلاف ہے۔ بعض علماء ۳۰ ہزار بتاتے ہیں جب کہ ”صاحب جنات الخلود“ نے ۷۰ ہزار بتایا ہے۔

اس کے ٹی وی چینل پر کسی صاحب نے آکر بتایا ہے کہ سیارے ٹکرا کر ختم ہو جائیں گے۔ فرانس میں لوگ خودکشی کر رہے ہیں۔ سریا میں پہاڑوں پر چڑھ گئے ہیں۔

گویا ۲۱ دسمبر کو قیامت آجائے گی۔ بچی نے جب سے یہ بات سنی اور پڑھی، وہ پاگلوں کی طرح رو رہی تھی۔ اس کا بی بی بُری طرح لوٹھا۔ بار بار سانس اکھڑ رہی تھی۔ مجھ سے پہلے وہ کسی فزیشن سے مل کر آئی تھیں۔ اس نے سکون کا انجکشن دینے کی کوشش کی لیکن بچی نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ وہ قیامت سے پہلے سارا وقت جاگنا چاہتی ہے۔

موت کا خوف، موت کی بھیانک خبر کا خوف! یقین کیجیے وہ یہی سوچتی لرزتی رہتی تو ۲۱ دسمبر سے پہلے ہی دماغ کی نس پھٹ جاتی۔ سوچنے کی بات ہے ”قیامت کے دن و لمحے کا راز تو اللہ نے اپنے پیارے نبی کو بھی نہیں دیا۔ اچھے اعمال کرنے کا راستہ دکھایا اور روز قیامت کو روز حساب بتایا۔ مغرب والے تو ہر کچھ عرصے بعد دن، تاریخیں دینے لگتے ہیں پھر غلط ثابت ہونے پر شرمندہ بھی نہیں ہوتے۔ ہم ان جیسے کیوں بن جائیں، ہر افواہ، بات سن کر اس پر ایمان کیوں لے آتے ہیں؟ دوسری اہم بڑی بات جو میں نے اس بچی کو بھی سمجھائی، کہ آپ کے لیے اللہ نے یہ دنیا، یہ دو جہاں Design کر کے بنائے۔ آپ کو اپنا محبوب بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھی متعین تاریخ نہیں بتائی، صرف نشانیاں بتائی تھیں۔ سوچنے کی بات ہے کیا نشانیاں پوری ہو گئی ہیں؟

ہمارے پاس اللہ جی کے ساتھ ٹوٹے پھوٹے سجدوں اور ہر وقت اپنی ضرورتوں کے مطالبوں اور گزارشوں کا تعلق ہے۔ اُس کے ساتھ پوری فرمانبرداری کا تعلق بھی نہیں ہے۔ پھر ہمیں کیسے متعین تاریخ مل سکتی ہے؟ ہمیں کیا ہو جاتا ہے؟ جب ہم اچھے خاصے سمجھ دار ہو کر ایسے فضول منہج فارورڈ کر دیتے ہیں اور اس کے نتائج پر غور نہیں کرتے۔

سورۃ النحل میں ہے کہ اگر آپ اچھائی کرتے ہیں تو آپ سے متاثر ہونے والا اور اس سے آگے متاثر ہونے والا، سب کی اچھائیاں آپ کے ہاں بھی جمع ہوتی ہیں اور اسی طرح آپ کی کبھی بات سے کوئی برائی کرے گا اور مزید بڑھائے گا تو

سب کی برائیوں میں سے آپ کا گناہ جمع ہوتا جائے گا۔ آپ خود کو ایسی Inspiring پر سنیلٹی بنائیں کہ کوئی آپ کے پاس سے اٹھ کر چائے تو مثبت چارج ہو کر جائے۔ کیونکہ ہمارا تو ایمان ہے کہ ”مایوسی کفر ہے“ اور پلیز آپ اس کفر میں شامل نہ ہوں۔ خیر مانگیں، خیر ملے گی ورنہ ۲۱ دسمبر کو اللہ جی ناراض ہو کر کوئی دبا یا زلزلہ بھیج دیتے تو آپ کیا کر لیتے؟ اس اللہ جی سے Demand اور گمان، پلیز پلیز مثبت رکھیں۔ آپ جیسا سوچتے ہیں اللہ جی ویسے ہی ہیں۔ آج دل اس بھرے ہوئے موسم جیسا ہی ہے۔ رِس رِس کرتا نمی جیسا۔ میری ۲۰ کلائنٹس نے اپنے بچے ہی سکول نہیں بھجوائے تو بہ استغفر اللہ۔ بے شک پروفیشن کے اعتبار سے میں ایک نیوٹریشنسٹ ہوں لیکن پروفیشن کوئی بھی ہو، آپ کا اپنے اللہ پر یقین ٹھیک ہوگا تو ہی زندگی بہتر ہوگی۔

قصہ ایک ماں کی قربانی کا

اللہ جی ہم یہ اپنی مہربانی کا اظہار صحت جیسی اعلیٰ نعمت دے کر کرتے ہیں تاکہ ہم اپنے اور اپنے جیسے انسانوں کے لیے مفید ثابت ہوں۔ آنحضرت ﷺ نے صحت کے حوالے سے سوال کیے جانے کی بھی اطلاع دی تھی۔

میرے پاس آنے والی خواتین اور بچیوں کی اکثریت ”جنگ فوڈ“ کی اس بری طرح عادی ہیں کہ علاج اور ایکس سائز کا جو نمی خوشگوار نتیجہ سامنے آتا ہے، وہ اگلے ہی دن پھر اسی ظالم شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر برگر کھا رہی ہوتی ہیں۔ ایک مغربی ادارے کی تحقیق حال ہی میں سامنے آئی ہے کہ جو بچے چیس، چاکلیٹ اور کیک رغبت سے کھاتے ہیں، ان کی ذہنی صلاحیتوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح مصنوعی طور پر تیار کردہ خوراک کے زیادہ استعمال سے بھی کند ذہنی کا گہرا تعلق پایا گیا ہے۔ یاد رہے یہ اثرات موٹاپے کے علاوہ ہیں جو لازمی طور پر تحفے میں ملتا ہے۔ ۴ ہزار بچوں پر تحقیق کی گئی تھی، ان کی غذاؤں کا جائزہ لیا گیا تو ۳۳ طرح کی غذائیں سامنے آئیں۔ اول: پراس شدہ جن میں چینی اور دیگر ذائقے بھی شامل ہیں۔ دوسری میں گوشت کے علاوہ آلو شامل

ہیں جب کہ تیسری قسم سلاڈ، پھل اور سبزیوں پر مشتمل ہے۔ بچوں کے آئی کیو لیول کے ٹیسٹ لیے گئے تو حیران کن بات یہ سامنے آئی کہ جو بچے پراس شدہ غذائیں کھاتے ہیں، ان میں ذہانت کی کمی واقع ہو گئی تھی۔

”غیر صحت مند غذائیں“ جن میں فاسٹ فوڈ اور چیس سرفہرست ہیں۔ ریسرچ کے انچارج کا کہنا تھا کہ دماغی صلاحیتوں کو مست کرتی ہیں۔“

میری ایک کلائنٹ نے بتایا ”سبزہ زار لاہور میں ان کا ایک فاسٹ فوڈ سٹور ہے جہاں سے انھیں بے شمار آمدن ہوتی ہے مگر سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ میری بیٹی جب جی چاہے فون کر کے پیزا، برگر، بروٹڈ چکن جو کچھ وہاں دستیاب ہے منگوا لیتی ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود ملازم اسے انکار نہیں کر پاتے اور نتیجے میں میری چاندی بیٹی نہ صرف ناقابل یقین حد تک بھاری بھر کم ہو گئی ہے بلکہ پڑھائی میں اس کا دل نہیں لگتا اور اس کے نتائج بری طرح متاثر ہوئے ہیں۔“

ان کی بیٹی بہت سمجھدار اور کیوٹ ثابت ہوئی، اس نے کئی ہفتے مستقل مزاجی سے اپنے فوڈ پلان پر عمل کیا اور وزن کم کر لیا مگر جونہی اسے احساس ہوا کہ وزن کم ہو گیا، اس نے فوری طور پر اپنا پرانا معمول دوبارہ شروع کر دیا۔ گزشتہ دنوں اس کے والدہ نے بتایا کہ میں نے تنگ آ کر

”فاسٹ فوڈ سٹور“ ہی بند کر دیا ہے۔

مجھے افسوس ہوا اور حیرت بھی۔ اسی شام بطور خاص میں نے اس سٹور کے سامنے گاڑی روکی تو وہاں منظر بدلا ہوا تھا۔ وہاں واقعی فاسٹ فوڈ کی بجائے شادی ہال کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ قربانی اور اتنا بڑا فیصلہ ایک ماں ہی کر سکتی ہے کہ جس کے لیے اس کی بیٹی کی صحت اور وزن کی کمی پہلی ترجیح ہو چکی ہو۔ کیونکہ یہ ماں ہی جانتی ہے کہ اس ظالم وزن کی وجہ سے بعد میں بیٹیوں کو کیسے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماہانہ ایام کی خرابی سے لے کر بچوں کی پیدائش تک میں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جوڑوں کے درد، ہڈیوں کے مسائل بھی سامنے آتے ہیں۔ ظاہری جسمانی خوب صورتی ایک ڈراؤنا خواب بن کر الگ سے ڈراتی اور جذباتی مسائل پیدا کرتی ہے۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوط اور کی طرف۔

س: میری عمر ۳۰ سال ہے۔ میں شادی شدہ ہوں اور میرے دو بچے ہیں۔ ایک تین ماہ کا ہے اور ایک دودھ پیتا۔ میرا قد ۵ فٹ ۳ انچ ہے، میرا وزن ۶۵ کلو ہے۔ میں demonstrator کے طور پر کام کر رہی ہوں۔ میں آپ کا کالم بہت پسند کرتی ہوں۔ پلیز میرے لیے کوئی ڈائیٹ تجویز کریں۔ ڈاکٹر فریدہ۔ فیصل آباد

سبزیوں کا فائدہ اور کولا کا نقصان

وزن کی بے ترتیبی اور زیادتی کو سنبھالنے میں ایک نسخہ تیر بہدف ہے جو ہر عمر اور ہر جگہ اپنی حیثیت منواتا ہے۔ چند ہفتے آپ باقاعدگی سے پھل اور سبزیوں بطور خوراک کھانے پہ آمادہ ہو جاتے ہیں اور ماہر غذائیات سے اپنے وزن، قد اور عمر کے مطابق خوراک (In take) کا تعین کرا لیتے ہیں تو یہ سمجھتے ایک پختہ دو کاج والا معاملہ ہو جاتا ہے۔ نہ صرف وزن پر اچھا اثر پڑتا ہے بلکہ جلد کی رنگت، خوب صورتی اور چمک بہتر ہو جاتی ہے۔ پھلوں اور سبزیوں کے اندر پایا جانے والا زرد اور سرخ مادہ جو Carolenord کہلاتا ہے، جلد کی رنگت کے نکھار اور چمک پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کولا مشروبات بظاہر جسم کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو مہمانوں کی مہمانداری کا لازم حصہ بن چکے مگر ان کا مسلسل استعمال نہ صرف موٹاپے کا باعث بنتا ہے بلکہ ان کا ایک لازم جزو 4MEI ہوتا ہے۔ امریکی تحقیقات کے مطابق یہ جزو کینسر پیدا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ جس کی بنا پر پُرڈوکس کمپنیز کو بٹل پر وارننگ کا لیبل چسپاں کرنا ہوگا۔ اسی طرح امریکا کی بیورج ایسوسی ایشن کا کہنا ہے کہ اس کیمیائی مادے سے چوہوں کو تو یوں کینسر کا خطرہ ہے مگر انسانوں کو کینسر ہونا ثابت نہیں۔ اب بھلا جس کو کینسر ہوا ہوگا وہ بتائے تھوڑی آئے گا؟

ماہ رواں کی شخصیات

محمد خلیل (ویٹ)

اس معلوماتی سلسلہ کو بہت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اہم معلومات کا ماخذ ثابت ہوگا

ماہ جنوری میں پیدا ہونے والی اہم عالمی و ملکی شخصیات

- ۶ جنوری ۱۹۵۹ء کیپل دیو (بھارتی کرکٹر)
۸ جنوری ۱۹۳۵ء ایلوس پریسلے (امریکی گلوکار)
۸ جنوری ۱۸۳۶ء مولوی سید احمد (مؤلف فرہنگ آصفیہ)
۹ جنوری ۱۸۹۰ء کارل چپک (روبوٹ کے کردار کے خالق)
۹ جنوری ۱۹۱۳ء رچرڈ نیکسن (امریکا کے سابق صدر)
۹ جنوری ۱۹۲۰ء حکیم محمد سعید (سابق گورنر سندھ، ادارہ ہمدرد کے بانی)
۱۰ جنوری ۱۹۳۸ء صلاح الدین (ہاکی کے کھلاڑی، کوچ و مینیجر)
۱۰ جنوری ۱۹۴۹ء جارج فورمین (امریکی باکسر)
۱۱ جنوری ۱۸۱۲ء سر جان جیکب (بانی جیکب آباد)
۱۱ جنوری ۱۸۸۹ء نواب احمد سعید خان (آف چھتاری)
۱۲ جنوری ۱۹۳۰ء احمد فراز (معروف اردو شاعر)
۱۲ جنوری ۱۹۳۷ء جعفر میسر (امریکی باکسر)
۱۳ جنوری ۱۹۵۴ء اختر رسول (ہاکی کے نامور کھلاڑی)
۱۳ جنوری ۱۸۶۰ء عبدالحلیم شرر (نامور اردو ادیب)
۱۳ جنوری ۱۹۰۰ء حفیظ جالندھری (قوی ترانے کے خالق)
۱۳ جنوری ۱۹۲۳ء کیفی اعظمی (شاعر)
۱۵ جنوری ۱۹۱۸ء جمال عبدالناصر (مصری صدر)
۱۵ جنوری ۱۹۲۹ء مارٹن لوتھر کنگ (عیسائی رہنما)
۱۵ جنوری ۱۹۲۷ء عبدالعزیز خالد (اردو شاعر)
۱۶ جنوری ۱۸۸۹ء ڈاکٹر طہ حسین (ناجی مصری ادیب و سابق وزیر تعلیم)
- یکم جنوری ۱۹۰۶ء افتخار حسین ممدوٹ (تحریک پاکستان کے رہنما)
یکم جنوری ۱۸۱۸ء مولانا امداد اللہ مہاجر کی
یکم جنوری ۱۸۶۳ء پیری ڈی کو برٹن (جدید اولمپک کھیلوں کے بانی)
یکم جنوری ۱۸۷۹ء ای ایم فوسٹر (مشہور ادیب)
یکم جنوری ۱۹۱۰ء استاد دامن (پنجابی شاعر)
یکم جنوری ۱۹۲۶ء جمیل الدین عالی (مشہور ادیب و دانشور)
۲ جنوری ۱۸۶۹ء ثاقب لکھنوی (اردو کے معروف شاعر)
۲ جنوری ۱۸۶۲ء صفی لکھنوی (اردو کے معروف شاعر)
۲ جنوری ۱۹۲۲ء ڈاکٹر ہر گوبند خورانا (نوبل انعام یافتہ سائنسدان)
۳ جنوری ۱۸۳۶ء منشی نول کشور (اردو زبان کے محسن)
۳ جنوری ۱۸۴۳ء رابرٹ وہائٹ ہیڈ (تاریخ و کے موجد)
۳ جنوری ۱۹۱۵ء حمید نظامی (نوائے وقت کے بانی)
۳ جنوری ۱۸۰۹ء لوئی بریل (نابینا افراد کی تعلیم کے موجد)
۳ جنوری ۱۸۱۳ء آئزک پٹ مین (شارٹ پیٹ کے موجد)
۵ جنوری ۱۵۹۲ء شاہ جہاں (پانچویں مغل بادشاہ)
۵ جنوری ۱۹۲۸ء ذوالفقار علی بھٹو (پاکستان کے پہلے منتخب وزیراعظم)
۵ جنوری ۱۸۵۵ء کنگ جیلٹ (بلیڈ کے موجد)
۵ جنوری ۱۹۱۲ء حفیظ ہوشیار پوری (معروف شاعر)
۶ جنوری ۱۳۱۲ء جون آف آرک (فرانسیسی مجاہد)
۶ جنوری ۱۸۸۳ء خلیل جبران (لبنانی ادیب و فلسفی)



جمال عبدالناصر جمیل الدین عالی غلام اسحاق خان



عبدالغنیف کاردار احمد فراز حاجہ مسرور

دودھ یا پانی میں لیں کم از کم تین ماہ۔ Tummy Holding سانس کی ورزش کریں۔ پانی پیئیں، نماز پوری اور اچھی طرح ادا کریں۔ وزن کم ہونے پر مطلع بھی کریں۔
☆☆☆☆

خوشخبری

محمد عمران۔ بہاولپور
۱۱/۷ سے ۱۰۰ کلو پر آئے ہیں۔ مبارک ہو۔ آپ کے ۳ ماہ بہت اچھے تھے، آپ کا ناشتہ تبدیل ہوگا۔
بلیکس۔ سعودی عرب
۹ کلو وزن کم ہوا، مبارک ہو۔ Standing واک جاری رکھیے
ثریا۔ فیصل آباد
پیریڈ نارمل ہونے کی مبارک، وزن آئندہ نہ بڑھے ورنہ شادی کے بعد بچوں کی پیدائش کے ایشو سامنے آسکتے ہیں۔
قدسیہ۔ راولپنڈی
اللہ کی بندی ۲۰ کلو بہت زیادہ ہو گیا ہے۔
بس کرو، ۱۵ کلو کا ٹارگٹ دیا تھا، بس اب وزن Maintain رکھو۔ باہر کی تلی ہوئی چیزیں نہ کھانا، دن میں ایک وقت روٹی، دو گلاس سکم ملک اور ۲،۲ سر وینگ پھل سبزی کی رکھو۔ میٹ کی سر وینگ ایک عدد، کوشش کریں کہ اپنا ورک آؤٹ، لائف ٹائم نہ رکھو، تم ایک بڑی مشکل سے نکلی ہو۔ تمہیں تو دیکھ کر میں نے پہچانا ہی نہیں۔
یہ سب اللہ جی کا شکر ہے کہ اس نے ہماری کوشش میں برکت اور تاثیر ڈال دی۔ الحمد للہ۔ میں واقعی تمہارے رزلٹ سے بہت خوش ہوں۔
مازہ حمید۔ چکوال

آپ نے ۵ کلو کم کیا ہے۔ مبارک ہو، آپ کا ٹارگٹ ابھی ۱۰ کلو باقی ہے۔

اسی کے ساتھ اجازت چاہوں گی، مجھے میرے بچوں اور اہل کا خانہ کو اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر رہے۔ آمین

ج: فریدہ آپ نے مجھے اپنی Food history نہیں بتائی اور Activity level بھی نہیں بتایا؟
Anyways آپ کے وزن کے حساب سے آپ کو ۵۰ سے ۵۵ کلو میں آجانا چاہیے۔ بچے کو فیڈ کراتی ہیں، میں آپ کو مائع (Liquid) ڈائیٹ تجویز کروں گی۔ آپ ۳۵ منٹ کی سٹینڈنگ واک اور ۳۵ منٹ کی کارڈیو واک کریں۔ Breathing کے ذریعے Tummy ہولڈنگ کی ورزش کریں۔ صبح ایک اور نچ لیں پھر ناشتے میں سکم ملک، ایک براؤن سلاکس شہد لگا کر اور ایک انڈہ لے لیں۔
Snaks دونوں وقت میں سٹر لیں پھل (اورنج) لیں، ۱۵۰ گرام تک، روز منہی بھر nuts لے سکتی ہیں۔
Main meats میں ۱۵۰ گرام ویکٹریل، ایک پیس چکن کے ساتھ سوپ لے لیں۔ اس کے علاوہ دو کپ لیمن گراس ہر Main میل کے بعد لیں۔

رات سونے سے ایک گھنٹہ پہلے ایک پیالی دودھ میں اسپغول لیں۔ فولاد اور وٹامن سی، وٹامن ای پر مشتمل ایک سے دو ملائی وٹامن ضرور استعمال کریں۔ پانی پیئیں، خوش رہیں اور نماز پڑھیں۔ لمبے رکوع اور سجدے کرنے سے انسان پتلا ہوتا ہے۔ باڈی بہت Shape میں رہتی ہے۔
☆☆☆☆

س: میں آپ سے اپنا ڈائیٹ پلان شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ میرا وزن ۵۵ کلو ہے اور قد ۵ فٹ ۳ انچ ہے۔ میں اپنا پیٹ پککانا چاہتی ہوں۔ میں ناشتے میں ایک کپ چائے اور سلاکس لیتی ہوں۔ آدھی روٹی لٹچ میں، ۵ بجے چائے میں فروٹ اور رات کو آدھی روٹی لیتی ہوں۔ سونے سے پہلے دودھ لیتی ہوں، مجھے بتائیں کہ میرا پلان ٹھیک ہے؟ خدیجہ۔ چکوال
ج: آپ کا پلان بہت کمزور ہے، اس میں بہت زیادہ کاربوہائیڈریٹ ہے۔ آپ بھوک رہ کر بھی موٹی ہوتی جائیں گی۔ آپ ناشتے میں انڈہ اور چائے لیں۔ سنکیس میں پھل اور مین میل میں ابلی (Steam) سبزیوں پر آجائیں۔ کارڈیو واک کریں، پیٹ کے بالائی زیریں دونوں Abs کی ورزش کریں۔
اپنا فزیکل لیول بڑھا دیں۔ After work out آپ Whey protein

۱۶ جنوری ۱۹۳۶ء جاوید اقبال (ممتاز کارٹونسٹ)

۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء جی ایم سید (سیاستدان)

۱۷ جنوری ۱۹۲۵ء عبدالحمید کاردار (پاکستان کرکٹ ٹیم کے پہلے کپتان)

۱۷ جنوری ۱۹۲۷ء جمیلہ ہاشمی (اردو ادیبہ)

۱۸ جنوری ۱۹۳۹ء سوار محمد حسین شہید (نشان حیدر)

۱۸ جنوری ۱۸۷۹ء سر غلام حسین ہدایت اللہ (پہلے وزیر اعلیٰ سندھ)

۱۹ جنوری ۱۸۰۹ء ایڈگر ایلن پو (انگریزی شاعر اور کہانی نگار)

۲۰ جنوری ۱۹۱۵ء غلام اسحاق خان (پاکستان کے سابق صدر)

۲۰ جنوری ۱۹۲۶ء قرۃ العین (معروف افسانہ و ناول نگار)

۲۱ جنوری ۱۹۳۲ء فخر زمان (دانشور و ادیب)

۲۲ جنوری ۱۸۹۳ء یوسف دہلوی (مشہور خطاط)

۲۲ جنوری ۱۹۰۹ء اوتھانت (اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل)

۲۳ جنوری ۱۲۶۳ء امام ابن تمیمہ (نامور مفتی، محدث، فقیہ)

۲۳ جنوری ۱۸۹۷ء سہاش چندربوس (تحریک آزادی کا سپاہی)

۲۳ جنوری ۱۹۲۰ء محمد خالد اختر (اردو ادیب)

۲۴ جنوری ۱۸۶۷ء مرزا محمد طاہر رفیع لکھنوی (مرثیہ گو)

۲۴ جنوری ۱۹۲۸ء مقبول جہانگیر (ادیب - صحافی)

۲۵ جنوری ۱۸۸۸ء ڈاکٹر سیف الدین کچلو (تحریک آزادی کے مجاہد)

۲۵ جنوری ۱۶۲۷ء رابرٹ بوائل (سائنس دان)

۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء امام فخر الدین رازی (مفسر، عالم دین)

۲۶ جنوری ۱۹۰۰ء الطاف حسین (ڈان کے سابق مدیر)

۲۶ جنوری ۱۹۲۶ء ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ادیب، نقاد)

۲۶ جنوری ۱۹۳۶ء احمد سلیم (ادیب)

۲۸ جنوری ۱۸۶۵ء لالہ لاجپت رائے (سیاستدان)

۲۹ جنوری ۱۹۲۶ء ڈاکٹر عبدالسلام (پاکستانی نوبل انعام یافتہ سائنس دان)

۳۰ جنوری ۱۸۸۲ء فرینکلن ڈی روز ویلٹ (امریکی صدر)

۳۰ جنوری ۱۹۳۰ء سرور بارہ بٹکوی (شاعر)

۳۱ جنوری ۱۹۵۳ء عرش ہاشمی (ممتاز نعت گو شاعر)

ماہ جنوری میں وفات پانے والی شخصیات

یکم جنوری ۱۹۸۸ء علامہ یوسف حسین لکھنوی (ممتاز عالم دین)

یکم جنوری ۱۹۶۳ء پروفیسر محمود انور (ممتاز ریاضی دان)

یکم جنوری ۱۹۷۳ء حکیم شفیق احمد (کراچی کے ممتاز طبیب)

یکم جنوری ۲۰۰۹ء غلام عباس (معروف افسانہ نگار اور ماہر تعلیم)

یکم جنوری ۲۰۰۶ء حنیف رائے (ممتاز مصور، سیاستدان اور ادیب)

۲ جنوری ۱۹۶۹ء علی بخش (علامہ اقبال کے خادم خاص)

۲ جنوری ۲۰۰۶ء مولانا وصی مظہر ندوی (عالم دین اور سیاستدان)

۲ جنوری ۲۰۰۲ء سیٹھ احمد داؤد (معروف صنعتکار)

۲ جنوری ۱۹۹۸ء ڈاکٹر رضی الدین صدیقی (سائنسدان و ماہر تعلیم)

۳ جنوری ۱۸۵۹ء امانت لکھنوی (شاعر و ڈرامہ نگار)

۳ جنوری ۱۹۸۷ء ایوب خان (بھٹی ویشن اور ریڈیو کے فنکار)

۳ جنوری ۱۹۳۱ء مولانا محمد علی جوہر (تحریک آزادی کے عظیم رہنما)

۳ جنوری ۱۹۹۲ء ضیاء الاسلام انصاری (مشہور صحافی)

۳ جنوری ۱۹۶۷ء عطیہ فیضی (علم و ثقافت کے حاملے سے نامور خاتون)

۳ جنوری ۱۹۹۳ء طفیل ہوشیار پوری (ممتاز شاعر)

۵ جنوری ۱۹۸۷ء سبج دیو (مشہور موسیقار)

۶ جنوری ۱۹۷۷ء مولانا عبدالماجد دریا آبادی (عالم دین اور عظیم مصنف)

۶ جنوری ۱۸۷۵ء خواجہ میر درد (معروف اردو شاعر)

۶ جنوری ۱۸۵۲ء لوئی بریل (بریل سسٹم کے موجد)

۶ جنوری ۱۹۱۹ء تھیوڈور روز ویلٹ (سابق امریکی صدر)

۷ جنوری ۱۹۶۳ء ڈاکٹر ریاض علی شاہ (عظیم کے ذاتی معالج)

۷ جنوری ۱۹۳۲ء سر محمد شفیع (تحریک پاکستان کے رہنما)

۷ جنوری ۱۹۸۲ء مائل نقوی (اردو شاعر، محقق و ادیب)

۷ جنوری ۱۹۸۹ء محمد اسلم عرف اچھا پہلوان (مشہور پہلوان)

۸ جنوری ۱۳۲۶ء مارکو پولو (عظیم سیاح)



فخر زمان

حفیظ ہوشیار پوری

قرۃ العین

حنیف رائے غلام عباس عطیہ فیضی

۸ جنوری ۱۲۶۳ء ہلاکو خان (جنکب)

۸ جنوری ۱۶۳۲ء گلعلی (عظیم سائنسدان)

۸ جنوری ۱۹۷۶ء چواین لائی (چین کے سابق حکمران)

۸ جنوری ۱۹۸۸ء صالحہ عابد حسین (مشہور ادیبہ)

۹ جنوری ۱۹۷۳ء نواب صدیق علی خان (قائد ملت کے سیکرٹری)

۹ جنوری ۱۸۳۱ء ڈاکٹر جان گل گرسٹ (ماہر لسانیات)

۹ جنوری ۱۹۶۳ء خالدہ ادیب خانم (ترکی کی مشہور ادیب)

۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء حفیظ ہوشیار پوری (اردو غزل گو شاعر)

۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء سمویل کولٹ (ریوالور کے موجد)

۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء جمیلہ ہاشمی (اردو کی ممتاز ادیبہ)

۱۱ جنوری ۱۹۶۶ء لال بہادر شاستری (بھارت کے سابق وزیر اعظم)

۱۱ جنوری ۱۹۹۳ء نذر الاسلام (معروف ہدایتکار)

۱۲ جنوری ۱۹۷۸ء ابن انشاء (معروف صحافی، مزاح نگار اور مصنف)

۱۲ جنوری ۱۸۹۷ء آرتھر پٹ مین (شارٹ پیئڈ کے موجد)

۱۲ جنوری ۱۹۷۶ء اگاتھا کریسٹی (معروف ادیبہ)

۱۳ جنوری ۱۹۵۵ء استاد بندو خان (نامور موسیقار اور سازگی نواز)

۱۳ جنوری ۱۹۷۶ء تھو عبدالرحمن (ملائیشیا کے سابق حکمران)

۱۳ جنوری ۱۹۹۳ء پروفیسر احمد علی (معروف ادیب)

۱۳ جنوری ۲۰۰۹ء پروفیسر آسی ضیائی (ممتاز نقاد اور محقق)

۱۵ جنوری ۱۹۷۷ء رشید احمد صدیقی (ادیب)

۱۵ جنوری ۱۹۷۹ء رعنا اکبر آبادی (معروف شاعر)

۱۵ جنوری ۱۹۸۰ء ڈاکٹر سید صفدر حسین (ماہر تعلیم، مرثیہ گو اور مؤرخ)

۱۶ جنوری ۱۹۱۵ء نواب سلیم اللہ خان (تحریک آزادی کے رہنما)

۱۶ جنوری ۱۹۸۵ء حسین امام (تحریک پاکستان کے رہنما)

۱۷ جنوری ۲۰۲۰ء یزدگرد اول (ایرانی بادشاہ)

۱۷ جنوری ۱۹۷۳ء ڈاکٹر شیخ محمد اکرم (معروف مصنف)

۱۷ جنوری ۱۹۷۵ء عبدالرحمن چغتائی (معروف مصور)

۱۸ جنوری ۱۹۵۵ء سعادت حسن منٹو (افسانہ نگار)



لائل سہگل خواجہ میر درد مارکو پولو

۱۸ جنوری ۱۹۳۷ء کندن لال سہگل (گلوکار)

۱۸ جنوری ۱۹۷۸ء محمد حسن عسکری (ادیب)

۱۹ جنوری ۱۹۸۳ء حبیب الرحمن (ہاکی کے مشہور کھلاڑی)

۲۰ جنوری ۲۰۳۰ء امام شافعی (عالم دین)

۲۰ جنوری ۱۹۸۸ء خان عبدالغفار خان (سیاسی رہنما)

۲۱ جنوری ۱۶۱۲ء قلی قطب شاہ (اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر)

۲۱ جنوری ۱۹۲۳ء لینن (روسی رہنما)

۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء مولانا محمد حسین آزاد (اردو کے ادیب)

۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء ملکہ وکٹوریہ (برطانوی ملکہ)

۲۳ جنوری ۱۹۶۳ء محمد علی بوگرہ (سابق وزیر اعظم)

۲۴ جنوری ۱۹۶۵ء چرچل (برطانوی بدبر)

۲۴ جنوری ۱۵۵۶ء نصیر الدین ہمایوں (مغل بادشاہ)

۲۵ جنوری ۱۹۹۲ء میر خلیل الرحمن (جنگ گروپ کے سربراہ)

۲۶ جنوری ۱۹۷۵ء دیوان سنگھ مفتون (معروف ادیب)

۲۶ جنوری ۱۹۸۹ء مولانا عبدالقدوس ہاشمی (ادیب، محقق)

۲۷ جنوری ۱۹۰۲ء رتن ناتھ سرشار (اردو ناول نگار)

۲۷ جنوری ۱۹۱۷ء نواب وقار الملک (تحریک آزادی کے رہنما)

۲۷ جنوری ۱۹۷۵ء شا کر علی شاکر (مشہور مصور)

۲۸ جنوری ۱۹۸۳ء سہراب مودی (فلم ساز)

۲۹ جنوری ۱۹۳۶ء علامہ راشد الخیری (معروف ادیب)

۲۹ جنوری ۸۰۳ء جعفر برکی (ہارون الرشید کے وزیر اعظم)

۳۰ جنوری ۱۹۲۸ء گاندھی (بھارتی رہنما)

۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء خلیفہ عبدالکیم (نامور فلسفی، محقق)

۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء سیما اکبر آبادی (شاعر)

۳۱ جنوری ۱۵۶۱ء بیرم خان (دربار مظفر کا ممتاز سردار)

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء ماسٹر عبداللہ (نامور فلمی موسیقار)

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء کرم حیدری (معروف ادیب، شاعر)

۳۱ جنوری ۱۹۹۳ء ڈاکٹر محمد اجمل (نامور ماہر تعلیم)



محمد علی جوہر محمد علی بوگرہ ملکہ وکٹوریہ

حمد خیال

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سب کالم



عبرت سرائے دہر ہے

اردو ڈائجسٹ سے تعارف سکول کے زمانے سے ہے، سکول سے مدرسہ اور یونیورسٹی سے ہو کر زنداں کی تاریک کوٹھڑی تک گامے بگامے رسالے کا مطالعہ جاری رہا۔ زندگی جب زنداں کی مختصری کوٹھڑی پر آ کر جیسے ٹھہری گئی تو جن چیزوں نے سب سے زیادہ سہارا دیا، حوصلہ اور جرأت سے حالات کا مقابلہ کرنا سکھایا ان میں کتاب سرفہرست ہے۔ اردو ڈائجسٹ کا شمار جب ملتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ایک رسالہ نہیں بلکہ ”لا سبریری“ ہاتھ آ گئی ہو۔ ہاں یہ ایک چلتی پھرتی لا سبریری ہی تو ہے۔ حالات و واقعات پر پُر مغز اور حب وطن میں گندھی ہوئی محترم الطاف حسن قریشی کی تحریریں، طیب قریشی کا خصوصی نوٹ اور مدیر کی دل کوئل پر اکسانے والی ”دستک“۔

قاری کو ان سے وطن کے حالات پر آنسو بہانے اور مایوس ہونے کے بجائے ”پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ“ کا پیغام ملتا ہے۔ ماہ دسمبر کا شمار ملا۔ صحابہ گرام کے واقعات سے لے کر جناح، اقبال، میر وغالب کے کلام

سے اقتباسات تک، مشرقی پاکستان کے المناک سانحے پر میجر دلیم کا انٹرویو، شکست آرزو، حمود الرحمن کمیشن اور بلوچستان سبھی حقیقت کشا تحریریں، مستقل سلسلے، کہانیاں، سب ہی کچھ بے مثال ہے۔ جب اتنا کچھ ایک ہی جگہ پڑھنے کو ملے تو اس نعمت کو لا سبریری نہیں تو کیا کہا جائے۔ زنداں کے شب و روز بجائے خود ایک کہانی ہوتے ہیں لیکن یہاں اس قدر کہانیاں، عبرتیں اور ایسے بکھرے پڑے ہیں کہ سننے اور دیکھنے کا یارا بھی نہیں چہ جائیکہ تحریر میں لایا جائے۔ زندگی نے وفا کی اور حالات نے اجازت دی تو اپنی قلمی کم مائیگی کے باوجود کچھ داستانیں، کچھ کہانیاں، کچھ ایسے آپ سے شیر کرنے کی کوشش ہو گی۔ رہی بات اپنی زنداں بیتی کی تو ”عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!“ والی بات ہے۔ اس پر مضمون نہیں کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

(حبیب اللہ مجاہد، ایئر سیل سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی)

نام بدل دیں

الطاف حسن قریشی صاحب سے میری ایک گزارش

ہے کہ ان کے تجزیے کا نام ”ہم کہاں کھڑے ہیں کے بجائے“ ”اب ہم کہاں پڑے ہیں“ ہونا چاہیے۔ یہ ایک عالمی معیار کا رسالہ ہے۔ آپ کے ہاں ورائٹی بہت ہے۔ تاریخ بھی ہے، ادب بھی۔ زندگی کی عمارت میں مزاح اور شگفتگی کی کھڑکیاں بھی ہیں۔ لکھائی، چھپائی دونوں بہت شاندار ہیں۔ خوب صورتی یہ بھی ہے کہ کاغذ بھی آپ بہت اچھا لگاتے ہیں۔ ایک آدھ معیاری غزل بھی شامل کر دیا کریں۔ آپ اپنے پرچے کو شاندار سے شاندار اور جاندار سے جاندار بنا رہے ہیں۔

(نشد بریلوی۔ کراچی)

(نشد صاحب ہماری پوری ٹیم اس کوشش میں شریک ہے۔ سبھی کو آپ کی مبارک باد دے دی ہے۔)

☆☆☆

آج جب دفتر سے گھر پہنچا تو ڈاک کے ذریعے اردو ڈائجسٹ کے ۲ شمارے موصول ہوئے۔ تقریباً ۲ بجے دوپہر سے لے کر اب رات پونے گیارہ بجے تک ان کا مطالعہ جاری رکھا ہوا ہے۔ ڈائجسٹ بند کرنے کو جی نہیں چاہتا اور نیند قریب نہیں پھٹکتی کیونکہ ان کی مصوری و معنوی خوبصورتی، مضامین کا انتخاب، امیدوں کے چراغ جلانے اور مایوسیوں کو شکست دینے والی تحریریں، پاکستانیت اور اسلامیت کا رچاؤ، جدید گیٹ اپ سب کچھ نے واقعی مسحور کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو، الطاف حسن قریشی، اعجاز حسن قریشی، طیب اعجاز اور جملہ احباب کو عافیت نصیب فرمائے اور آپ کی مساعی جلیلہ کو قبول فرما کر آپ سب کو اجر عظیم سے نوازے۔ آمین

اردو ڈائجسٹ کو پہلی دفعہ جہانیاں منڈی ضلع خانیوال اپنے مرحوم چچا جان کے ہاں دیکھا تھا جب میں جماعت ششم کا طالب علم تھا۔ اس چھوٹے سے شہر میں اخبارات و رسائل کی ایک ہی دکان تھی۔ روزنامہ نوائے وقت اور اردو ڈائجسٹ فیملی ممبر تھے۔ ہمارے اساتذہ کرام بھی انہی کا تذکرہ کرتے نظر آتے تھے اور سبھی

سنجیدہ، فہمیدہ افراد اسی کی زلف کے اسیر تھے۔ جب ملتان ایمرسن کالج میں داخل ہوئے تو الطاف حسن قریشی کو بھٹو فسطائیت کے خلاف جہاد کرتے خود دیکھا اور سنا بھی اور پھر جامعہ پنجاب میں بطور طالب علم الطاف صاحب کو مختلف پروگراموں میں لانے کی ذمہ داری بھی نبھائی۔ انھیں سید ابو الاعلیٰ مودودی کی مجالس میں دیکھا اور ان کی گرفتاری پر ان کے لیے سید مرحوم کو مضطرب اور دعا کرتے ہوئے بھی پایا۔

اردو ڈائجسٹ ایک ماہنامہ نہیں ایک نظریہ، ایک تحریک، ایک جذبہ اور ایک پیغام ہے۔ یہ اسلام اور پاکستان اور امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار ہے۔ آپ سب خوش نصیب ہیں کہ اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور نیکی کے فروغ کے لیے ہمہ تن کوشاں ہیں۔ عصر جدید کے چیلانجز، پاکستان کو درپیش مسائل، الیکٹرانک میڈیا میں نظریہ پاکستان کا تمسخر اور نوجوان نسل کو بے یقینی اور قنوطیت کی طرف دھکیلنا، سیکولرازم کی تعلیم اور پاکستان کی بنیادوں پر حملہ کرنا، کیا کیا شمار کروں۔ تن داغ داغ ہے! ایسے میں ہم سب کی اور بالخصوص اردو ڈائجسٹ کی ذمہ داری بہت بڑھ گئی ہے

عبدالملک مجاہد دارالسلام کی آپ بیتی وقت کی اہم ضرورت تھی۔ پاکستانی یوتھ کے لیے اس طرح کے نمایاں اور مثبت سوچ کے حامل کامیاب سربراہان اداروں سے ملاقاتیں اور ان کی باتیں بہت خوبصورت سلسلہ ہے۔ تعلیمی اداروں میں اس پیغام کو عام کرنا ضروری ہے۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں، یہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ ہر لحاظ سے حاضر خدمت ہوں۔ اک بار پھر ڈھیروں دعائیں۔

(افتخار احمد چودھری۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور)

ہر جگہ اردو ڈائجسٹ

علم کا دریا، آداب کا اور افکار کی دنیا کا بحر الکامل اور کیا تعریف ہو اردو ڈائجسٹ کی، میری مسجد مدرسہ اور لا سبریری میں ہر جگہ آپ کا اردو ہی اردو ہے۔ یہاں سے علم کا شوق ملا اور اب بانٹ رہا ہوں۔ (مفتی نعیم طہور)

کاش ہم سبق سیکھ سکتے

در دل پہ دستک، تلخ یادوں کو دہرا کر ایک نئے خوف سے دو چار کر گئی۔ پاکستان بننے سے اب تک بنگال سے کی گئی زیادتیاں شرمندہ کرتی ہیں کہ اب پاکستان کے صوبوں میں بھی باہمی تنازعات اور اختیارات کی بندر بانٹ بلوچستان کے عوام کی محرومی اسی خوف میں مبتلا کر دیتی ہے جس کی طرف آپ نے توجہ دلائی۔

بنگلہ دیش حکمرانوں کی کوتاہیوں اور کوتاہ نظری کی نظر ہوا تو اس کا خمیازہ پاکستانیوں نے بھگتا۔ آج بھی کچھ بنگالی پاکستان سے علیحدگی پر آئسو بہاتے ہیں تو یہ ان کی ذرہ نوازی ہے وہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں اور ترقی کی جانب گامزن ہیں۔ ۱۶ دسمبر کا دکھ تو پاکستان اور پاکستانیوں کا دکھ ہے کاش ہم کوئی سبق سیکھ سکیں۔

آپ بیتی عبدالمالک حیران کن تھی، ان کا سارا سفر اور کامیابیاں تحیر خیز اور باعثِ صدا احترام ہیں۔ خدا اپنے نیک بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

”اللہ کے بھید وہی جانے“ پڑھی۔ گوروں کے اسلام سے تعصب کا جواب قرآن کو جاننے والے ہی دے سکتے ہیں۔ گورے تو قرآن اور اسلام کو برا جانتے ہوئے بھی حقائق جاننے کے لیے اسلام و قرآن کا مطالعہ کر لیتے ہیں اور مسلمانوں (سب نہیں) کا حال یہ ہے کہ اسے حق اور سچ مانتے ہوئے بھی جاننا یا رہنمائی حاصل نہیں کرنا چاہتے۔

(رانا ذیشان گل۔ شیخوپورہ)

مبالغہ آمیز اعداد و شمار

دسمبر کا شمار ”انرجی ڈرنکس یا موت کے پیامبر“ جیسے اہم موضوع کے ساتھ ملا۔ بانی پاکستان کے حوالے سے مختلف اخبارات کے ایڈیٹروں کی رائے منفرد کوشش اور متاثر کن تحریر تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے پاک فوج سے فرار ہونے والے اولین بنگالی افسر کے انکشافات اور

سقوط ڈھاکہ پر خصوصی مضامین خاصے کی چیزیں تھیں۔ بنگالی پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد حسین کی کتاب ”شکست آرژو“ کا ایک اہم باب پاکستان سے محبت کرنے والوں کی کہانی ہے۔ اسی کتاب میں انھوں نے بہت سی اہم باتوں کا ذکر کیا جو عام پاکستانی بہت کم جانتے ہیں۔

عوامی لیگ تو عرصہ دراز سے یہ کہتی آئی ہے کہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء سے ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء تک تقریباً ۹ ماہ کے دوران ۳۰ لاکھ بنگالیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین نے عوامی لیگ کے اس الزام کو بے بنیاد پروپیگنڈہ قرار دیا۔ انھوں نے لکھا کہ ۲۵ مارچ کا ملٹری آپریشن کوئی باقاعدہ جنگ نہیں تھی۔ اس میں ٹینک استعمال ہوئے نہ بمباری کی گئی، میزائل بھی نہیں برسائے گئے، بس مختلف مقامات پر جھڑپیں ہوتی رہیں۔ لہذا ۳۰ لاکھ ہلاکتوں کا پروپیگنڈہ مضحکہ خیز ہے جس کی تردید خود بنگالی صحافیوں اور دانشوروں نے وقتاً فوقتاً کی ہے۔

ایک انگریزی اخبار مارنگ سن ڈھاکہ سے شائع ہوتا تھا کہ ایڈیٹر انوار اسلام پاکستان کے حمایتی نہیں تھے، مگر انھوں نے بھی لکھا کہ ۹ ماہ کے دوران ۳۰ لاکھ انسانوں کی ہلاکت یقینی بنانے کے لیے روزانہ ۱۱ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا پڑے گا جو انتہائی مبالغہ آمیز ہے۔ ایران اور عراق نے جدید ترین ہتھیاروں سے ۱۰ سال جنگ لڑی مگر اس میں بھی ۳۰ لاکھ ہلاکتیں نہیں ہوئیں۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کا مجموعی نقصان بھی ۳۰ لاکھ کے ہدف تک نہیں پہنچ سکا۔

ڈاکٹر سید سجاد حسین نے انکشاف کیا یہ جاننے کے لیے کہ پاکستانی فوج کے ہاتھوں کتنے بنگالی ہلاک ہوئے، شیخ مجیب الرحمن کے دور میں ایک سروے شروع کرایا گیا تھا مگر ابتدائی نتائج ”حوصلہ افزا“ برآمد نہ ہونے کی وجہ سے یہ خصوصی سروے روک دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا پروپیگنڈہ تواتر کے ساتھ اسی لیے کیا گیا کہ پاکستان ایسے الزامات کا جواب دینے کے لیے کبھی سنجیدہ نہیں ہوا۔ اگر پاکستان اس جھوٹ کا

پول کھولنے کے لیے اقوام متحدہ پر تفتیش کے لیے زور دیتا تو بنگلہ دیشی حکومت اور عوامی لیگ کے پروپیگنڈے کی اصلیت سامنے آ جاتی۔ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ہو پاتا کہ پاکستان کو بنگلہ دیش سے معافی مانگنی چاہیے یا بنگلہ دیش کو عوامی لیگ کی غداری پر پاکستان سے معذرت طلب کرنی چاہیے؟ یہ وہ حقائق ہیں جن کا عام پاکستانی کو علم ہونا چاہیے۔ (رانا محمد شاہد۔ بورے والا)

پہلی کاوش

اُردو ڈائجسٹ کا باقاعدہ قاری ہوں۔ یہ بہت ہی اچھا اور معلومات سے بھرپور ڈائجسٹ ہے۔ میں پیشے کے لحاظ سے مدرس ہوں۔ یہ خط میری پہلی کاوش ہے اس پر میں نے بڑی محنت کی ہے امید ہے آپ لوگ حوصلہ افزائی کریں گے۔ (حامد تابانی۔ کبل سوات)

”روز“ نے رُلا دیا

میں تقریباً ایک سال سے اُردو ڈائجسٹ پڑھ رہا ہوں۔ ہر شمارے میں کچھ نیا دیکھنے کو ملتا ہے۔ میرا یہ پہلا خط ہے۔ اُردو ڈائجسٹ ہر دفعہ میرے اندر ایک نیا جذبہ اور ایک نئی تحریک پیدا کرتا ہے اور مجھے کچھ عملی طور پر کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ماہ دسمبر ۲۰۱۲ء کے شمارے میں جاوید چوہدری کی تحریر ”کتے کے منہ میں ہاتھی کے دانت نہیں آگتے“ اور حسن رزاقی کی تحریر ”روز“ بہت پسند آئیں۔ ”روز“ نے تو مجھے رُلا دیا۔ (چوہدری مدثر حسین۔ کھاریاں)

کوزے میں سمندر

میں نے گزشتہ ۲۰ سالوں کے دوران اتنا اچھا رسالہ نہیں دیکھا اور نہ پڑھا۔ کمال مہارت کے ساتھ آپ کی ٹیم نے ایک سمندر کو کوزے میں بند کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ میرے گھر میں بے شمار اعزازی رسائل اور اخبارات آتے ہیں مگر میں خود پچھلے کئی ماہ سے اُردو ڈائجسٹ کو خرید کر لاتا ہوں۔ یہ ایک قاری کے لیے

بہت بڑا ستور ہے جہاں ہر چیز مل جاتی ہے۔

(میاں میر احمد مستان۔ ایگزیکٹو ایڈیٹر روزہ بہاؤنگر پبلسٹ)

دلچسپ اسلامی مضامین

”قصہ کوزہ“، ”بو جھیں تو جانے“ بہت ہی اچھے سلسلے ہیں۔ ماہ رواں کی شخصیات اور وفات پانے والی شخصیات کے متعلق بڑا اچھا سلسلہ ہے۔ بے شک بڑی محنت سے یہ تیار ہوتا ہوگا۔ ۲۰۱۲ء کی طبی ایجادات اور قائد اعظم کے متعلق مضامین اور سروے بہت پسند آئے۔ اسلامی شخصیات پر آپ کے مضامین بہت ہی عمدہ اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ (حافظ محمد باقر۔ گاؤں سہلا نوالہ تحصیل بھلوال)

فرمائش

اُردو ڈائجسٹ میں نوجوانوں کے کردار کو اچھا سے اچھا بنانے کے لیے مختلف شخصیات کے انٹرویوز شائع کیے جاتے ہیں۔ اگر آپ جامعہ دارالعلوم کراچی کے صدر مفتی اعظم پاکستان، محمد رفیع عثمانی اور مفتی محمد تقی عثمانی کے انٹرویو بھی اُردو ڈائجسٹ میں شائع فرمائیں تو یہ بہت مفید رہے گا۔ جامعہ دارالعلوم میں ۴ ہزار طلبہ زیر تعلیم ہیں اور لائبریری میں ایک لاکھ کتابیں ہیں۔

(محمد افضل کاسی۔ کورنگی کراچی)

قند مکرر کی فرمائش

اُردو ڈائجسٹ میں چھپنے والے ایک مضمون ”دشغل فرانس“ نے میرے بیٹے کو فراڈ سے بچا لیا۔ اس نے وہ پڑھا ہوا تھا۔ جب اس کو انوکھا کر کے لے گئے اور نواب اور درباری بن کر تاش کی بساط بچھائی گئی تاکہ اسے لوٹ لیا جائے تو اس نے بھی پورا ڈرامہ کر کے اپنی جان بچا لی۔ ہو سکے تو وہ مضمون دوبارہ چھاپ دیں۔ قند مکرر کے طور پر کئی اور معصوم لوگوں کا بھلا ہو جائے گا۔ (ڈاکٹر حافظ مطالحق، چیچہ وطنی)

۳ سوال ۲۴ جواب۔ لا جواب تحریر ہر دفعہ نیا خیال انگیز اور انتہائی پُرکشش ٹائٹل کے

ڈرتے ڈرتے ایک سوال

ان کا کبھی مختصر سا فون آتا۔ وہ باتیں کرتے اور پوچھتے جاتے اور میں یہ سارا وقت اپنی آواز کو ٹھیک کرنے میں گنوا دیتا جب تک ان کی صحت کا حال پوچھنے کا موقع آتا وہ رخصت لیتے اور رابطہ منقطع ہو جاتا۔

مجھے اپنے ابو سے محبت ذرا دیر سے ہوئی۔ بہت عرصہ ہماری زندگیوں کے پلیٹ فارم پر بے گانگی کا کالا بھنگ انجن شٹنگ کرتا رہا۔ اس کی موجودگی میں کوئی محبت بھری ٹرین کیسے آکر وہاں ٹھہرتی۔ میرے لیے وہ شیلف کے اوپر پڑی ہوئی ایسی کتاب تھے جسے کبھی پورا نہ پڑھ سکا۔ اس کے جتنے بھی صفحے پڑھے ایک دوسرے سے مربوط، صبر اور شکر سے گندھے ہوئے۔

ان پر جانے کب یہ بھید کھل گیا تھا کہ سکھ خوشی کا نام نہیں، غم اور خوشی دونوں سے بے نیاز ہونے کا نام ہے۔ انھوں نے اس



akhterabbas@gmail.com

**دردِ دل پہ
دستک
اختر عباس**

لیے اپنے آپ کو اپنی نگاہ سے دیکھنا بند کر کے اللہ کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا تو پھر ہر چیز کا رنگ بدل گیا، کیا کانٹے اور کیا پھول انھیں دونوں میں اطمینان اور سکون سے گزارہ کرنا آگیا۔ سہولت ملی تو شکر کرتے، نہ ملتی تو پیچھے نہ بھاگتے۔ چیزوں کی طلب سے بے نیازی کا اجر یہ ملا کہ مولانا نے ہر چیز سے نواز دیا۔ کامیابی میں وقار اور..... اور چھین میں صبر، جب خود کو سمجھا لیا تو پھر کیسا گلہ اور کیسا شکوہ..... میں نے ان کو ایک بار گردے کی درد سے تڑپتے دیکھا اور اس حالت میں کہ خود اپنے آپ کو

پُر ایک وعدہ بھاری پڑتا جا رہا ہے۔ بظاہر لفظوں سے میں نے اس وقت ہاں نہیں کی تھی، صرف ہاتھ بڑھا کر

میں نے اپنے ابو کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ آنکھوں کی نمی اور ہاتھوں کو پوری محبت اور آمادگی سے دبانا اگر ہاں کرنے میں آتا ہے تو وہ مجھ سے پوچھے بنا ہی میرے پورے جسم نے کر دی تھی۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس پر سوچنا بھی پڑتا، ہاں جس طرح انھوں نے عصر کی نماز سے سلام پھیرنے کے بعد میری طرف دیکھا اور پھر میرے بھائی کو جس سے میں نے سالوں محبت کی، اس نگاہ سے میرا پوری زندگی واسطہ نہیں پڑا،

بولے ”میں نے تم لوگوں سے کبھی کچھ نہیں مانگا، توقع بھی نہیں کی، یہ شاید اتنی بڑی خواہش نہیں ہے اس لیے کہہ رہا ہوں۔ جب میں نہ رہوں تو نماز کے دو جدول کے درمیانی وقفوں میں جو مختصر سی دعا پڑھتے ہو اس میں مجھے یاد کر لیا کرنا۔“

کوئی باپ اتنا بے نیاز بھی ہو سکتا ہے کہ ساری عمر اولاد کو پالنے، پڑھانے اور ان کے گھر بسانے کے بعد اگر کچھ کہنے پر دل کو آمادہ بھی کیا تو صرف ایک دعا کے لیے۔ مجھے اپنے ابو سے ایک عجیب سی شکایت رہی۔ وہ خدمت اور اظہارِ محبت کا موقع نہ دیتے تھے۔ شکایت کسی بند شیشی کی طرح ہوتی ہے، اقرار ہو جائے تو نہ صرف اس کی خوشبو اڑ جاتی ہے بلکہ دوبارہ اظہار کی خواہش بھی جاتی رہتی ہے۔

مجھ

دلچسپ اقتباسات

سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے میجر شریف ولیم کا انٹرویو بڑا چشم کشا تھا جب کہ دیگر تحریریں بھی معلوماتی تھیں۔ ادب کی مقدار بڑھا دیجیے۔

”دردِ دل پہ دستک“ موقع کی مناسبت سے بہترین تحریر تھی۔ دلچسپ اقتباسات بھی شائع کیا کریں۔ (کرامت راؤ۔ نیاری سندھ)

نئی امنگ

مشورہ حاضر ہے، قصہ کوئز اور نو جوانوں کے لیے بوجھ تو جانیں کیا بات ہے یہ سلسلے جاری رکھے جائیں۔ حضرت عباسؓ اور حضرت امام حسینؓ کے متعلق مضامین بہت عمدہ تھے۔ مشرقی پاکستان کی جدائی کے حالات، واقعات سے تکلیف دہ آگاہی ہوئی۔

فون پر یاد کرنے کا بہت شکریہ۔ اس سے ثابت ہے کہ آپ اپنے قارئین کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ آپ کی ٹیم نے اس رسالہ کو ایک نئی امنگ دی ہے اور اس طرح آپ کے ساتھ ایک قاری سے بڑھ کر ہم نے ایک گھر کا فرد اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے۔ ”میری جان..... آج پھر ۱۶ دسمبر ہے“ بہت پسند آیا۔ (محمود منور خان کوٹ سنہا نوالہ بھلول)

اخلاقی روایت

اُردو ڈائجسٹ کا مواد بہت بہتر ہو گیا ہے۔ اصل میں تو اُردو ڈائجسٹ ایک اخلاقی روایت کا نام ہے جو اب اور بھی زیادہ متاثر کن اور توجہ طلب ہو گئی ہے۔

(انفجار احمد حجاز۔ پاکستان ٹیلی ویژن لاہور)

مستقل مزاحیہ سلسلہ

آپ کے جاری کردہ کوئز سلسلے بڑے پسند ہیں۔ ایک تجسس پیدا کرتے ہیں۔ آپ ان کو جاری رکھیں۔ اگر کوئی مستقل مزاحیہ سلسلہ بھی شروع کریں تو مہربانی ہوگی۔ (گوبرجن)

ساتھ ماہ بہ ماہ نکھرتا ہوا ہمارا اُردو ڈائجسٹ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ رواں سال کا آخری شمارہ بھی ان گنت اور انٹ نقوش چھوڑ جائے گا! ہر صفحہ موتی ہر تحریر گہرائی لیے ہوئے ہے۔ لیجیے آگے بڑھتے ہیں۔ طیب اعجاز قریشی کا لیڈر کی تلاش بہت سے دروا کر گیا۔ شکست آرزو تو دل کو چھو گئی۔ اسلامی گوشہ مختصر مگر جامع تحریریں تھیں۔ قائد اعظم پر انمول مضمون تھے اور میجر شریف الحق ولیم کا انٹرویو پورے سال کے چونکا دینے والے انٹرویوز میں سے ایک ہے۔ دردِ دل پہ دستک تو ایسا تھا کہ دستک کی بجائے دل کے اندر گہرائیوں میں اتر گیا اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ جزاک اللہ۔ انرجی ڈرنکس ایک وارنگ ہے ان کے استعمال کرنے والوں کے لیے۔ آپ کو بتاؤں کہ میں نے ہمیشہ ان چیزوں کو بچوں سے دور رکھا اور ان کے لیے یہ ممنوع اشیاء ہیں۔ ماں باپ ہی رول ماڈل ہوا کرتے ہیں۔ اظہار بن مظہر کے ۳ رسالہ ۲۳ جواب لاجواب تحریر ثابت ہوئی۔ تین گمنام ہیروز کو مشہور ہیروز کی صف میں لانے کے لیے تحریم حنا صدیقی کامیاب رہیں۔

ایپٹل رپورٹ باہر ملازمت کا دھوکا بہت لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے تازیا نے کام کرے گا۔ کیا پیسا کمانا ہی کامیابی ہے، خوب تحریر ہے اور اب اس کی ایک انمول مثال ہمارے ورلڈ چیمنپین سنوکر حافظ محمد آصف ہیں۔ یہ عمل کرنے کی ایک زبردست مثال ہے۔ ہمارے ہونہار جوانوں کے لیے جیف بیروز ایک مثال ہیں۔ رشمن نانی زبردست باہمت اور باکمال تھیں۔ ”اگر غم دولت“ نہ ہوتا تو اللہ اپنے نبیوں اور ولیوں کو یہ نہ دیا کرتا۔ (یہ ایک غم زدہ بیٹی کے دل کا ماجرا) کی کہانی زبردست ہے۔ شکر کرنا تو اللہ کا حکم ہے اور شکر گزاری ہی نعمتوں کی حفاظت کرتی ہے۔ ایئر بس A-380 ایک مثال قائم ہوتی ہے کاش ہمارا PIA بھی انسان کا بچہ بن جائے اور جدوجہد کا پہاڑ، عظیم انسان عبدالملک مجاہد کی کہانی کیا زبردست ہے۔ ۲۰۵۰ء کے سکول کیسے ہوں گے..... زبردست معلوماتی تحریر رہی۔ (جاوید احمد صدیقی۔ مورگاہ راولپنڈی)

سنبھالنا مشکل تھا۔ ایسے میں زبان پر ایک یہ جملہ تھا ”مولا! جیسے تو راضی، ویسے میں راضی۔ ہر حال میں تیری بڑائی، تیری بزرگی کی شہادت دیتا ہوں۔“

محبت کی ایک حد شاید یہ بھی ہوتی ہے کہ دوسرے پر بیٹنے والے پل خود پر بیٹنے لگتے ہیں۔ اس پر پڑنے والی گرمی سے اپنا دامن جھلنے لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اترنے والی دھنک اپنی آنکھوں میں رنگ بھر دیتی ہے۔ خوب صورتی اور خوشی کی مقدار اگر متعین اور معین ہے تو اس محبت کی وجہ سے وہ بڑھتی اور کم ہوتی رہتی ہے۔ زندگی کتنے رنگ بدلتی ہے۔ کیسے کیسے سامنے آتی اور دل میں جگہ بناتی ہے۔ سچ پوچھیں تو میں نے یہ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میری زندگی میں وہ لمحہ اسی طرح منجمد ہے جب ابو نے پہلی بار میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ تب ان سے میں کافی عرصے بعد ملا تھا۔ بی اے میں یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کرنے پر اخبار میں خبر کے ساتھ تصویر چھپی تھی اور میرا خیال تھا اس خبر پر وہ مجھے سینے سے لگا کر بہت پیار کریں گے۔ اپنے دوستوں کو فخر سے بتائیں گے مگر میرے حصے میں آیا بھی تو آدھا بوسہ!

ایک آدمی بھی تو ساری دنیا سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کی خوشی اور اس کی باتیں ساری دنیا ہوتی ہے۔ اس کا خیال رکھنا بھی سب سے بڑی آسائش ٹھہرتا ہے۔ اس کی دل جوئی ہی سب سے بڑا اعزاز لگتا ہے۔ میں دور تک دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے دلیلیں دینا، جملے بنانا، باتیں سنانا اور دل رکھنا بھی آتا جا رہا ہے مگر ان کی وہ بات ہمیشہ ہی سینے میں کانٹا بنی رہی ”بیٹے جی! کامیابی اور محبت کبھی آدھی اور پونی نہیں ہوتی۔ یہ تو مکمل ہوتی ہے۔ صرف اپنے لیے سوچنے اور اپنے ہی لیے جینے والوں سے بہت دور رہتی ہے۔ خدمت اور صلاحیت کا پانی پورے یقین سے ملے تو مولا پائیداری عطا کرتا ہے۔“

میں نے اپنی باقی عمر کے بہت سے سال ان کے اس آدھے بوسے کے ساتھ اور ایک پورے بوسے کی آس میں گزار دیے۔ ان برسوں اور مہینوں کو اس قدر صاف اور

مصفا رکھا کہ کبھی لگتا ہے اللہ جی کی رحمت کا میرٹ بننے ہوئے پاس کرنے کے لیے کچھ گریس مارکس کی ضرورت پڑی تو کبھی ضرور دے دیں گے۔ جیسے اچھے استاد کچھ نمبر خوش خطی کے الگ سے دے دیتے تھے۔

اپنے دل کی زمین پر جھاڑو پھیرنا اور پھیرتے رہنا، خواہشوں اور کمزوریوں کی اگنے والی جڑی بوٹیوں کو دیکھنا اور اکھاڑتے رہنا، دوسروں کی خدمت اور سکھ کے لیے سوچنا اور کچھ نہ کچھ کرتے رہنا، نیند اور اونگھ کے چھوٹے بڑے وقفوں سے جاری رہا۔ صبح و شام جب کبھی موقع آیا، شکرگزاری کی ایک نرم سی لائٹ جیسے پختہ ارادے نے ناخوشی، ناشکری اور بے صبری کو اپنے دل دروازے سے اندر نہ آنے دیا۔ یہ بات میں نے بیٹا بن کر اپنے ابو سے سن کہی تھی۔

حقیقت میں مجھے ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے جو دن میسر آئے وہ صرف ۱۵ تھے۔ باقی زندگی جب وہ ہیڈ ماسٹر تھے تو سکول ان کی توجہ کا مرکز ہوتے۔ ضلع کے افسر بنے تو پورا ضلع ان کی توجہ میں سما گیا۔ میں ایس ای کالج بہاولپور آگیا اور پھر آٹلے سے گھرے چڑیا کے بچے کی طرح کبھی واپس جانا نصیب نہ ہوا۔ وہ بہاولپور آئے تو میں لاہور کا ہو گیا۔ وہ کئی سال ان سروس پری سروس کالج بہاولپور کے پرنسپل رہے تو کالج کے دروہام اور ٹریننگ کے لیے آنے والے اساتذہ ان کی نگاہ میں ترجیح اول رہے۔ ڈی پی آئی پنجاب جناب صفدر یار جنگ نے انھیں میسواں گریڈ ملنے پر ایڈیشنل ڈی پی آئی پنجاب بننے کی خوشخبری سنائی تو اطمینان سے بولے ”مجھے یہیں رہنے دیں۔ کہاں لاہور جا کر زندگی کا پودا نئے سرے سے لگاتا پھروں گا۔“ حالانکہ تب میں نے ان کے لیے گھر ڈھونڈنا شروع کر دیا تھا۔ بظاہر وہ آخری موقع تھا ان کے ساتھ رہنے کا جو ہاتھ سے نکل گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کے پندرہ، بیس سال وہ چشتیاں میں رہے جہاں انھوں نے اپنی مرضی سے ایک صاف ستھرا گھر بنا لیا تھا۔ ان برسوں میں عیدوں پر ہی

ان کے ساتھ ایک دو دن رہنے کا موقع ملتا جس میں کبھی گھر والے موجود ہوتے، البتہ وہ ۱۵ دن خصوصی طور پر میرے، میری اہلیہ اور بیٹی انشراح کے ساتھ حرم میں گزرے۔ وہاں انھیں دبانے کا موقع بھی ملا اور ان کے آرام کا خیال رکھنے کا بھی۔ ہمارے روز و شب اس طرح ترتیب پاتے کہ وہ کتنی دیر حرم میں قیام کریں گے۔ واپسی پر ہم ان کو پیدل چلنے نہ دیتے اور ویل چیئر پر انشراح کو ان کی گود میں بٹھا کر ہوٹل لے آتے تاکہ وہ تازہ دم رہیں۔ اس سہولت پر وہ مسکراتے۔ کھانے میں ان کو پھل محبوب تھے۔ عادل بھائی طائف سے بیٹھے اور خوب صحت مند موٹے تازے آڑو ہی نہیں اٹار بھی لے آتے۔ یہ طائف کا ایک نیا تعارف اور ذائقہ تھا۔ مدینہ منورہ جاتے ہوئے ان کے ساتھ ہم نے جی بھر کر ”رائی“ جوس پیئے۔ مدینہ منورہ میں ظہیر بھائی کے ایف سی (KFC) کے خستہ چکن پیسوں سے بھری بالٹی دے گئے جو ہم سے ختم نہ ہوئی تو انھوں نے ہوٹل کے ویٹروں میں تقسیم کر دی۔ ۱۵ دنوں میں ان کے ساتھ نے بہت برکت اور خوشی دی۔ میں توقع کرتا کہ وہ کوئی فرمائش کریں، کوئی خدمت بتائیں۔ میں ان پر خرچ کرنے کے لیے پیسے الگ سے لے کر گیا تھا مگر ان کے چہرے پر وہی معصوم سی مسکراہٹ جو تب بھی تھی جب وہ دل کا آپریشن کروائے بغیر لاہور سے واپس چلے گئے اور کچھ عرصے بعد مجھے اپنے گھر کی خریداری کے لیے رقم کی ضرورت پڑی تو ان کا چیک اور خط آگیا۔ بعد میں بھائی نے بتایا ”ابو نے جو پیسے اپنے آپریشن کے لیے رکھے تھے وہی بھجوا دیے ہیں۔ کہتے ہیں ”اللہ مالک ہے۔ اُس کی ضرورت زیادہ ہے، میرا دل تو ایک شریان (Artery) کے سہارے چل رہا ہے۔“ اور اللہ کی قدرت دیکھیے کہ ان کا دل اس کے بعد بھی بڑے سکون سے چلتا، کام کرتا اور مجھے شرمساری سے بچاتا رہا۔

ان سے آخری ملاقات ۲ سال قبل ہوئی جب ۲۳ جنوری ۲۰۱۰ء کی شام میں پرانی چشتیاں میں بابا تاج

چشتی کے مزار کے بالکل ساتھ ایک چھوٹی سی چار دیواری میں بنی تازہ تازہ پھولوں سے ڈھکی ایک قبر کے سر ہانے کھڑا اپنی ماں سے واپسی کے لیے اجازت لے رہا تھا۔ دور و نزدیک سے آنے والے مہمان واپس جا چکے تھے۔ لاہور سے آنے والی طلبہ اور اساتذہ سے بھری بس سٹیلاٹ ٹاؤن میں واقع گھر روانہ ہو چکی تھی۔ وہاں میں نے اپنے ابو کو اکیلے کھڑے چلتے دیکھا، میں ان کے قریب گیا، دل چاہا ان کے گلے لگوں اور ان سے ان کی اہلیہ کی وفات پر تعزیت کروں مگر انھوں نے موقع ہی نہ دیا۔ میرا ہاتھ پکڑا۔ ان کی نگاہیں قبر کی مٹی میں الجھی تھیں اور پاؤں چلنے سے انکاری تھے۔ وہ آہستگی سے بولے ”اختر عباس! تم کیسے بیٹے ہو! تمھاری ماں کو میں نے پچاس، پچپن سال کبھی یوں اکیلا نہیں چھوڑا اور تم اسے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو۔“ میرے پاس کوئی تسلی بھرا جواب نہ تھا، نہ لفظوں میں، نہ آنسوؤں میں جو ان کے سینے سے لگ کر کہتا، دل میں کہیں خیال تھا کہ رات جب سب مہمان اپنے بستروں کے ہو جائیں گے تو ان سے بے جی کی باتیں کروں گا۔ تھوڑی دیر کے لیے جو موقع ملا تو انھوں نے بڑی نرمی سے پوچھا اگر میں تمھارے چچا کو جو تمھاری وجہ سے ناراض ہیں، کو خط لکھ دوں۔ میں نے فوراً کہا ”بابا سائیں! ضرور لکھ دیں۔“ ان کا خیال تھا اللہ نے ساری عمر اتنی مکمل اور عمدہ زندگی دی کہ تمھاری بے جی اپنی بیماری کو ذہنی طور پر تسلیم ہی نہیں کر پائی۔“ جب وہ یہ کہہ رہے تھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ بے جی کی وفات کو وہ بھی ذہنی طور پر تسلیم نہیں کر پائے۔ صبح انھوں نے آنکھیں کھولنے سے اور ان کے جسم نے ان کا اختیار ماننے سے انکار کر دیا۔ اگلے چند روز انھوں نے ایک ایسے مسافر کی طرح گزارے جس کا دل کہیں اور اٹکا ہوا تھا۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد ہم لاہور سے دوبارہ ان کے پاس جا رہے تھے اور جان چکے تھے کہ اب ان سے زندگی بھر بات نہ کر سکیں گے۔ اسی احاطے میں والدہ کے ساتھ ایک نئی قبر میں وہ بھی جاسوئے۔ جب ہم ابو کو دفن چکے تو ایک صاحب آگے بڑھے

اور بولے ”آپ سب قبر کے احاطے سے باہر چلے جائیں مجھے چودھری صاحب سے بات کرنی ہے۔ وہ میرے استاد محترم تھے۔“ پھر وہ میری والدہ اور والد کی قبروں کے درمیان میں کھڑے ہو گئے۔ اب وہاں ہم دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا اور میں چھوٹی سی چار دیواری سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ جب وہ بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد دھیرے دھیرے بولنے لگے۔ ”چودھری محمد انور صاحب آپ اور آپ کی اہلیہ دونوں متوجہ ہوں میں آپ کو صرف یہ بتانے اور یاد دلانے آیا ہوں کہ آپ کا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ مجھے آپ سے دلی محبت ہے۔ آپ نے میری زندگی سنواری تھی۔ اس لیے اس گھڑی آپ کی مدد کرنے آیا ہوں۔ آپ کا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ آپ لوگ گھبرائیے گا نہیں۔ فرشتے سوال و جواب کے لیے آتے ہی ہوں گے۔ وہ پہلا سوال کریں گے تمہارا رب کون ہے؟ تو آپ لوگوں نے اطمینان سے جواب دینا ہے۔ اسی رحمان اور رحیم کا نام لینا ہے جس کے نام کی انگلی پکڑے ساری عمر گزاری۔ پھر دوسرا سوال ہوگا۔ پھر تیسرا سوال ہوگا۔ وہ بے اختیاری میں بولے جا رہے تھے۔ سوال ہی نہیں جواب بھی بتا رہے تھے تاکہ آنے والے لمحوں میں وہ یہ تازہ تازہ جواب یاد رکھ سکیں۔ ان کا ماننا تھا کہ میت تب تک سن رہی ہوتی ہے۔ تب سوچا تھا گھر جا کر روز قرآن پاک پڑھ کر ثواب بخشا کروں گا۔ ایک مولوی صاحب کو یہاں مقرر کر جاؤں گا جو قبروں پر کھڑے ہو کر ایک پارہ روز پڑھ دیا کریں گے۔ اگلے روز سپارہ بھی پڑھا اور قاری کو ڈھونڈ کر ایڈوانس بھی دے دیا۔ واپس لاہور آ کر پتا ہی نہیں چلا کہ کب دوسرا سال بھی مکمل ہونے کو آیا۔ پھر جنوری سامنے ہے۔ وہی ۲۴ جنوری کو بے جی کی رخصتی اور ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ابو کا وصال۔ نئے سال پر مبارکیں مل رہی ہیں۔ ڈائریاں آرہی ہیں مگر سچ یہ ہے کہ ایک ذرا سی خوشی نہیں ہو رہی۔ میری صحتیں اور شا میں گھر سے دفتر آنے جانے میں وقف ہیں۔

اپنے لیے دعا مانگنے کا وقت نہیں نکال پاتا۔ ابو، امی کو دعا دیے کئی کئی روز گزر جاتے ہیں۔ سوچ کر شرمندہ ہونا بھی نہیں چاہتا اس لیے سوچتا بھی نہیں ہوں۔ جب تک یونیورسٹی میں تھا روز ایک سورۃ پڑھ کر دعا کرنے کے بعد ہی گاڑی سے اتر کر دفتر میں جاتا تھا۔ اب وہ سہولت اور عادت بھی جاتی رہی۔ کس قدر یقین تھا کہ دو سجدوں کے درمیانی وقفے میں ایک چھوٹی سی دعا پڑھ کر ابو کو روز یاد کرنے کی فرمائش پوری کرنے میں کوئی رکاوٹ اور مشکل نہیں ہوگی۔ اب سوچتا ہوں میری یہ کیسی ناقص، ناکارہ اور بے رنگ محبت تھی جو روز اپنے باپ کو بھی یاد نہیں رکھ سکی۔ اس محبت کو سال گزرنے کا بس اس لیے انتظار ہے کہ چاولوں کی ایک دیگ دینی ہے۔ مدر سے کے بچوں سے قرآن پڑھانا ہے۔

اب خالی ہاتھ، خالی دل بیٹھا یہ لفظ لکھ جا رہا ہوں۔ مجھے دلیلیں دینا آگیا ہے۔ لفظ گھڑنا بھی سیکھ لیا ہے۔ جملے بنانا، باتیں کرنا بھی آتا جا رہا ہے۔ مگر ایک بات دل میں کانٹے کی طرح کیوں چبھے جاتی ہے۔ لوگ اللہ سے بیٹے ہی کیوں مانگتے ہیں۔

میری اہلیہ اور دونوں بیٹیاں مجھے رونے نہیں دیتیں، ان کے لیے میں صرف ان کا ہوں۔ مکمل، مضبوط اور کمپوزڈ، جسے کوئی غم نہیں، جس میں کوئی کمزوری کوتاہی نہیں۔

ایسے میں، میں اپنے ماں باپ کا کیا کروں پہلے ان سے دور تھا، جس کے لیے ان سے زیادہ عزیز بھی کوئی نہیں پھر ان کی قبر سے دور اب ان کی یادوں سے بھی دور اکیلا سوکھے پتے کی طرح بے قیمت اڑا پھرتا ہوں۔ وہ تو میرے خواب میں بھی نہیں آتے شاید سوچتے ہوں کہ ملیں گے تو شرمساری سے پانی پانی ہو جائے گا۔ اب تو ان سے دوسرے بوسہ کی آس بھی نہیں رہی۔ میں اپنا چہرہ ان کے شانے پر ٹکانا چاہتا ہوں، معافی مانگنا چاہتا ہوں، دھاڑیں مار کر رونا چاہتا ہوں اور ڈرتے ڈرتے پوچھنا چاہتا ہوں کہ جانے والوں کے سارے بیٹے کیا مجھ جیسے ہو جاتے ہیں کہ جن پر دعا کا ایک وعدہ بھی بھاری پڑنے لگتا ہے۔